سلوکِ سلیمانی
یا
شاہراہ معرفت

مرتب

حضرت مولانا فقیر محمد اشرف صاحب سلیمانی
صدر شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی

سلیمان اکادمی
۲ اشرف منزل نزد [illegible] پشاور

2

سلوکِ سلیمانی

یا

شاہراہِ معرفت

جلد دوم

جس میں سید الملۃ شیخ وقت حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ
خلیفہ مجاز حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کی اسلامی
سلوک کی پیش کردہ تعلیمات مرتب کی توضیحات و تعبیرات کے ساتھ پیش کی گئی ہیں

مرتب

حضرت مولانا پروفیسر محمد اشرف خان صاحب سلیمانی
صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی

سلیمان اکادمی
(اشرف منزل) نزد اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی

نام کتاب : ——— سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت (دوم)
مرتب : ——— حضرت مولانا پروفیسر محمد اشرف سلیمانی
ناشر : ——— سلیمان اکیڈیمی اشرف منزل
نزد اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی
طابع : ——— اشرفی گولڈ پریس لاہور
بائینڈر : ——— ایم اسحاق شیش محل روڈ لاہور
تعداد : ——— ۵۰۰
قیمت : ——— -/۱۲۰ روپے
کتابت : ——— محمد نعیم صدیقی
جلد ——— دوم
ایڈیشن ——— دوم
تاریخ اشاعت : دسمبر ۱۹۹۵ء رجب ۱۴۱۵ھ

اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

○ ○

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ

حدیثِ دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

انتساب

سیّد الملة استاذ الکل حضرۃ الشیخ

علامہ سیّد سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ

کے نام

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست

کرم نما و فرود آکہ خانہ خانۂ تست

فقیر بے نوا

محمد اشرف سُلیمانی

صدر شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی

۱۲ر شعبان ۱۴۰۱ھ

فہرست ابواب

(جلد دوئم)

چھٹا باب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علی صفوۃ البریۃ محمد النبی الامی المزکی الکریم وبعد

سلوک سلیمانی (شاہراہ معرفت) کے پہلے حصہ کے دیباچہ میں عرض کر چکا ہوں کہ کتاب کے صفحات ایک ہزار کے قریب ہو گئے اتنی لحیم وشحیم کتاب کا ایک جلد میں شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے دو ۲ حصے کر دیئے گئے۔ یہ دوسرا حصہ بھی اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرۃ الشیخ الامام نور اللہ مرقدہٗ کی ان تعلیمات کو حسن قبول نصیب فرمائے اور ان کے درجات علیا کی بلندی اور فقیر کی صلاح وفلاح ونجاح کا سبب اور اپنے قرب ورضا کا ذریعہ بنائے اور امت کو اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید فرمائے۔ آمین

فقط

ہیچمیرز وہیچمدان خاکپائے سلیمانؒ

محمد اشرف سلیمانی

جامعہ پشاور

۷ ذی قعدہ ۱۴۰۱ھ

۷ ستمبر ۱۹۸۱ء

چوتھا باب

اخلاص

از سلیمانؑ گیر اخلاصِ عمل
داں تو ندری رامنری از دغل (حضرت تھانویؒ)

اخلاص جملہ اعمال کی جان، ایمان کی روح، عطر سلوک، مغز تصوف اور حاصلِ تقوٰی ہے۔ اس وجہ سے حضرت سیدی الشیخ الامام قدس سرہٗ علم تصوف کو علم احسان و اخلاص کے نام سے بھی موسوم فرماتے تھے۔ ایک سالک کو لکھتے ہیں۔

"حضرت (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف سے تصوف یعنی علم احسانُ اخلاص کا مقصود اور مدعا سمجھ میں آگیا ہوگا یہ اولین چیز ہے۔"

ہم اعمال کے مکلف ہیں۔ اور جب اخلاص کے ساتھ احسان و حضور کی کیفیت اعمال میں رچتی ہے۔ تو جملہ اعمال زندہ، پرنور، بارونق اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہوجاتے ہیں۔ اسلئے ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہمارے جملہ اعمال ان صفات سے مزین ہوں۔ حضرت شیخؒ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اللہ تعالیٰ اپنی توفیقات سے آپ کو بہرہ مند فرمائیں۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو

حاضر ناظر جانیں۔ اور ہر کام اخلاص کے ترازو میں تول کر کریں۔ اخلاص کے معنی ہیں محض رضائے الٰہی کی طلب"۔ اسلئے، ہر بات میں اور ہر حال میں رضائے مولیٰ پر نظر رہے۔"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ارقام فرمایا۔

"اخلاص کے بغیر تو اعمال مردہ ہیں، مگر اخلاص و ریا کی حقیقت سمجھ لیں۔ اخلاص نام ہے۔ خالق کی رضا کیلئے کام کرنے کا اور ریا نام ہے مخلوق کی رضا کیلئے کام کرنے کا، اب آپ اس روشنی میں اپنے اعمال پر نگاہ رکھیں"..... نفس کا جائزہ لیتے رہیں اور حسنِ نیت کی کوشش میں لگے رہیں؛

ارشاد فرماتے ہیں :-

"فضائل وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت سے ہوں، اور ایمان کے بعد ہوں۔ یعنی جن کی بنیاد ایمان صحیح پر ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو یہ ظاہری فضائل در حقیقت فضائل نہیں"۔۔۔۔ "اصل شی ء احکام الٰہی کی کلی اطاعت حلال و حرام کا خیال، معاملات میں صفائی، اخلاق کی نزاہت، اتباع نبوی ﷺ کا دھیان اور تمام امور میں رضائے الٰہی کی طلب ہے۔ ان امور کی طرف توجہ فرمائیں۔ کہ یہ اصل اور باقی سب فروع و تدابیر ہیں۔ ذکر کے اثر کا ظہور یہی ہے۔ کہ طاعات و مرضیات الٰہی کا ذوق بڑھے"..... خلق میں شہرت اور مقبولیت کی خواہش اس راہ کا کانٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو..... عجب ریا اور کبر رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہ سالک کیلئے سخت خطرناک ہیں۔ اس لئے

ان سے احتراز کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو ارقام فرماتے ہیں :—

" بالکل صحیح آپ سمجھے کہ طلب رضا اور ہر عمل میں طلب رضا کا شعور پیدا ہونا ہی اس طریق کا حاصل ہے، اور جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہوجاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو نسبت کہتے ہیں۔ اور قرآن پاک کی زبان میں اسکی تعبیر یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کے لفظوں میں کیگئی ہے۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً انہی کے لئے نوید بشارت ہے۔ جزاک اللہ، خوب سمجھے، نام ونمود کی خواہش جسکا شرعی نام ریا وسمعہ ہے یہ حقیقت عمل کی مبطل ہے۔ الرِّيا هو الشرك الخفي۔ کیونکہ اعمال خیر کی حقیقت ابتغاء مرضاۃ اللہ ہے۔ اور جب اس میں شرکت ارضائے مخلوق اور طلب شہرت کی ہوگی تو شرک فی القصد ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً، اَوْ كَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ ہوگا۔ اس جذبہ ریا وسمعہ کے قلع وقمع کے بغیر اخلاص فی الدین پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور مخلصین لہ الدین کے سعادت مند گروہ میں داخلہ ممنوع ہوگا۔ اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ، اسی ہویٰ کے روکنے کا نام صوفیوں کی زبان میں مجاہدہ ہے۔ وَنَهَى النَّفْسَ کا اشارہ ادھر ہی ہے۔"

اسی حقیقت کا اظہار حضرت والا نے اشعار میں بھی فرمایا ہے۔

ہر عبادت نذرِ بتخانہ ہوتی   دل میں گر بیٹھا بتِ خود کام ہے

علم و دولت جاہ عزت ہیچ ہے ۔ گر مجھے حاصل ترا انعام ہے
جب مرا مطلوب ہے تیری رضا ۔ تب مجھے اور وں سے اب کیا کام ہے

ایک سالکِ صادق کو لکھتے ہیں :۔

" اللہ تعالیٰ کے پانے کے معنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے سوا کچھ اور نہیں، بندہ پر رضائے الٰہی کی طلب اور اس کے لئے سعی و محنت فرض ہے۔ لیکن اس کا حصول بندہ کے اختیار میں نہیں۔ اس لئے وہ اس کا مکلّف نہیں۔ حضرت مہاجر مکی (حاجی امداد اللہ صاحب) رحمہ اللہ کی زبان میں اس کا ڈھونڈنا شرط ہے۔ اس کا پانا شرط نہیں ہے، فرمایا ؎

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار آپ ہے ۔ پر تجھ کو چاہیئے کہ لگا دو لگی رہے

احکام الٰہی کی طاعت اور عبادت کئے جائیے۔ یہی آپ کا فرض ہے اسکی فکر نہ کیجئے۔ کہ قبول ہوئی یا نہیں ہوئی۔ گو حضرت مہاجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق جب ایک وقت کی نماز کے بعد دوسرے وقت کی نماز کی توفیق عطا ہوتی ہے تو یہ پہلے وقت کی نماز کی قبولیت کی علامت ہے۔ اور یہی منشاء وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى ۔ کا ہو سکتا ہے۔ (تذکرہ سلیمان ص۶۲۴ ۔ ص۶۲۵)

ایک صاحب نے لکھا۔ " کسی کی مدد کرتے وقت ذہن میں یہ خیال رہتا ہے کہ آج ہم کسی کی مدد کریں گے۔ تو وہ کل ہمارے کام آئے گا۔ حضرت والاؒ نے جواباً ارقام فرمایا :

" یہ تصور صحیح نہیں۔ سوائے رضائے الٰہی کے کوئی دوسرا اعتقادی تصور

نہ ہو، اسکے حصول کی صورت یہ ہے کہ پہلے زبان سے اس عمل کے کرتے وقت اس نیت کو دہرائیں۔ چند بار کے بعد محض نیت (قلبی) کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ تھوڑی مشق سے یہ بات پیدا ہوجائے گی۔"

ایک صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"(تبلیغ میں) اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ کے سوا دوسرا مقصد نہ ہو۔"

ایک طالب کو ارشاد فرماتے ہیں:۔

"نفس اوراد کی کثرت غیر ضروری ہے آہستہ چلئے مگر دواماً چلئے فائدہ کثرت میں نہیں دوام میں ہے وَاِنْ قَلَّ مگر اخلاص اور یکسوئی ضروری ہے تاکہ نفع ہو۔ (اوراد و وظائف) میں شرط یہ ہے کہ اخلاص کے سوا نفس کا کوئی داعیہ شامل نہ ہو ورنہ ترک اولیٰ ہے" ..... ہر عمل خیر لوجہ اللہ تعالیٰ ہو اصل یہ ہے۔"

ایک طالب جنہوں نے قدیم وجدید طبقے کے بعض اصحاب الرائے حضرات سے بعض اجتماعی دینی کاموں کے چلانے کے سلسلے میں بات چیت کی انہیں ہدایت فرماتے ہیں:۔

"خوشی ہوئی کہ آپ نے اتنی محنت کی اور جدید و قدیم اصحاب الرائے سے گفتگو اور ملاقاتیں کیں اور ان کو متفق کیا ...... آپ کے اخلاص اور حسنِ نیت میں شک نہیں۔ اگر چند مخلصین آپ کو مل گئے ہیں تو خیر، ورنہ ایسے اجتماعی کاموں میں رسوم اصل کام کی جگہ لے لیتے ہیں۔"

اسی سلسلے میں ان کے ایک استفسار کا جواب تحریر فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اگر آپ کے دل میں یہ ہو۔ کہ اگر کوئی دوسرا شخص اس کام کا سنبھالنے والا آپ کو آپ سے بہتر مل جاتے تو بخوشی یہ کام اس کے سپرد کرکے اس کے تابع ہو جائیں گے۔ تو یہ اخلاص ہے ورنہ اس میں کچھ نہ کچھ حصول نام کو دخل ہے۔"

حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ سیرت النبیؐ میں "اخلاص" کے عنوان پر کیا خوب تحریر فرماتے ہیں

"مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے۔ اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغۂ گوشت سے وابستہ ہے۔ عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اسکی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے۔ اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے۔"

الا وانّ فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب (صحیح بخاری باب من استبرء لدینہ وصحیح مسلم باب اخذ الحلال وترک الشبہات)	ہشیار رہو۔ کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو۔ تو سارا بدن درست ہوتا ہے۔ اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ ہشیار رہو کہ وہ دل ہے

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے اس لئے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو۔ بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو۔ اسی کا نام اخلاص ہے۔

رسول رصلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم ہوتا ہے

فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ، تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ (زمر-۱) اطاعت گذاری کو اسی کے لئے، ہشیار

کہ اللہ ہی کیلئے ہے خالص اطاعت گذاری۔

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گذاری میں، خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر، یا مٹی کی مورت، یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو۔ اسی لئے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے۔ فرمایا:

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوٰىہُ (فرقان-۴) کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنالیا ہے۔

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو ....

..... قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے

مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ اطاعت گذاری کو خدا کیلئے خالص کر کے

اس سے معلوم ہوا۔ کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے۔ کہ وہ خالص خدا کیلئے ہو یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہشِ نفسانی کو دخل نہ ہو، اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی (لیل-۱) یعنی خدائے برتر کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو،

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلے میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے

کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس میں ہم کوئی دنیاوی مزد، اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں،

وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ	اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں
اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ	چاہتا میری مزدوری تو اسی پر ہے جو
(شعرا۔۶۔۷۔۸۔۹۔۱۰)	ساری دنیا کا پروردگار ہے۔

.... دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے، لیکن اس کی نسبت یہ معلوم ہو جاتے کہ اسکا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض، یا محض دکھاوا اور نمائش تھا، تو اس کام کی قدر و قیمت خود نگاہوں سے گر جائیگی۔ اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں۔ جو اس کی بارگاہِ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کیلئے پیش کی گئی ہو۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزد و اجرت اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو۔ یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی تو دین تو الگ رہا دنیا بھی اُن ہی کو ادا کرتی ہے، جس کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے، کہ انہوں نے اپنا کام ان ہی شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ہم جو کام بھی کرتے ہیں۔ اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضاء کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی، جس کا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادہ و نیت اور کام کی اندرونی غرض و

غایت سے تیار ہوتا ہے. کام کی بقا و برکت دین اور دنیا دونوں میں اِسی روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے. انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے. اس لئے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں. اس لئے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض و غایت سے بالا اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھیں ....

متقی بھی وہی ہوتے ہیں. جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کیلئے کام کرتے ہیں. ان ہی کا کام قبول ہوتا ہے. اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخشا جاتا ہے. ان کو خدا کے یہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں ان کو ہر دلعزیزی ملتی ہے. ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے. اور ان کے کاموں سے نسلاً بعد نسلٍ فیضیاب ہوتے ہیں. اور ان کے لئے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں ....

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے. جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے. اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے. کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا. کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لئے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے."

(سیرت النبی پنجم ص۴۲۵ تا ص۴۳۱ بحذف)

اخلاص تام کیلئے ریاؒ کا قلع قمع ضروری ہے عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ریا دکھلاوے کے عمل کا نام ہے۔ ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ " دکھلانے کیلئے عمل ریا بھی ہے اور شرک بھی۔ مگر کسی کے دیکھنے سے بچنے کیلئے نیک عمل کا ترک کرنا بھی ریا ہے۔ کہ مخلوق کا خوف ترک عمل کا سبب بنا، اس لئے غیر اللہ کی خاطر کسی عمل کا ترک بھی ریا ہے۔ (میں نے شیخ کا مفہوم ومنشا لکھا ہے) اور ریا کا یہ مادہ اس وقت تک نہیں جا سکتا۔ جب تک ماسوا سے تعلق اور اس کی محبت دل سے نہ نکل جائے، جب غیر کا دھیان جاتا رہے گا۔ تو ریا وسمعہ کا جذبہ خود بخود ماند پڑ جائے گا۔ جب تک دوئی باقی ہے۔ دوسرے کا دھیان آ ہی جاتا ہے۔ کامل خلوص کامل فنا کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت شیخؒ فرماتے ہیں

سما جا مرے دل میں ارمان ہوکر دوئی دور کردے مری جان ہوکر
بتوں کا ہے بندہ خدا کا نہیں خدا کا نہ ہو جو مسلمان ہوکر

حضرت سید اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ اسلامی اخلاق کی بحث میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض وغایت کو ہر اچھے برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا برا نہیں ہوتا، جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے .... نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہوسکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی فخر نمائش ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کی بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا۔ اسی طرح آپ اگر کسی معذور

کی امداد اس لئے کریں۔ کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے۔ تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا۔ سورۂ ال عمران میں ہے۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا

اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا۔ اس کو وہ دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا۔ اس کو وہ دیں گے۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو۔ اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں، فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ - ۲)

اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھرکر اور ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کیلئے خرچ کرتا ہے اور خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

اسی قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مختصر لیکن جامع ومانع الفاظ فرماتے ہیں۔

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری باب اول)

انسان کے اعمال اسکی نیت پر موقوف ہیں

اور اس کی مزید تصریح کیلئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

ولکل امرئٍ مانوی فمن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله ورسوله ومن کانت

ہر شخص کے لئے وہی ہے جسکی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہے تو اسکی ہجرت

هجرته الی دنیا یصیبها او	خدا اور رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت کی
امرءة یتزوجها فهجرته الی	غرض دنیا کمانا ہو، یا کسی عورت کو پانا ہو کہ
ما هاجر الیه۔	اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت
(صحیح بخاری جلد اول باب۔	اسی کی طرف ہے جس کی غرض سے اس
ماجاء ان العمل بالنیتہ)	نے ہجرت کی۔

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے...... حسنِ نیت نہ ہو تو جملہ عبادات و اعمال کی بربادی کی طرح۔م۔ا) اخلاق کا بڑا سا بڑا کام بھی حسنِ خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف و ستائش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔" (سیرت النبی ص۲۴۹ تا ص۲۵۱ ج۔۶ بحذف)

چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے اس لئے اسکی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں۔ اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی۔ مذہبی کاموں کو چھوڑکر، دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جسقدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے۔ اسی قدر وہ قابلِ قدر ہوتا ہے۔ ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں۔ اور اس کے نام کتنے ہی الوانِ نعمت چن دیں۔ لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے۔ کہ اس خاطر داری کی تہ میں ذاتی نفع یا ریاکاری یا نمائش یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے۔

تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم وتکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص و بے غرضی کے ساتھ نان و نمک ہی رکھ دیں۔ تو اسکی وقعت وقیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہیں تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔ (سیرت ششم صہ ۴۹ ج-۶)

اخلاص ـــــ عمل کی غرض وغایت

" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعتِ کاملہ میں نفس عمل مطلوب نہیں، بلکہ وہ عمل مطلوب ہے۔ جسکی غرض وغایت صحیح ہو، عمل قالب ہے تو صحیح غرض وغایت اسکی روح ہے۔ روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے (سیرت ششم صہ ۵) .....

(اسلئے) اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے۔ ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیئے۔ اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہیئے۔" (سیرۃ النبی صہ ۵۹)

" اگر ہمارے اخلاق واعمال کی غایت خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے۔ اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے۔ بلکہ ایک مقام اسکا وہ بھی ہے۔ جہاں اسکی منزل رضائے الٰہی نہیں بلکہ خود ذات الٰہی ہو جاتی ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ (بقرہ-۳۷) اورتم خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (رعد-۳)	اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لئے صبر کیا۔
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى، اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى - (لیل-۱)	اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کیلئے نہیں۔ بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کیلئے کرتا ہے

(سیرت صد ۴۲۹۔ ج ۶)

اخلاص کیسے پیدا ہو!

جب یہ ظاہر ہو چکا۔ کہ (اسلامی اعمال و) اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت یعنی قلب کے عمل پر ہے۔ تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کیلئے یہ اعتقاد ضروری ہے۔ کہ کوئی ہستی ہے۔ جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے۔ ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں تاہم کوئی ہے۔ جس کی آنکھیں اُس کے دل کی تہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں۔ مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے۔ کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جوابدہ ہونا ہے۔ اور ایک دن آئے گا۔ جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے۔ اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے۔ اس لئے وحی محمدیؐ نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا، ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے۔ کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش

بن جاتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ-۲۶۰)	اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے۔ جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے۔ اور خدا اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔

یہی ایمان صحیح جس سے حسن نیت پیدا ہوتا ہے۔ آب حیات کا وہ سرچشمہ جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں ...... یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے۔ یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو ...... (کہ) جب تک کسی واقف اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا۔ دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق (اور نیک اعمال م-ا) کا وجود ہو سکتا ہے۔ سیرت النبی ص۴۹، ص۵۰ ملخصاً

قربِ ربّانی

سلوک قربِ ربّانی کی راہ ہے۔ اس طریق کا ہر راہی قرب الٰہی ہی کا طالب اور اس کی رضا کا متلاشی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی انسان کی شاہرگ سے زیادہ نزدیک اور اس سے اس کی جان سے بھی زیادہ قریب ہے ارشادِ الٰہی ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ (قٓ-۲)	اور ہم انسان کے (اسقدر قریب ہیں کہ) اسکی رگ گردن (یا رگ جان) سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی قربت کا مژدہ کن کیف آگین الفاظ میں سناتے ہیں۔

اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِيْبٌ (البقرہ-۲۴)	جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو (آپ میری طرف سے فرما دیجئے) میں قریب ہی ہوں

عطارؒ نے کیا خوب کہا ہے

جاں نہاں در جسم و او در جاں نہاں
اے نہاں اندر جاں اے جانِ جاں

اللہ تعالیٰ کی اس قربت و نزدیکی کے باوجود بے بصیرت انسان غفلت میں گم، قرب الٰہی سے غافل اور دنیا میں اس طرح شاغل رہتا ہے۔ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو نہ جانتا ہے نہ پاتا ہے، بقول عارف رومی

یار را بر من نظر شد دوختہ حیف من در این و آں دل سوختہ

تاہم کریم و رحیم پروردگار خود بندہ کا طالب ہے۔ اور اسے اپنی قربت کی راہیں بتاتا اور اپنی بے پایاں عنایات کا مژدہ سناتا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں ارشاد باری عز اسمہ ہے۔

مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ	جو شخص میری طرف ایک بالشت آتا ہے
اِلَیْہِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ	میں اسکی طرف (راضی ہوکر) ایک ہاتھ
ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا وَمَنْ	قریب ہوتا ہوں۔ اور جو میری طرف ایک
اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُہٗ ھَرْوَلَۃً	ہاتھ چلتا ہے۔ میں اسکی طرف کھلے ہوئے

دو ہاتھ آتا ہوں۔ اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اسکی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

قرب تعلق خاص سالکین جس قرب کے طالب ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندہ کے ساتھ "رضا و عطا والا تعلق" قائم ہو جائے اور بندہ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ طاعتِ دائمہ و ذکرِ پیہم والا قرب" میسر آجائے۔ جسے ہم "قربِ تعلقِ خاص" بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ بقول حکیم الامتہ امام تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

"ایک قرب تو حقیقی ہے۔ جس کا ترجمہ مل جانے سے کرلو یا ادراکِ حقیقت سے یا اسی کے ہم معنی جس لفظ سے چاہو کرلو، سو قرب حقیقی تو کسی کو حق تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حق تعالیٰ جسم اور مکان

سے پاک ہیں۔ تو مل جانے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے اور ادراکِ حقیقت کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ادراک احاطہ کو چاہتا ہے۔ اور بندہ ممکن ہے اور حق تعالیٰ واجب، اور ممکن متناہی ہوتا ہے۔ اور واجب لامتناہی پھر لامتناہی کو متناہی کیسے محیط ہو سکتا ہے۔ اس لئے قرب بایں معنی تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اتصال ہو جائے یا ادراکِ حقیقت ہو جاوے۔ اور ایک (اور قرب) قربِ مجازی ہے۔ جس کا حاصل رفع یا تقلیل حجب (معرفت) ہے۔"[۱]

ایک قربِ علمی ہے۔ جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہر چیز کو حاصل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ۔	ہم اس مرنے والے شخص سے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم نہیں دیکھتے
یا نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔	ہم انسان سے اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

ایک دوسرا قرب قربِ تعلق خصوصیت ہے۔ جیسے اردو میں ہم کبھی یوں کہتے ہیں "میں پاس ہوں کہو کیا کہتے ہو" یعنی سن رہا ہوں، اس میں تو پاس ہونے سے قربِ علمی و قربِ سماع کا بیان مقصود ہے۔ اور کبھی ہم یوں کہتے ہیں۔ "کہ فلاں تو ہمارا قریب ہے" یعنی اس کو ہم سے خاص تعلق ہے، نیز کہتے ہیں کہ "تم تو دور رہ کر بھی پاس ہی ہو" یعنی تم سے ہمارے دل کو خاص تعلق ہے۔"[۱]
(شریعت و طریقت صفحہ ۲۴۴، ۲۴۵ بحوالہ اسلام التحقیق و تصوف سلوک)

---

[۱] حضرت والا تعالیٰ قدس سرہ کے ارشادات معیت الٰہی کی تحت میں لکھے گئے ہیں۔ ان کا اطلاق قربِ ربانی پر

غرض قربِ الٰہی سے مراد "اللہ کے ساتھ بندہ کا وہ تعلق خاص" ہے. جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضامندیِ حق اور انعاماتِ دائمہ کی صورت میں اور بندہ کی طرف سے ایمان کامل اور طاعات پر سبقت و مداومت" کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے. کہ قرب و تعلق الٰہی کا راستہ صرف ایمان و طاعات کا راستہ ہے. جتنا ایمان و اعمال صالح بڑھتے جائیں گے. قرب حق میں زیادتی ہوگی. ارشاد ربانی ہے.

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُم	اور تمہارے اموال و اولاد ایسی چیز نہیں
بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ آمَنَ	جو تم کو ہمارا مقرب بنا دے، ہاں
وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ	مگر جو ایمان لاوے اور اچھے کام کرے
جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ	(یہ دونوں چیزیں البتہ سبب قرب ہیں)
فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ	سو ایسے لوگوں کے لئے ان نیک عمل کا
	دونا صلہ ہے اور بہشت کے بالاخانہ میں
(سبا-۵)	چین سے ہوں گے.

ایمان کے ساتھ طاعات و اعمال صالحہ میں سبقت و کوشش قرب الٰہی کا زینہ ہے. قرب میں ترقی 'طاعات' میں زیادت پر موقوف ہے کہ قرب و اقربیت کے درجات طاعات کے تفاوت سے طے ہوتے ہیں. اسلئے اعمال صالحہ و طاعات کا کمال تکمیل ایمان و دین کا ذریعہ اور قرب خاص الخاص کا سبب ہے. ارشاد ربانی ہے

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَٰئِكَ هُمُ	اور (نیکی اور طاعات میں) آگے نکل جانیوالے
الْمُقَرَّبُونَ (الواقعہ-۵۶)	تو اعلیٰ ہی درجے کے ہیں. اور (وہ خدا تعالیٰ

بھی ہو سکتا ہے اس لئے اسکا مطالعہ کر لیا جائے. (م-ا)

کے ساتھ) خاص قرب رکھنے والے ہیں (الواقعہ - ۵۶)

پس سالک قلبی و جسمانی اعمالِ صالحہ کی جسقدر پابندی و کوشش ظاہری و باطنی آداب و احکام کی رعایت، اخلاص کے اہتمام اور احسان کی کیفیت کے ساتھ کریگا۔ اسی قدر قربِ الٰہی کی منازل طے ہوں گی۔ اور خاصانِ خدا اور مقربین بارگاہ رحمانی میں بار پائے گا۔ حضرت والا قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:۔

" سورۂ واقعہ پڑھیئے۔ اللہ تعالیٰ نے تین گروہوں کے نام لئے ہیں۔ وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ـــ اس کی تفسیر آگے ہے اول مقربین اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُقَرَّبُوْنَ ، دوم اصحاب الیمین اور سوم اصحاب الشمال، تیسرا گروہ اہل نار کا ہے۔ دوسرا گروہ عامۂ مسلمین کا اور پہلا خواصِ امت کا

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ
فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ
وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ
الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ
الْيَمِيْنِ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ
الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ فَنُزُلٌ
مِّنْ حَمِيْمٍ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ
(الواقعہ - ۳)

پھر[۱] (جب قیامت واقع ہوگی تو) جو شخص مقربین میں سے ہوگا۔ اسکے لئے تو راحت ہے اور (فراغت کی) غذائیں ہیں اور آرام کی جنت ہے اور جو شخص داہنے والوں میں سے ہوگا۔ تو اس سے کہا جائیگا کہ تیرے لئے امن امان ہے کہ تو داہنے والوں میں سے ہے اور جو شخص جھٹلانے والوں (اور) گمراہوں

---

۱ ترجمہ حضرت والاؒ نے نہیں لکھا تھا۔ (ام-۱)

میں سے ہوگا۔ تو کھولتے ہوئے پانی سے اسکی دعوت ہوگی اور دوزخ میں داخل
ہونا ہوگا۔ (ترجمہ تھانویؒ)

ولایت عامہ، ولایت خاصہ

مقربین کی ولایت ولایت خاصہ ہے | اہل فن عام مسلمانوں کی کیفیت کو ولایت عامہ اور مقربین کی ولایت کو ولایتِ خاصہ کہتے ہیں۔ ولایتِ عامہ جو وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ (آل عمران) کا منشاء ہے۔ ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ اور اس کا مفاد نجاۃ من النار اور دخول فی الجنۃ ولو بعد برھۃ من العذاب ہے اور ولایتِ خاصہ جو وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ (جاثیہ) کا منشائ ہے وہ بُعد من النار بفضل اللّٰہِ دائماً اور دخولِ جنت فی الفور مع رضوان اللہ تعالیٰ — رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ — اب معلوم ہوا کہ احسان کا درجہ ایمان سے اونچا ہے اور اس کے بے انتہا مدارج ہیں۔

مدارج قرب و اقربیت | مدارج قرب و اقربیت کما لایخفیٰ، جس طرح ایمان کا حصول شہادت پر مبنی ہے۔ احسان کا قرب کمالِ ایمان و تقویٰ پر ہے۔ اسی سے ان حدیثوں کا معنیٰ مفہوم ہوں گے جن میں یہ آتا ہے۔ لایومن احدکم حتی یکون کذا، اور ایمان کی ستر شاخیں ہیں۔ الغرض ہمارے علمائے ظاہر نے صرف اس ایمان پر توجہ فرمائی ہے۔ جو کفر کے بالمقابل ہے اور علمائے باطن نے اس کے بعد کی منزل کی رہبری کی اور درجات و مدارجِ قرب کی نشان دہی فرمائی۔

طریق قرب واحسان کا حاصل .... بالکل صحیح آپ سمجھے کہ طلبِ رضا اور اپنے ہر عمل میں طلبِ رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے۔ اور جب خدا اور بندہ کے درمیان علاقہ استوار ہو جاتا ہے۔ تو صوفیہ کی اصطلاح میں اسکو نسبت کہتے ہیں، اور قرآن پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کے لفظوں میں کی گئی ہے۔ یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً، ان ہی کے لئے نوید بشارت ہے"

(مکاتیب سلیمان ص۱۷۰ تا ص۱۷۱)

اِس اقتباس سے معلوم ہوا کہ ولایتِ خاصہ کے حاملین کا گروہ "مقربین" کا طبقہ ہے اور اس قربِ رضا اور تعلقِ خاص کے بھی بے انتہا مدارج ہیں۔ بقول عارف رومی

اے برادر بے نہایت درگہیست ۔۔۔ اے کہ بروئے می رسی بر د مالیست

فقیر کو ارشاد ہوا "علم وعمل کے جس مقام پر پہنچ جاؤ یوں سمجھو کہ اب ابتدا ہے۔" — ظاہر ہے کہ ایک عاشق صادق قرب کے کسی ادنیٰ درجہ پر اکتفا نہیں کر سکتا، بلکہ اس کی آتشِ شوق ہر منزل پر "ھل من مزید" کی طالب ہوتی ہے۔ ؎

نہ گویم کہ بر آب قادر نیند ۔۔۔ کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

حضرت والا کے اشعار ہیں۔

چلا چل تو منزل بہ منزل یونہی ۔۔۔ ٹھہرنے کی منزل ابھی دور ہے

ابھی قطع کر اور راہ طلب ۔۔۔ مقام محبت بہت دور ہے

اس لئے سالک کی "سیرِ قرب" آخری سانس تک رہتی ہے اور "دمِ واپسیں" قرب کی انتہائی منزل، اور شوق ولقائے ربانی کے جذبہ کا معراج ہوتا ہے۔ بقول حافظ:۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم   راحت جان طلبم و سوئے جاناں بروم

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثورہ دعاؤں میں تاسوتی زندگی کی انتہا پر نہایت قرب، وحسن خاتمہ کی طلب ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

۱۔ واجعل خیر عمری اٰخرہ وخیر عملی خواتیمہ وخیر ایّامی یوم القاك فیہ (احمد۔ طبرانی)	اور اے اللہ میری عمر کے آخری حصہ کو زندگی کا بہترین حصہ کر دے اور میرے آخری عمل کو بہترین کر دے اور میرے دنوں میں بہترین دن وہ جس میں تجھ سے ملوں
۲۔ واختم لی بخیر عملی واجعل ثوابہ الجنّۃ۔	اے اللہ میرا خاتمہ میرے سب سے اچھے عمل پر کر اور اسکا ثواب جنت کو بنا دے۔

حسنِ خاتمہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"...... اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائیں۔ کہ جو قدم صحیح سمت میں اٹھ چکے ہیں وہ پھر اس وقت تک نہ رکیں۔ جب تک مرحلہ حیات ختم نہ ہو جاتے۔ اسی کا نام حسن خاتمہ ہے۔ جس کی تمنا اور دعاء انبیاء علیہم السلام تک نے کی ہے۔ حضرت یعقوب علیہم السلام نے اپنے بیٹوں کو مرتے وقت وصیت فرمائی:۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے سلطنت کے کاروبار میں حصہ پانے کے بعد دعاء کی:۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۔

یہ دعاء حسنِ خاتمہ کے لئے پڑھنی چاہیئے۔

غرض بقول سیدی قدس سرہٗ۔

"(اس قرب و رضا کی گھاٹی میں) آخری سانس تک تراش خراش لگی رہے
(تاکہ قرب خاص کی دائمی نعمت اور رضائے حق کا ابدی ثمرہ میسر آئے)

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تا دم آخر دمے فارغ مباش"

مبارک ہیں وہ لوگ جو خیر و طاعات کی مسابقت میں بازی لے گئے، اور "مقربین" کے زمرہ میں شامل ہو گئے کہ وہی حقیقتاً خصوصی نوازشات ربانی اور "مقام قرب" کے مستحق ہیں۔

وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ، وَذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

ذرائع واقسام قرب گذر چکا۔ کہ قرب ربانی کا حصول "ایمان و اعمال صالحہ" پر مبنی ہے۔ طاعات کا جسقدر اہتمام، منہیات سے جسقدر پرہیز اوامر الہیہ کی جسقدر پابندی اور سنت نبویہ کا جسقدر اتباع ہوگا۔ اسی قدر قرب ربانی کی منازل طے ہوں گی" مدارج قرب ایمان و اعمال صالحہ کے نتائج و ثمرات ہیں۔ اس لئے مدارج قرب کا تفاوت "اعمال" کے فرق پر عادتاً موقوف ہے۔ اس وجہ سے اعمال کی کمی و بیشی اور اس کا ظاہری و باطنی حسن و قبح، مدارج قرب کی کثرت و رنگارنگی پر منتج ہوتا ہے۔ اور یہی تفاوت نسبتوں کے اختلاف اور تعدد و تنوع کا سبب ہے ہر عمل خیر، قرب الہی کی ایک مستقل منزل و درجہ ہے۔ ع

منزل مقصود ہے راہ طلب کا ہر قدم
وہ سر منزل ہے جو ابھی وہ منزل میں ہے

اسلئے جسقدر " اعمال خیر " کی کثرت ہوگی " اعمال " کی قیمت کے تقدر درجات میں ترقی ہوگی۔ 'قرب عام' و 'ولایت عامہ' کے بعد 'قرب خاص' اور ولایت خاصہ کی منازل بھی " اعمال خیر " ہی کے ذریعہ طے ہوں گے۔ کہ اوامر الٰہیہ کا امتثال اور اعمال صالحہ قربِ الٰہی کے مستقل ذرائع ہیں۔ جب سالک احکام الٰہی کی پابندی اور منہیات سے پرہیز کرتا ہے۔ تو اس کے قلب پر ہدایت ربّانی کا ایک خاص ترشح ہوتا ہے، جس سے اسکا سینہ اسلام اور ماموراتِ الٰہیہ کیلئے کھل جاتا ہے۔ اور اسے اعمال خیر سے ایک طبعی مناسبت اور برائیوں سے نفرت ہوجاتی ہے ۔ 'ولایت عامہ' کے اس مقام پر پہنچ کر سالک مزید ترقیات کا طالب ہوتا ہے اور قرب خاص (جسے ہم ولایت خاصہ' بھی کہہ سکتے ہیں) کیلئے کوشاں ہوتا ہے۔ اور " اعمال خیر " کی کثرت و بجاآوری میں کماً و کیفاً اضافہ کرتا جاتا ہے۔ اور ہر آن اپنی ترقی کی منازل کو شعوری و غیر شعوری طور پر طے کرتا ہے۔ یہاں تک کہ 'قرب خاص' کی وادی کا یہ جادہ پیما، 'قرب و رضا' کی محنت میں اپنی جان شیرین جان آفریں کے سپرد کردیتا ہے۔ اور بزبان حال پکارتا ہے ؎

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم　　شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

طرق قرب خاص متعدد و مختلف ہیں | " قرب خاص " کے طرق حدود شرعیہ کے اندر طبائع و امزجہ کے اختلاف، ذوق و طلب کے تفاوت اور استعدادوں کے تعدد کی وجہ سے متعدد ہیں۔ جنکی اصولی تقسیم دو بڑی قسموں میں کی جاسکتی ہے۔

قرب بالفرائض | سالک مامور بہا امور اور سنن نبویہ کی ظاہری و باطنی پابندی

کے بعد جب ان اعمال کا خصوصی اہتمام کرتا ہے جو دینی فرائض و واجبات سے متعلق ہیں۔ تو اس پر ایک خاص تجلی الٰہی کا فیضان ہوتا ہے۔ جس سے اس کا ارادہ مضمحل ہو کر ارادۂ الٰہی میں فنا ہو جاتا ہے۔ اور وہ نائب حق اور آلہ ربانی بن کر عالم میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور نقشِ حق عالم میں مرتسم کرنے کے نبوی فرائض و واجبات کو بروئے کار لاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام خصوصاً نبی اکرم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشابہ اور "الوان نبویہ" کا انصباغ اس کے ظاہر و باطن اور قلب و روح کی رونق و روشنی بن جاتا ہے۔ یہ 'نسبت'، کیونکہ فرائض و واجبات کے اہتمام سے میسّر آتی ہے۔ اس لئے اسے قرب بالفرائض کہتے ہیں۔

فرائض و واجبات کی پابندی میں انسانی چاہت کو دخل نہیں۔ کہ وہ حکم الٰہی کی عظمت سے متاثر ہو کر طوعاً و کرہاً ان اعمال کو بجا لاتا ہے۔ اس وجہ سے عبدیت کی شان اور اپنے ارادہ کا اضمحلال و فنا فرائض کی ادائیگی میں نوافل اور تطوعات۔ (پسندیدہ غیر لازمی اعمال خیر) کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ عبدیت ہی مقصود ہے اس لئے یہ اعمال (فرائض و واجبات) قربِ ربانی کا اقرب ذریعہ ہیں۔ اس لئے اس قرب کو اعلیٰ و اول درجہ کا قرب کہا جا سکتا ہے۔ اس قرب میں نسبت محمدیہ سے مناسبت تامہ ہوتی ہے اور "الوان نبویہ" کا غلبہ ہوتا ہے۔ اسلئے اسے ہم "سلوک بطرز نبوت" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس 'سلوک' کے آثار بھی خاص ہوتے ہیں۔ اور "قدمِ نبوت" کے نیچے آکر ان سالکین پر عموماً صحو اور حبِ عقلی کا غلبہ ہوتا ہے شریعت مطہرہ کا انتہائی اہتمام، افادۂ خلق اور فرائضِ نیابت نبوت کی ادائیگی کا فکر اور حدود و قیود الٰہی کی پابندی اور اسباب پر مدار نہ سمجھتے ہوئے حکمت الٰہیہ کی معرفت د

قدردانی کی بنا پر انکا اختیار کرنا انکا معمول ہوتا ہے۔ عبدیت کاملہ اور عبودیت " مطلقہ " تواضع و فقر تام ان کا حال اور امر الٰہی کی ہیبت و عظمت ان کے اعمال کا منشاء ہوتی ہے۔ " نبوت " کے فیض کامل سے وہ بہرہ مند ہوتے ہیں اور ان کا 'نزول' ان کے 'عروج' کا پردہ ہوتا ہے۔ اور ان کی کیفیاتِ باطنیہ ضبط کی وجہ سے عموماً ظاہر نہیں ہوتیں۔ غرض قرب الٰہی کے خاص مقام پر فائز ہونے سے شریعت مطہرہ ان کا مزاج اور طریقۂ نبویہ ان کی طبیعت بن جاتی ہے۔

۲۔ **قرب بالنوافل** سالک جب احکام الٰہیہ اور سنن نبویہ کے اتباع سے اپنے ظاہر و باطن کو رنگ لیتا ہے۔ تو بعض سالکین کا طبعی میلان نفلی عبادات و اعمال" کی کثرت کی طرف ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے اوقات کو اپنی پسند کے 'اعمال نافلہ' میں گذار کر قرب کے منازل طے کرتے ہیں "نفلی عبادت" کے اختیار کرنے میں ایک گونہ بندہ کی پسند اور چاہت کو دخل ہے۔ اسلئے " بندگی " کی وہ سرافگندگی اور "ترک اختیار و چاہت " کا وہ "لون" جو فرائض کی ادائیگی میں میسر آتا ہے۔ نوافل میں نہیں مل سکتا۔ اسلئے نوافل کا درجہ فرائض سے کم ہے۔ اور جو قرب اس راہ سے میسر آئے گا۔ وہ 'قرب بالفرائض' سے کم اور دوسرے درجہ کا ہوگا۔ تاہم چونکہ بندہ قرب رضا حق کی نیت سے اعمال خیر کی ایک قسم پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اسلئے اسے بھی قرب حق ملتا ہی رہتا ہے۔ لیکن یہ قرب، قرب بالفرائض کے برابر نہیں ہوتا۔

اس 'قرب' میں چونکہ بندہ اختیار نوافل میں ایک گونہ اپنے اختیار کو استعمال کرتا ہے۔ اسلئے ارادہ کی کلی فنائیت جو قرب بالفرائض کا خاصہ ہے۔ اسے میسر نہیں آتی۔ بلکہ جب توحید کے غلبہ سے فاعلیت حقّہ کا استحضار و حال اسے نصیب ہوتا ہے

— اس وقت بھی ذات باری تعالیٰ کو وہ اپنے پر اس طرح چھایا ہوا نہیں پاتا۔ کہ اپنے کو "آلہ حق" سمجھے۔ بلکہ اس کے برعکس، فاعلیت حقہ کا ظہور اسے اپنی ذات سے ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سبحانہٗ تقدس کی فاعلیت اس پر "آلہ عبد" کی حیثیت سے کھلتی ہے۔ جو پہلی حالت سے ادنیٰ ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) ؎

اے بروں از وہم و قال و قیل من — خاک بر فرق من و تمثیل من

حضورِ انور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں ان دونوں راہوں (قرب بالفرائض اور قرب بالنوافل) کا تذکرہ فرمایا ہے چنانچہ بخاری شریف کی روایت ہے:-

مَاتقرّب الی عبدی بشیءٍ	میرا بندہ میرا کسی ایسے ذریعے سے قرب
احبّ الی مما افترضت علیه و	حاصل نہیں کرتا۔ جو میرے نزدیک
مایزال عبدی یتقرب اِلیّ	ادائے فرائض سے زیادہ محبوب ہو
بالنوافل حتّٰی احبه فاذا	اور میرا بندہ برابر مجھ سے بذریعہ نوافل
احببتهٗ کنت سمعه الذی	قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہانتک
یسمع به وبصرهٗ الذی یبصر به	کہ میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں
ویدهٗ التی یبطش بها و	تو میں اسکا کان ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا
رجله التی یمشی بها وان سالنی	ہے اور اسکی آنکھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ
لاعطینّه ولان استعاذنی لا	دیکھتا ہے اور اسکا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے
عیذنّه (مشکوٰۃ ص۱۹۷)	وہ پکڑتا ہے اور اسکا پاؤں ہوجاتا ہوں جس سے

وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اسے ضرور دونگا۔ اور اگر (کسی چیز سے)

پناہ چاہے تو میں اسے ضرور بچاؤں گا (مشکوٰۃ ص۱۹۷)

شیخ الکل حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہٗ "قرب فرائض" اور "قرب نوافل" کی تشریح کرتے ہوئے مسائلِ[1] المثنوی (التکشف عن مہمات التصوف حصہ سوم ص۸۳، ص۸۴) میں ارقام فرماتے ہیں۔

"جاننا چاہیئے۔ کہ جب بندہ ریاضت و مجاہدہ کرتا ہے۔ تو اس کی صفات رذیلہ دواعی شہوت و غضب زائل ہو جاتے ہیں، اور اس کے نفس میں ایک ملکۂ راسخہ حب مرضیات حق و بغض نامرضیاتِ حق کا پیدا ہو جاتا ہے جس سے بلاتکلف اعمالِ حسنہ و افعال محمودہ صادر ہوتے ہیں۔ اور اعمال قبیحہ و افعال ذمیمہ قریب قریب معدوم ہو جاتے ہیں۔ ایسے شخص کی نسبت حدیث میں آیا ہے۔

فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بہا ورجلہ التی یمشی بہا۔

(رواہ البخاری عن ابی ہریرۃؓ)"

ا[1]۔ حضرت سیدی قدس سرہٗ مخدومی المکرم حضرت شاہ عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔ "آپ کے پیش نظر دیوان حافظ اور شرح مثنوی نہیں ہے۔ ان میں مسائل پر زیادہ مفصل مباحث ہیں۔ قرب نوافل اور قرب فرائض کی حقیقت شرح دیوانِ حافظ میں جو ہے۔ وہ مجھے بہت پسند آئی تھی۔ آپ کے یہاں بڑا اختصار ہے" ـــ حضرت والا کی اس پسند کا لحاظ کرتے ہوئے مذکورہ عبارت نقل کرتا ہوں (م-ا) عہ حضرت والاؒ کو تسامح ہو گیا۔ یہ عنوان و حقیقت التکشف میں شرح دیوان حافظ میں نہیں۔ بلکہ مسائل المثنوی ہے (م-ا)

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ میں اس کے کان اور آنکھ اور ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں، اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں کہ عقلاً و شرعاً محال ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس کے اعضاء و جوارح سے سب افعال میری مرضی کے موافق سرزد ہوتے ہیں۔ پس گویا میں ہی اس کے اعضاء بن جاتا ہوں۔ پس کلام تشبیہ و تمثیل پر محمول ہے چونکہ مجازاً اس حدیث میں حق تعالیٰ کو آلہ اور عبد کو فاعل کہا گیا ہے۔ کہ سمیع و بصیر وغیرہ کی اسناد عبد کی طرف ہے۔ صوفیہ کرام نے اسی اطلاق کا اتباع کرکے یہ عنوان مقرر کیا ہے۔ کہ بندہ فاعل اور حق تعالیٰ آلہ بن جاوے۔ اور چونکہ حدیث میں اس مرتبہ کا حصول تکثیر نوافل پر وارد ہے۔ چنانچہ حدیث مذکور میں عبارت مذکورہ سے پہلے یہ جملہ ہے۔

و ما یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتّی احببتہٗ فاذا احببتہ الخ

اور مجاہدہ و ریاضت میں تکثیرِ نوافل لازم ہے۔ خواہ نماز ہو یا روزہ یا کثرتِ مراقبات یا تقلیل شہوات اسلئے صوفیہ اتباعاً للحدیث اس مرتبہ کو قرب نوافل کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں صفات و افعال رذیلہ کا ازالہ ہوا ہے۔ اس لئے فناءِ صفات سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرا قرب اعلیٰ درجہ کا ہے۔ یعنی عبد کی ہستی ایسی مضمحل ہو جاوے کہ اپنی قدرت و ارادہ کو قدرت و ارادہ حق کے روبرو ذوقی طور پر کالفانی و کالعدم جاننے لگے۔ اور افعال و اعمال میں بمنزلہ آلہ محضہ کے ہو جاوے اور حق تعالیٰ کی مؤثریتِ مستقلہ پیش نظر ہو جاوے۔ اس مرتبہ کو اس عنوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ حق فاعل ہو جاوے اور عبد آلہ بن جاوے۔ اور چونکہ یہ اول سے اعلیٰ ہے۔ کیونکہ اول میں صرف فناءِ رذائل تھا، فنائے اختیار نہ تھا۔ اور اس میں فنائے اختیار ہے۔ اس لئے اس سے

اعلیٰ ہوا۔ اور حدیث میں تقرب بالفرائض کو تقرب بالنوافل سے اعلیٰ و افضل کہا گیا ہے چنانچہ اسی حدیث کا سب سے اول جزو یہ ہے۔

"وما تقرب الیّ عبدی بشیٔ احبّ الیّ مما افترضت علیہ"

اس لئے موافقۃً للحدیث صوفیہ اس کو قرب فرائض کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں سالک کو اپنی صفات ذاتیہ قدرت و اختیار پر بھی نظر نہیں رہی۔ اسلئے اس کو فنائے ذات سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔"

اس حال "فنائے اختیار" کے بارے میں ایک طالب نے حضرت سیدی قدس سرہٗ کو لکھا:۔

"بندہ کی عجیب حالت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ارادے ختم کرائے جا رہے ہیں۔ بے قصد و ارادہ جو چاہتے ہیں کرا دیتے ہیں۔ اپنے اختیار میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر ارادہ کرتا ہوں۔ تو اس کے فسخ کی اضطراراً صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو چاہتے ہیں کر رہے ہیں۔ ہیچ محض یونہی بے اختیار مختار کل کے ہاتھوں میں ہے۔"

حضرت والاؒ نے جواباً ارقام فرمایا:۔

"جی ہاں تسلیم و رضا کا یہی مقام ہے خدا کرے یہ حال آپکا مقام بن جائے

کارساز ما بساز کار ما فکر ما در کار ما آزار ما"

ایک دوسرے عریضہ میں طالب مذکور نے تحریر کیا:۔

"اب اپنی حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے۔ کہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش آتا ہے اس کے انتظار میں ہوتا ہوں۔ اپنا ارادہ نہیں ہوتا۔ جو وہ چاہتے ہیں۔ کرائے چلے جاتے ہیں۔ یہ خاص ارادہ کا فقدان اور اپنے ارادہ کو ان کے ارادہ کے سامنے فنا کرنا

اخلاص کے منافی تو نہیں۔ کہ جب ارادہ نہ رہا تو ارادہ پر ثواب کا ترتب کیسے ہوگا۔
لیکن میری حالت خود بخود ایسی ہوگئی ہے کہ ارادہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جو چیز
پیش آتی ہے ان کی طرف سے سمجھ کر راضی برضا ہوں، اگر اللہ چاہیں تو کر دیا جاتا۔
بندہ ان کے ہاتھ میں آلہ بے ارادہ ہے۔ اس حال کی اچھائی و برائی کی وضاحت چاہتا ہوں۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا حکیمانہ جواب ارقام فرمایا :۔

" ارادہ کی یہ فنائیت اخلاص کے خلاف نہیں۔ ارادہ کی فنائیت یہ ہے کہ بندہ اپنے ارادہ کو مؤثر نہ جانے۔ بلکہ مؤثر صرف مشیت الٰہی کو سمجھے، باقی ارادہ تو فنا نہیں ہوتا۔ جب تک انسان ارادہ نہ کرے کوئی فعل ہی نہیں ہو سکتا۔ "

حضرت سیدی قدس سرہٗ اللہ کی اس توضیح سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بندہ کا ارادہ کلیتاً فنا نہیں ہوتا بلکہ تاثیر الٰہی کا غلبہ اسقدر ہو جاتا ہے کہ اپنی فاعلیت " فاعلیت حقہ " میں گم و محجوب ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور مشیت ربانی کی تاثیر اس طرح مستحضر اور غالب ہو جاتی ہے کہ اپنی مشیت ارادہ ربانی کی حالاً و مآلاً تابع اور اسکا اثر و نتیجہ نظر آتی ہے اور یہ آیت کریمہ :۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ

اور تم بغیر اس کے چاہ بھی تو نہیں سکتے کہ اللہ پروردگار عالم چاہ لے

کی حقیقت اس کا حال بن جاتا ہے

قربِ ربّانی
اور
کشوف ومواجید، کرامات ورؤیاء

قربِ ربّانی پر جو مباحث گذر چکے ہیں۔ ان سے یہ بات واضح ہے کہ قربِ الٰہی صرف ایمان واعمال صالحہ کا نتیجہ ہے۔ اور قرب کی منازل صرف عقائدِ حقّہ کی تحسین کے ساتھ اعمال صالحہ کی تعمیل وتکمیل سے طے ہوتی ہیں چونکہ انسان صرف امورِ اختیاریہ کا مکلّف ہے۔ اس لئے اس کی ترقیات بھی اختیاری اعمال پر منحصر ہیں۔ غیر اختیاری امور، اور انفعالات کا قربِ الٰہی وترقی روحانی کے حصول میں قطعاً کوئی دخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جملہ ائمہ سلوک اور محقق صوفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ کشوف ومواجید، الہام وکرامات ندا ورؤیاء اور لذت وسرور۔ قربِ ربّانی کی یافت کا قطعاً ذریعہ ونشان نہیں کہ یہ سب امور غیر اختیاری، مجاہدات کے ثمرات عاجلہ، انفعالات اور محض راہ کے تماشے ہیں۔ جن سے بقول مجدد سرہندیؒ اطفالِ سلوک کو بہلایا جاتا ہے مقاصدِ تصوّف سے ان کا کوئی تعلّق نہیں۔ اگر یہ چیزیں کتاب وسنت کے مطابق ہوں تو محمود اور موہبتِ الٰہی ہیں لیکن مقصود ہرگز نہیں کہ اصل مقصد رضائے حق ہے

جو صرف عقائدِ حقہ اور ایمانِ صالحہ کا ثمرہ[1] ہے

یہ چیزیں بسا اوقات مانعِ طریق اور تنزل کا سبب بن جاتی ہیں۔ کہ سالک ان بزرگانہ اوہام" "نورانی حجابات" اور پاکیزہ شعبدوں" میں اس طرح الجھ کر رہ جاتا ہے۔ کہ اصل مقصد بلکہ راستے ہی کو گم کر دیتا ہے۔ اور تمام عمر ان ہی شعبدہ بازیوں میں سرگرداں رہتا ہے اور ان کو حق کا نشان اور رضائے الٰہی کا ثمرہ و انعام سمجھ کر گمراہی اور جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ کیا عجیب بات ہے کہ متصوفین کی بے راہ روی اور عوام کی اعجوبہ پرستی نے اصل مقاصد و عناصر سلوک سے اغماض برت کر انہیں اشیا (کشف وکرامات وغیرہ) کو ہی اصل تصوف اور سلوک کا مقصد قرار دیدیا ہے

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی

فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

حضرت سیّدی نوراللہ مرقدہ نے اسی حقیقت کے متعلق فقیر سے ارشاد فرمایا۔

---

[1] علامہ السیّد محمود الآلوسی البغدادیؒ نے روح المعانی میں حضرت خضرؑ کے قصہ کے ضمن میں ان امور پر قابلِ دید بحث کی ہے اور محقق صوفیہ کے اقوال نقل کر دیئے ہیں۔ جن کا حاصل اُن ہی کے الفاظ میں یہ ہے۔ انّ تلک الغیوب و المکاشفات بل سائر ما یحصل للصوفیۃ من التجلیات لیست من المقاصد بالذات و لا یقف عندھا الکامل ولا یلتفت الیھا

روح المعانی ج ۵ ص ۱۲۳

یہ تمام غیبی باتوں کی اطلاع اور مکاشفات بلکہ وہ تمام چیزیں جو کہ صوفیہ کو (باطنی) تجلیات کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ اصلاً مقاصد میں سے نہیں اور نہ سالک کامل ان چیزوں کا دھیان و پرواہ کرتا ہے۔

...... ہر حالت میں اور ہر وقت اپنی خواہشات کو روک کر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عمل کرنا اپنا ریاض ہے۔ ضابطِ نفس ہو، اللہ تعالیٰ کے اوامر کا ہر حال میں پابند ہو۔ یہی اصل مقصد اور یہی تصوّف ہے۔ آنکھیں بند کر کے سبز و زرد نور دیکھنا یا کچھ نظر آنا یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اگرچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے بچوں کو کھلایا اور بہلایا جاتا ہے اور بادلوں کو دکھا کر کہا جاتا ہے۔ کہ وہ دیکھو ہاتھی لڑ رہے ہیں۔ لیکن ہاتھیوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بچوں کے بہلانے کی چیزیں ہیں۔ مولانا عیسیٰؒ خلیفہ مجاز حضرت تھانویؒ سے ایک شخص نے شکایت کی کہ اب کچھ نظر نہیں آتا، فرمایا تمہارے بلی چوہے نظر نہیں آتے، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ حجاباتِ ظلمانی سے حجاباتِ نورانی زیادہ خطرناک ہیں۔ اسے مقصد سمجھ لیا جاتا ہے اور ان ہی قصوں اور بھول بھلیوں میں سالک اٹک کر رہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ کیفیات کشف و انوار کو مقصد سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ سب کچھ (اکثر) اپنے دماغ کی پیداوار ہوتی ہے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دماغی اوہام نظر آنے لگے، اور سمجھ لیا کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کا نور دیکھ رہے ہیں۔ جس طرح عام لوگوں کے وساوس اور اوہام ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ "بزرگانہ اوہام" ہیں۔

وہ تو ہر چیز سے وراء الوراء ہیں

ہمارا ریاض تو بس یہی ہے کہ سونے چاندی، زر و جواہر کے ڈھیر اور تھیلیاں پڑی ہوں اور ادھر نگاہ تک نہ ڈالی جائے۔ کمالِ حسن و جمال موجود ہو، تنہائی ہو، قدرت ہو، لیکن ادھر اللہ تعالیٰ کے تعلق کی بناء پر قطعاً توجہ نہ کی جائے۔ یہ کیا ہے کہ بارہ سال

جنگل میں روٹی نہیں کھائی۔ اُلٹے لٹکے رہے یہ تو جوگی بھی کر لیتے ہیں"

ایک دفعہ فرمایا "جو آتا ہے یہی کہتا ہے کہ چودہ طبق روشن کردو۔ کوئی نہیں کہتا کہ دل روشن کردو۔ حضرت الشیخؒ کی مراد یہ تھی کہ ہر ایک کشفِ کونیات کے درپے ہے۔ کم لوگ ہی خالص معرفتِ الٰہی کے طالب ہیں۔

حضرت الشیخ قدّس سرّہٗ اپنے متعلقین کو ان حقائق سے ہمیشہ آگاہ و متنبہ فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ مختلف مکتوبات میں ارقام فرماتے ہیں۔

(۱) کیفیات آتی جاتی ہیں، کشف و الہام کو قرب میں کوئی دخل نہیں"۔

(۲) یہ بھی ذہن میں رہے کہ کشف و الہام وغیرہ محض محمود ہیں مقصود نہیں۔ ان باتوں کو قربِ الٰہی میں کوئی دخل نہیں۔ قربِ الٰہی صرف ایمان و عمل صالحہ کا نتیجہ ہے اس لئے دوامِ ذکر اور کثرتِ اعمالِ صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیئے۔

(۳) "کیفیات و احوال کی طرف توجہ نہ کیجئے۔ اور صرف حسن عمل اور کثرت ذکر کی طرف توجہ رکھیے"۔

(۴) ایک طالب پر انوارات غیبیہ اور مکاشفات کا غلبہ ہوگیا تھا ان کو حضرت والاؒ نے تحریر فرمایا۔

"میں نے آپ کے یہ حالات پڑھے ان چیزوں کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ نہ اس کا حقیقی ہونا ضروری ہے اور نہ وہ مقبولیت کی نشانی ہے۔ بلکہ یہ حجاباتِ نورانی حجابات ظلمانی سے اشد ہیں۔ جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا مقولہ نقل فرمایا ہے۔ اصل شئے ایک ہی ہے اور وہ احوال مع اللہ تعالیٰ ہیں۔ علاقۂ الٰہی میں ترقی ہو جس کی علامت عقیدۃً اور عملاً احکام الٰہی کا کامل اتباع ہے باقی

کیفیات وحالات سفر کے تماشے اور مناظر ہیں۔ جیسے کوئی ٹپنہ سے بمبئی جائے تو راہ کے مناظر، کھیت، درخت، پہاڑ، چشمے جو کچھ نظر آئے وہ مقصود نہیں۔ مقصود تو بمبئی پہنچنا ہے۔ اب اگر کوئی مسافر ان مناظر کے حسن میں پھنس کر رہ جاتے تو مقصود سے محروم رہے گا"......

ایک خادم نے لکھا تھا کہ "نماز میں اسرار وغیرہ منکشف کر دیئے جاتے ہیں اور واردات صحیحہ کا بعض اوقات بہت زیادہ نزول ہوتا ہے" اس کے جواب میں حضرت سیدی رحمۃ اللہ علیہ نے عتاباً تحریر فرمایا۔

"نماز کشفِ اسرار اور وارداتِ صحیحہ کا محل نہیں، یہ صرف عبودیت وعبدیت و تواضع وحضور کی کیفیت کا محل ہے آپ ان شعبدوں کی طرف التفات نہ کریں۔ یہ امور قربِ الہٰی میں کچھ دخل نہیں رکھتے اور نہ اس سے حصولِ ثواب ہوتا ہے۔ کیا ریل میں راستہ کے مناظر پہ نظر منزلِ مقصود کو قریب کر دیتا ہے؟ کیا یہ خیال حماقت نہیں"

ایک مرید کو لکھتے ہیں:۔

.... یہ خیال رہے کہ قرب و ولایت کی راہ صرف عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ ہیں بقیہ جذب وشوق و مذار درویار وغیرہ محمود ہیں مگر مقصود نہیں اس لئے ان سے دل نہ لگائیں اس کو راستہ کی سیر کا تماشا جانیں"........

ایک طالب نے لکھا۔ کہ کتاب وسنت کے مطابق جو علوم و اسرار قلب میں ڈالے جاتے ہیں ان کے متعلق بھی یہ خیال ہو گیا ہے کہ یہ سب ظنی اور ناقابلِ التفات چیزیں ہیں۔ اصل چیز کتاب وسنت کی پیروی ہے" حضرت سیدی قدس سرہ نے جواباً تحریر فرمایا:۔

"یہ علوم و اسرار کتاب و سنت کے مطابق ہوں تو بہتر ہیں اور اگر مطابق نہ ہوں۔ تو قابلِ رد ہیں"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "آپ کی استقامت و اصلاح و احوال کے لئے دعا کرتا ہوں، اصل معاملہ عمل کا ہے۔ اس سے ترقی و تنزل کا اندازہ ہوتا ہے معمولات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت اور گناہ سے پرہیز ہی اصل چیز ہے۔ اللہ تعالےٰ میرے اور آپ کے گناہوں کو معاف فرمائیں"۔

انہیں کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :" اصل نظر اپنے احوال قلب اور اعمال پر رہنی چاہیئے، کہ صراطِ مستقیم سے کسی حال میں لغزش نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "نجات تو صرف فضل الٰہی کا کرشمہ ہے۔ عقائد و اعمال کی صحت بمنزلہ شرط کے ہے بس اس میں مصروف رہنا چاہیئے تاکہ اس کے فضل میں حصہ مل سکے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "یہ سب احوال مبارک ہیں۔ مگر اصل شے اتباعِ احکام الٰہی کا اہتمام ہے"

کسی طالب نے تحریر کیا "الحمد اللہ کیفیات و احوال کی طرف توجہ نہیں رہی بلکہ ابتداء میں کشف وغیرہ کا جو عموم تھا۔ اب نہیں ہے اور نہ ہی اس کی طرف رغبت ہے"

اس کے جواب میں حضرت شیخ رحؒ نے ارقام فرمایا:۔

"بحمداللہ تعالیٰ کہ آپ نے اس گھاٹی کو پار کر لیا" اسی طالب کو ایک دوسرے مکتوب نامے میں تحریر فرمایا ہے:۔

اب جو یہ صورتِ حال تواضع اور افتادگی کی پائی جاتی ہے۔ اس حال سے بہتر ہے جو آپ کی کشف و واردات کی تھی۔ وہ راہ خطرناک تھی، کہ اس میں کبر و غرور کا شائبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مانع ترقی ہے"۔

ایک سالک کو تحریر فرمایا:۔

"یہ بھی لکھیں کہ دل پر کیا احوال وارد ہوتے ہیں۔ ورودِ احوال ضروری نہیں مگر اگر ورود ہو تو لکھیں۔ لیکن نہ اس ورودِ احوال کی کوشش کریں۔ کہ یہ مقصود نہیں اور نہ اس غرض سے اس کی طرف توجہ کریں کہ یہ منادنیت کا باعث ہوگا۔"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک مسترشدِ خاص نے لکھا "جہاں تک ذکر و فکر، حق تعالیٰ کی تجلیّات کے محسوس کرنے کا تعلق ہے۔ یہ سب باتیں اور وارد شدہ کیفیات سب تصوری، اور ذہنی معلوم ہوتی ہیں ...."

حضرت والا نے ایک تفصیلی جواب مرحمت فرمایا جس کا حاصل یہ ہے:۔

"یہ شبہ بالکل صحیح ہے اس لئے یہ انوار و تجلیات جن کو عام طور پر انوار و تجلیات کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ نفسانی افکار ہیں .... اس طریق میں عموماً جو مشاہدات ہوتے ہیں۔ وہ ذہنی ہی افکار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ امام نقشبند (خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس سرہ) کا یہ فقرہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

"آنچہ دیدہ شود و دانستہ شود ہمہ غیر خدا است"

بحمداللہ تعالیٰ کہ یہ حقیقت آپ پر ظاہر ہوگئی غرض اصلاً یہ مشاہدات و تصورات مطلوب نہیں یہ تو بطور تدبیر ہیں۔ اصل ان کے نتائج ہیں یعنی صحت"

(تذکرہ سلیمان ص۶۱۵، ۶۱۶)

بعض طالبین مجاہدات کی کثرت کی وجہ سے دماغی خشکی اور ذہنی پراگندگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں گاہے خواب و بیداری میں انہیں کچھ دکھائی دینے لگتا ہے یا پراگندہ اوہام ان کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں اور وہ بیچارے انہیں ہی انوارِ غیبی اور الہاماتِ الٰہیہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں طالبین کے دماغی

توازن و جسمانی صحت کی فکر کرنا محقق مشائخ کا طریقہ ہے۔ حضرت والاؒ ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں۔

"ان باتوں (انوار و تجلیات) کی طرف توجہ نہ کی جائے، سونے کے اوقات پورے کریں۔ چھ سات گھنٹے روزانہ سے کم نہ ہو۔ پھر کھانے پینے کا بھی اہتمام کیجئے، زیادہ مشقت دماغی یا عملی نہ کیجئے۔

عوام کی اعجوبہ پرستی اور متصوفین کی بے راہ روی نے نہ صرف کشوف و مواجید الہام و کرامات کو مقاصد و غایات کا درجہ دے دیا۔ بلکہ مکاشفات الہٰیہ و الہامات ربانی کی حقیقت نہ جاننے اور حق و باطل کے امتیاز کے نہ ہونے کی وجہ سے ہر کشف، اور نام نہاد واردات باطنی، کو حجت قرار دے دیا، اس وجہ سے امت میں طرح طرح کے مفاسد اور غلط عقائد در آئے، یہاں تک کہ بعض مفترین و مغترین نے اسی راہ سے حریم نبوت میں دخول کے باطل دعوے کر دیئے ان ہی مفاسد کے پیش نظر محقق صوفیہ نے ہمیشہ کشف و الہام اور رویاء کی صداقت و صحت کا معیار شریعت مطہرہ اور کتاب و سنت کی واضح تعلیمات کو قرار دیا کہ جو مکاشفات و مواجید اسی ربانی کسوٹی پر پورے اتریں! اور تعلیمات نبویہ کے عین مطابق ہوں۔ انہیں موہبت الہٰیہ، عطائے رب اور محمود سمجھا جائے گا۔ اور جو کشوف و وجدانیات نبوی ہدایات سے سرمو متجاوز ہوں انہیں شیطان کا دھوکہ، نفس کا فریب اور قطعاً مردود و گردانا جائے گا اگر کوئی متبع شریعت شخص بھی ایسی کوئی بات دیکھے یا سنے یا پائے تو اسے باطل اور غوائل شیطانیہ سمجھا جائیگا کہ شریعت کے دائرہ کے باہر حقانیت کے نور کی کوئی کرن اصلاً موجود نہیں۔

اسی طرح اگر اہل باطل اور غیر متشرع اشخاص سے کسی خرق عادت کا ظہور ہو تو

وہ نری شعبدہ بازی، استدراج و امہال ہے جو کبھی بھی مقبولیت الٰہی اور قرب ربانی کا نشان نہیں ہو سکتا، حضرت الشیخ قدس سرہٗ کا اسی کے متعلق ارشاد ہے ؎

شعلے اٹھیں گے ہزار تجلیؔ مگر کہاں
یہ آگ ہے ضرور مگر طور کی نہیں

کہ احکام الٰہی اور سنت نبویؐ کی صریح خلاف ورزی، بدعقیدگی اور فسق و فجور کے ساتھ ان چیزوں کو ولایت کی نشانی قرار دینا نری جہالت، دعوےٰ باطل اور نظام تشریعی و تکوینی کے حقائق سے بے خبری کی دلیل ہے۔

ایک شخص نے حضرت مجدد سرہندی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکتوب دوصد و نہم کو اپنے زعم باطل میں بُنیاد بنا کر چند غلط دعوے کئے تھے۔ ایک مستفسر نے سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے اس کے متعلق استفسار کیا، حضرت سیدی قدس سرہ نے اس کا جواب ایک طویل مکتوب میں دیا جس میں کشف و الہام وغیرہ کے بارے میں بعض اہم حقائق واضح فرمادئے اس سے متعلقہ اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ حضرت والاؒ تحریر فرماتے ہیں :-

"امر اول یعنی شخص مذکور کے ہفوات تو وہ تمامتر ضلالت اور کفر کی باتیں ہیں۔ ان سے ہر مسلمان کو توبہ کرنا چاہیئے۔ کہ اس کے ان باطل خیالات کو حضرت امام ربانیؒ کے مکتوب سے اصلاً تعلق نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔ وہ امام ربانی کے قول کو بالکل نہیں سمجھا ہے۔ اور اس کی بنیاد پر اس نے جو دعوےٰ کیا ہے وہ تمام تر باطل ہے۔۔۔ ۔۔۔۔۔ امام ربانی کے اس مکتوب پر بنیاد رکھ کر شخص مذکور کا یہ کہنا کہ اس وقت نہ حج ہے۔ نہ روزہ ہے نہ زکوٰۃ ہے۔ قول باطل ہے احکام قرآنی کو تمنّی کتنا ہی بڑا

ولی ہو نسخ نہیں کر سکتا۔ نہ اولیاء کے کشف و الہام سے انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے احکام منسوخ ہو سکتے ہیں۔ ایسے کشف و الہام جو وحی نبوت کے خلاف ہوں باطل اور وسوسہ شیطانی ہیں۔

شخص مذکور کو چاہیئے کہ وہ اپنے اس عقیدہ باطل سے توبہ کرے۔ اور پھر سے کلمۂ اسلام پڑھ کر دوبارہ مسلمان ہو۔

امام ربانیؒ نے ایک بات اصول کے طور پر خود ہی فرمادی ہے۔ کہ ذوقی علوم و معارف بلکہ کشوف و الہامات جب ہی قابل تسلیم ہوتے ہیں جب وہ کتاب و سنت اور عقائد حقہ کے مطابق ہوں ورنہ وہ قابلِ رد ہیں۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس کو امام ربانی نے مکتوبات شریف میں جا بجا لکھا ہے۔ چنانچہ اسی مکتوب دوصد و نہم کے آخر میں فرماتے ہیں۔

"انبیاء اولعزم کے ایک دوسرے سے افضل ہونے کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ چونکہ کشف و الہام پر مبنی ہے۔ جو ظنی ہیں اس لئے اس کے لکھنے اور حقیقت میں تقریر کرنے سے توبہ کرتا ہے۔ کیونکہ قطعی دلیل کے سوا اس میں گفتگو کرنا جائز نہیں"

اس سے معلوم ہوا۔ کہ صرف کشف و الہام سے قطعیات کے بغیر گفتگو کرنا توبہ کے قابل ہے اسی حقیقت کو مکتوب چہل و یکم میں یوں ظاہر فرماتے ہیں۔

"فرق درمیانِ علم کہ وحی است و علمِ ولی کہ بطریق الہام است۔ ایں است کہ در وحی قطع و یقین است و در الہام ظن و تخمین۔ چرا کہ وحی بواسطہ ملک است و ملائکہ معصوم اند از خطا، و الہام اگرچہ محلِ عالی دارد و آن قلب است کہ از عالمِ امر

است، اما قلب را با عقل و نفس نحوے از تعلق متحقق است، پس خطا را درون موطن مجال پیدا شد"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اولیاء کے الہامات ممکن الخطاء ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام کی وحی خطا سے خالی ہے۔ اس لئے ممکن الخطاء سے ناممکن الخطاء وحی منسوخ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ حضرت امام ربانیؒ کا قول ہے۔ کہ الہام کی صحت کا معیار یہ ہے کہ وہ علمائے اہل سنت کے قول کے مطابق ہو۔ اور اگر ذرا بھی اس سے مخالف ہو۔ تو وہ دائرہ صواب سے خارج ہے مکتوب صد و دوازدہ میں فرماتے ہیں :۔

" مصداق صحتِ کشف و الہام مطابقت با علمائے اہل السنۃ و اگر سر مو مخالفت است از دائرہ صواب بیروں است ہذا ہو العلم الصحیح و الحق الصریح فماذا بعد الحق الا الضلال" جو لوگ صوفی بن کر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ جن سے نماز، روزہ وغیرہ کا مقصود نہ ہونا ثابت ہو، وہ گمراہ ہیں۔ چنانچہ مکتوب چہل و سوم میں فرماتے ہیں :۔

" اکثر ابنائے ایں زماں بعضے بہ تقلید و بعضے بمجرد علم، و بعض دیگر بعلم ممتزج بدون و بعضے بالحاد و زندقہ دست بدامنِ توحید وجودی زدہ اند و ہمہ را از حق میدانند و نگر دنہائے خود را از ربقۂ تکلیف شرعی بایں حیلہ می کشایند، و مداہنات در احکام شرعیہ می نمایند، و بایں معاملہ خوش وقت و خورسندی شوند و انیاں اوامر شرعیہ را اگر اعتراف دارند طفیلی می دانند و مقصود اصلی ورائے شریعت خیال می کنند حاشا و کلا نعوذ باللہ من ھذا الاعتقاد السوء"

مکتوب صد ملا حسن کشمیریؒ کے جواب میں جنہوں نے لکھا تھا۔ کہ شیخ کبیر یمنیؒ ایک بزرگ کا قول ہے کہ حق تعالےٰ جزئیات کا علم نہیں رکھتے، فرماتے ہیں۔

"محذوماً! فقیر را تاب استماع امثالِ ایں سخنان اصلاً نیست بے اختیار رگِ فارقیم در حرکت می آید و فرصت تاویل و توجیہ آن نمی دہد، قائل ایں شیخ کبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر شامی، کلام محمد عربی علیہ و آلہ الصلوٰۃ والسلام درکار است نہ کلام محی الدین عربی و صدر الدین قونوی، مارا بہ نص کار است نہ بافص، فتوحاتِ مدینہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است"

پس جس پیمانہ سے حضرت امام ربّانی مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ نے دوسرے اولیاء اور بزرگوں کے اقوال اور ان کے الہامات اور کشوف کو ناپا ہے اس پیمانہ سے حضرت کے اقوال والہامات وکشوف کو ناپا جائے گا اور اس سے حضرت امام ربّانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کشف والہام یا ذوق و وجدان ہرگز ظاہر شریعت کے خلاف تسلیم نہیں ہوسکتا ہے اور نہ اس کا ایسا مطلب لیا جاسکتا ہے۔ جو تمام تر خلاف شرع ہو۔ اس بناء پر شخص مذکور کا قول تمامتر ملحدانہ اور زندیقانہ ہے اور حضرت امام ربّانی کے قول کا جو مطلب سمجھا ہے۔ وہ حضرت امام ربّانیؒ پر افتراء و بہتان[1] ہے"

---

[1] یہاں کشوف و مواجید کے متعلق حضرت امام ربّانی مجدد سرہندیؒ کا مکتوب نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے مکتوب سی و ششم میں ارقام فرماتے ہیں۔

"شریعت را سہ جزو است علم، عمل، اخلاص	شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم و عمل اور اخلاص
تا ایں ہر سہ جزو متحقق نشوند، شریعت متحقق نشود،	جب تک یہ تینوں جزو متحقق نہ ہوں۔ شریعت
چوں شریعت متحقق شد رضائے حق سبحانہ و تعالیٰ	متحقق نہیں ہوتی۔ جب شریعت متحقق (و حاصل)
حاصل گشت کہ فوق جمیع سعادات دنیویہ و اخرویہ	ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کی رضا میسر آجاتی ہے جو دنیا و

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کرامات ممیزہ کے بارے میں ایک مستفسر کو تحریر فرماتے ہیں:"کرامات کا صدور در صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ہوا ہے۔ یہ سب بہ تبعیت کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم

است۔ ورضوان من اللہ اکبر۔ پس شریعت متکفل جمیع سعادات دنیویہ و اخرویہ آمد و مطلبی نماند کہ بماورائے شریعت دراں مطلب احتیاج افتد' طریقت و حقیقت کہ صوفیہ باں ممتاز گشتہ اند ہر دو خادم شریعت اند در تکمیل جزو ثالث کہ اخلاص است، پس مقصود از تحصیل آں ہر دو تکمیل شریعت است نہ امر دیگر ورائے شریعت' احوال و مواجید و علوم معارف کہ صوفیہ در اثناء راہ دست میدہند نہ از مقاصد اند بل اوھامٌ وخیالاتٌ تُربیّ بھا اطفال الطریقۃ' از جمیع اینہا گذشتہ بمقام رضا باید رسید کہ نہایت مقام سلوک وجذبہ است"چہ مقصود از طی منازل طریقت و حقیقت ماورائے تحصیل اخلاص نیست کہ مستلزم مقام رضا است از تجلیات سہ گانہ و

آخرت کی تمام سعادتوں سے بڑھ کر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے بڑھ کر ہے۔ (قرآن) پس شریعت دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں کی ضامن ہے۔ اور کوئی ایسا مطلب باقی نہیں جس کے حاصل کرنے کیلئے شریعت کے سوا کسی اور چیز کی حاجت پڑے طریقت اور حقیقت جن سے صوفیہ ممتاز ہیں۔ تیسرے جزو یعنی اخلاص کے کامل کرنے میں شریعت کے خادم ہیں (یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ طریقت و حقیقت شریعت کے طرق و اس کی حقائق یابی کے عنوانات ہیں شریعت سے علیحدہ ان کا کوئی وجود نہیں جیسا کہ مجدد صاحب نے معارف لدنیہ میں تصریح کی ہے م۔ا) پس ان دونوں (طریقت و حقیقت) کی تحصیل سے مقصود شریعت کی تکمیل ہے شریعت کے علاوہ اور کوئی چیز مقصد نہیں۔ احوال و مواجید اور علوم و معارف جو صوفیہ کو سلوک کی راہ میں حاصل ہوتے ہیں۔ مقاصد میں سے نہیں۔ بلکہ وہم و خیالات ہیں۔ جن سے طریقت کے بچوں (کا دل لگا کر) تربیت کی جاتی ہے۔ اصل مقصود ان سب سے گذر کر مقام رضا تک پہنچنا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ہوا ہے جس طرح حکومت کے چپراسیوں اور ادنے ملازموں تک کے احکام آپ مانتے ہیں یا آپ احترام کرتے ہیں مگر یہ ان کا شخصی نہیں۔ بلکہ امیرِ وقت یا حکومت کے احترام کے تحت میں ہے۔ گو بہت سے کرامات کے قصّے گھڑے ہوئے بھی ہیں مگر ان کے صحیح ماننے یا نہ ماننے کو ایمان میں کوئی دخل نہیں۔ قبروں کو سجدہ کرنا غیر خدا سے دعائیں مانگنا اور اس قبیل کی چیزیں بے شبہ مشرکانہ رسوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔"

مشاہدات عارفانہ گزارندہ از ہزاراں یکے را بدولت اخلاص و مقام رضا میرسانند، کوتہ اندیشاں احوال و مواجید را از مقاصد می شمرند و مشاہدات و تجلیات را از مطالب می انگارند لاجرم گرفتار زندانِ وہم وخیال میمانند و از کمالات شریعت محروم میگردند۔ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ، اَللّٰهُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ۔ آرے حصول مقام اخلاص و وصول بمرتبہ رضا منوط بطیّ ایں احوال و مواجید است و مربوط بہ تحقق ایں علوم

چونکہ مقام رضا سلوک و جذب کا انتہائی مقام ہے کہ طریقت و حقیقت کی منازل طے کرنے سے مقصود صرف تحصیل اخلاص ہے۔ اور اخلاص مقام رضا کا حصول لازمًا کرا دیتا ہے۔ (افعالی ذاتی وصفاتی) تین قسم کی تجلیات اور عارفانہ مشاہدات سے گذار کر ہزاروں میں سے کسی ایک کو اخلاص اور مقام رضا کی دولت تک پہنچاتے ہیں ناسمجھ اشخاص احوال و مواجید کو ہی اصل مقاصد گردانتے ہیں اور مشاہدات اور تجلیات کو اصل مطلب جانتے ہیں۔ حقیقتاً یہ لوگ وہم وخیال کے قید خانہ میں گرفتار رہتے ہیں اور شریعت کے کمالات سے محروم ہوجاتے ہیں۔ مشرکین کو وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ)

و معارف، پس اینہا معدّاتِ مطلوب باشند و مقدّماتِ مقصود، حقیقت این معنیٰ بصدقۂ حبیب اللہ علیہ وآلہ الصلوات والتسلیمات برایں فقیر بعد از دہ سال کامل دریں راہ بوضوح انجامید و شاہد شریعت کما ینبغی جلوہ گر گشت، ہر چند از اول گرفتاری احوال و مواجید نداشت و غیر از تحقق بہ حقیقت شریعت مطلبے در نظر نہ بود۔ لیکن بعد از عشرۂ کاملہ حقیقت امر کماہو بظہور آمد۔

الحمد للہ علیٰ ذٰلک حمدا کثیرا مبارکا فیہ

(م۔ل)

وہ بات بڑی بھاری اور مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جس کی طرف تو ان کو بلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے۔ اپنے لئے چن لیتا ہے اور جو اس کی طرف انابت و رجوع اختیار کرتا ہے۔ اسے ہدایت دیتا ہے۔ ہاں مقام اخلاص کا حصول اور مرتبہ رضا تک رسائی (ذریعہ و تربیت کے درجہ میں) ان احوال و مواجید کے طے کرنے پر موقوف اور ان علوم و معارف کے ثابت ہونے کے ساتھ وابستہ ہے پس یہ سب باتیں مطلوب حاصل کرنے کے اسباب اور مقصود تک پہنچنے کے مقدمات و وسائل ہیں (یعنی ذریعہ مقصد ہیں اپنی ذات میں مقصود نہیں) مذکورہ حقیقت بندہ پر حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اس فقیر پر پورے دس سال میں کھلی اور شریعت کا محبوب کما حقہ جلوہ گر ہوا۔ اگرچہ ابتداء ہی سے احوال و مواجید کی گرفتاری نہ رکھتا تھا اور شریعت کی حقیقت متحقق ہونے کے بغیر اور کوئی مطلب مدّ نظر نہ تھا لیکن دس سال بعد اصل حقیقت کما حقہ ظاہر ہوئی، الحمد للہ علیٰ ذالک حمدا کثیرا مبارکا فیہ

(م۔ل)

خواب، رویا اور قبر

کشوف و مواجید کی طرح رویا اور خوابوں کو حدود سے متجاوز اہمیت دے دی گئی ہے۔ حالانکہ خواب محض بشارت ہیں۔ سچے خواب ولایت کا نشان کیا ہوتے ہیں کافر و مومن کی بھی تخصیص نہیں۔ جیسا کہ عزیز مصر کے قرآنی قصہ سے ثابت ہے۔ اس لئے اسے قرب الٰہی کا نتیجہ سمجھنا یا خوابوں پر نرا اعتبار کر لینا ناواقفیت اور حقیقت ناآشنائی کی دلیل ہے بعض طبائع کو رویا کے ساتھ فطرتی مناسبت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ خواب زیادہ دیکھتے ہیں۔ مزید برآں ہر خواب رویا صادقہ اور ربانی بشارت نہیں ہوتا بلکہ طبعی مؤثرات ذہنی خیالات، اور شیطانی تاثیرات بھی اکثر خوابوں کا سبب ہوتی ہیں۔ اس لئے ہمارے خوابوں پر نہ تو (بغیر قرآن و سنت کے دلائل کے) اعتبار کیا جا سکتا ہے اور نہ تو ان پر کسی معاملہ کا مدار ہے اور نہ تو خواب کی وجہ سے کسی مشروع و درست بات کو معلق یا مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ غیر انبیاء کے اچھے خوابوں کی حیثیت الٰہی خوش خبری کی ہے جس سے بشارت و ہمت افزائی مقصود ہے۔ اس لئے خواب سبب فرحت اور محمود تو ہیں لیکن مقصود اور مدار احکام و شرائع نہیں۔ اس لئے ان کی وجہ سے بیداری کے معمولات شرعیہ اور احکام الٰہیہ میں قطع و برید، زیادت و کمی قطعاً ناجائز و جہالت ہے

غرض خواب خواب ہیں۔ اور کسی عمل کا موقوف علیہ نہیں، اور بیداری کے جملہ اعمال و معاملات کا مدار، بناؤ اور سنوار شریعت مطہرہ کے احکام و اوامر پر ہے۔ اس لئے ہر خواب سے قطع نظر ہر حال میں احکام الٰہیہ اور تعلیمات نبویہ کی پیروی ہی کامیابی کی کلید اور نجات کا ذریعہ ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو رقم فرماتے ہیں

"خواب اور رویاء کے پیچھے نہ پڑیئے۔ یہ گو بشارت ہو مگر مقصود نہیں۔

مقصود بذریعہ اعمال حصولِ رضا و قرب ہے، رویائے صادقہ بشارت ہیں اور بس"

ایک دوسرے طالب کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"خواب کی حیثیت محض مبشرات کی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ بیداری کے معاملات کی طرف توجہ فرمائیے۔ اُسی کا سوال اور اس کا مواخذہ ہے۔ باقی رویاء اور خواب مبشرات سے زیادہ نہیں۔ دھن کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہیئے اور ظاہر و باطن کی تہذیب و درستگی میں لگے رہیئے (خواب وندا وغیرہ) ناقابل التفات امور ہیں۔ اپنے کام میں لگے رہیئے"

مولانا مسعود عالم ندویؒ کو لکھتے ہیں:۔

"خوابوں پر اعتبار مبشرات کی حد تک ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔ اور لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ کی تفسیر میں وارد ہے۔ اس کے علاوہ خوابوں پر کوئی بھروسہ نہیں۔ ہمارے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چوں غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب جویم" (مکاتیب سلیمان ص۱۷۶)

ایک مسترشدِ خاص کو ارشاد فرماتے ہیں :-

" خواب کو اہمیت نہ دیجئے۔ بس یوں سمجھیں کہ رحمت الٰہی متوجہ ہے اور اس سے فائدہ اٹھائیے .... خواب کی اہمیت اس قدر ہے۔ کہ اگر رویائے صادقہ ہے تو مبشرات میں سے ہے (تذکرہ سلیمان صفحہ ۴۰۳، ۴۰۴)

ایک خط میں ہے " خواب کی حیثیت جیسا کہ آپ جانتے ہیں بشارت ہے "

ایک خواب کی تعبیر دیتے ہوئے ایک سالک کو ارقام فرمایا :-

.... خواب کی حیثیت صرف بشارت کی ہے اور اس ہیچمدان کو دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ساری توفیقات ہیں وہ جب چاہتے ہیں تو کسی بندہ کو خواب یا بیداری میں تنبیہ یا توفیق ارزانی فرماتے ہیں اور اس کے لئے کبھی کبھی " اوقع فی النفس " ہونے کے لئے اس کی شکل وصورت کو وہ بمنزلۂ جارحہ وآلہ بناتے ہیں جس سے صاحب معاملہ کو مناسبت اور محبت اور عقیدت ہوتی ہے۔ وَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ ..... (بہرحال) خواب کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس بات کا شکر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تربیت اس طرح فرماتے ہیں ..... (لیکن) خواب کی طرف توجہ نہ کیا کریں (کہ) رویا (محض) بشارت ہیں۔ ان کے سوا ان کی اور کوئی حیثیت نہیں نہ یہ ذریعہ قرب ہیں اور نہ ان پر آتکال مفیدِ طریق، البتہ خوش ہونا چاہیئے "

انہیں کے نام دوسرے مکتوبات میں ارشاد ہوتا ہے :-

" یہ سب (خواب) بشارات ہیں اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کیفیت عطا ہو رہی ہے۔ جس کا بیان ہے۔

قلبه معلق بالصلواة او بالمسجد فهنیاءً لکم .....

" خواب کی حیثیت شرع میں صرف بشارت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اظہار بشارت کے لئے کبھی اُن شکلوں کو منتخب فرماتے ہیں جن سے خواب دیکھنے والوں کو مناسبت ہوتی ہے۔ اس میں خواب میں نظر آنے والے بزرگوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اظہار بشارت میں (انہیں) اپنا آلہ اپنے فضل سے بنالیا۔ وللہ الحمد۔ رویا میں غلیظ و نجاست دیکھنا دنیا طلبی اور حب مال دنیا کی تمثیل ہے۔ ظاہری نجاست نہیں۔ اس باطنی نجاست سے اپنے کو پاک کیجئے۔ اور مشتبہات مال سے پرہیز کیجئے"

ایک ندوی فاضل کو لکھتے ہیں:۔

" آپ کا خواب مبارک ہے۔ اور اس میں اس کی بشارت ہے۔ کہ آپ کو سلسلہ اشرفیہ و امدادیہ سے طبعی مناسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید عنایت فرمائیں۔ مگر یہ خیال رہے کہ قرب و ولایت کی راہ صرف عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ ہیں۔ بقیہ جذب و شوق و ندا و رویا، وغیرہ محمود ہیں۔ مگر مقصود نہیں۔ اس لئے ان سے دل نہ لگائیں۔ اس کو راستہ کی سیر کا تماشا جانیں۔ انہیں کے دو دگر خوابوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ " آپ کے یہ خواب مبارک ہیں پہلے خواب کا منشاء تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کے سیر سلوک میں میرے مشورے مفید و معاون ثابت ہوں گے۔ دوسرا خواب بھی ادھر ہی ہدایت کرتا ہے۔ چونکہ محبت کا اقتضاء حال اور کیفیات و جذبات پر عقل کو غالب کرنا اور عقل پر حکم شرع کو غالب کرنا اصل دین ہے۔ اس لئے پولیس نے آپ کو اس بے قابو ہونے اور مدہوشی) سے روکا۔ میرا یہ منہ کہاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتحاد کا دعویٰ کروں مگر آپ کا خواب آپ کو یہی بتاتا ہے کہ میری تعلیم میں سنت

نبوی کا اتباع ہے۔ بہرحال خواب محض بشارت ہے۔ ان پر اعتماد کرکے اپنی حالت سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ (اور) دو باتوں کا خاص لحاظ رکھا جائے۔ اول فرائض کی ادائیگی کا پورا پورا اہتمام دوم نوافل مسنونہ اور اذکار کی کثرت، ان کے علاوہ ہر قسم کے گناہوں سے احتراز کا اہتمام رکھا جائے کہ دل میں تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو۔"

ایک اور مکتوب میں ہے:۔ "آپ کا خواب مبارک ہے اور اس سلسلے میں آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اللھم زد فزد"

ایک صاحب نے لکھا کہ "موجودہ بیماری سے پیشتر خواب میں مرض کے بارے میں مطلع کر دیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کے ساتھ یہی صورت ہوتی ہے اور یہ علو مدارج کا ذریعہ ہے"۔ حضرت والا نے جواب میں عتاباً تحریر فرمایا :۔

" خواب سے مطلع کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس سے اپنی بزرگی کا زعم نہ ہو، کہ ایسے خواب فاسق بھی دیکھ سکتے ہیں۔

رویائے نبوی

رویائے نبوی بہت بڑی نعمت اور اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے۔ لیکن یہ نعمت بھی نہ تو بزرگی کی دلیل ہے نہ تو حجت شرعی، محض عنایتِ رب اور بشارت عالیہ ہے۔ اس لئے وجہ مسرّت و محمود ضرور ہے۔ لیکن عقائد و اعمال کا مبنیٰ ہرگز نہیں۔ اس بارے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ ہم جیسوں کا کیا مقام کہ حضورِ انور سیّد الانبیاء والمرسلین صلوٰات اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رویتِ مناجی کا حوصلہ و حرص کریں۔ کہ وہ جمال جہاں آراء استحقاقاً ہر کہ ومہ کو مشرف نہیں کر سکتا۔ جیساکہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک طالب کی ایسی ہی تمنا پر ارقام فرمایا تھا کہ

"یہ تو بڑی ہمت کی آرزو ہے، ہم کس لائق ہیں۔ کہ اس دربار میں رسائی کی آرزو کریں"

ایک اور مسترشد کو تحریر فرمایا:۔ بے شک یہ بڑی جرأت کی بات ہے تاہم کثرتِ درود سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے":

مزید برآں اگر اللہ تعالیٰ کسی کو آپؐ کی زیارتِ منامی سے مشرف فرما بھی دے تو اس کا حق حقوقِ نبویؐ (عظمت و محبت، اتباع و نصرتِ نبوی) کے ذریعہ ادا کرنا مزید مؤکد ہو جاتا ہے ورنہ سلبِ نعمت کا خطرہ رہتا ہے۔

ایک خادم جس نے چار پانچ مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا۔ اپنے خوابوں سے حضرت والاؒ کو مطلع فرمایا۔ حضرت الشیخ قدس سرہ نے جواباً تحریر فرمایا:۔

"بے شبہ رویائے نبویؐ موجبِ خیر و برکت اور باعثِ بشارت ہیں لیکن اس کا شکریہ بھی اتباعِ نبویؐ کے ذریعہ ادا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ سلبِ نعمت کا خوف ہے"

حضرت والا نور اللہ مرقدہٗ کے ایک مسترشد خاص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارتِ منامی سے مشرف ہوئے اور خواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے لپٹ گئے اور دہن مبارک کو چوما۔ انہوں نے حضرت والاؒ کو اپنے خواب کی اطلاع دی حضرت والاؒ نے اس رویا کے متعلق تحریر فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک بڑی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اور ہر نعمت کی قدر واجب ہے۔ تاکہ مزید عطا ہو۔ اور کوئی مرتکب عدمِ شکر ہو۔ تو نہ صرف سلبِ نعمت کا خوف ہے بلکہ ابتلاء کا بھی، اس نعمت کی قدر یہ ہے کہ معمولات میں درود شریف کی ایک تعداد بھی داخل کریں جس کو باآسانی پورا کرسکیں اگر ہر شب نہ ہو سکے تو جمعہ کو تو ضرور اہتمام کیجئے خواہ

میں کمی ہو جاتے"

دوسرا اہتمام یہ ہے کہ اب اس سینہ کو برائیوں سے پاک اور اس منہ کو ہر خلاف شرع قول (غیبت وکذب وغیرہ) سے محفوظ رکھئے[1]..... میری دعا ہے کہ اتباع سنت کی مزید توفیق ہو۔"

---

[1] حضرت سیدی قدس سرہٗ کو تعبیر خواب کے ملکہ یوسفی سے بہرہ وافر عطا ہوا تھا۔ اور اس کا پورا اندازہ تو سالکین کے نام تربیتی مکتوبات سے ہو گا۔ نمونۃً ایک خواب اور اس کی تعبیر پیش کی جاتی ہے۔ حضرت مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مدظلہ نے خواب دیکھا کہ "ریل کے ڈبہ جیسی ایک موٹر ہے اگلی سیٹ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف فرما ہیں۔ مگر پائے مبارک میں چوٹ ہے اور پچھلی سیٹ پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لاش مبارک ہے۔ سید صاحبؒ نے جسد مبارک سے قلب اقدس کو لے کر انہیں دیا۔ انہوں نے اس کو بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا اور سید صاحبؒ نے پھر اس کو جسد اطہر میں رکھ دیا" حضرت والا قدس سرہ کو انہوں نے اپنے خواب سے مطلع کیا اور سید صاحب نے اس خواب کی کیا عجیب تعبیر دی۔ ملاحظہ فرمائیے سید صاحب ارقام فرماتے ہیں "حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اگلی سیٹ میں ہیں، وہ تورات سے عبارت ہے۔ پائے مبارک کو صدمہ توراۃ کی تحریف کی طرف اشارہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی لاش مبارک اسلام سے عبارت ہے اس کا قلب اقدس قرآن پاک ہے جو میرے واسطے سے آپ تک پہنچا۔ خود سیرۃ نبوی کی تالیف میں شرکت بھی میری ہی ذات کے واسطے سے ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی نوازش اور لطف وکرم محض ہے۔ جو اپنی غفاری وستاری سے ایسے رویائے بشارت سے سرفراز فرماتے ہیں۔"

اسی طرح بقول حضرت الشیخؒ "صالحین کو دیکھنا بھی بشارت و برکت ہے"۔

تاہم نرے خوابوں پر تکیہ و اتکال کسی صورت مفید طریق اور ذریعہ قرب و رضا نہیں محض خوش خبری اور بشارت ہیں جن سے فرحت و انبساط حاصل کر کے مزید ہمت و عزیمت کے ساتھ اعمالِ خیر میں مشغول ہو جانا چاہیئے کہ نعمت کا شکریہ ادا ہو سکے کہ اس بارے میں صلحا اور محققین کا یہی طریق رہا ہے۔

قربِ ربّانی و لذّت

سالکین کو اس راہ میں ایک اور گھاٹی یہ پیش آتی ہے کہ وہ مختلف اذکار و احوال کی لذت کی طلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے حاصل نہ ہونے پر ناکامی کا گمان کر بیٹھتے ہیں۔ حضرت سیدی و مولائی نور اللہ مرقدہ اس لذت طلبی کو سالکین کے حق میں انتہائی خطرناک سمجھتے تھے ایک طالب سے جو اذکار و نماز وغیرہ میں لذت نہ ملنے پر رنجیدہ تھے۔ احقر کی موجودگی میں فرمایا۔ "لذت کو قرب میں کوئی دخل نہیں، یہ دو دھاری تلوار ہے اور بڑے خطرے کی چیز ہے" طالب نے عرض کیا "بغیر لطف و لذّت کے عمل مشکل ہو جاتا ہے"۔ فرمایا: "یہ تو ازالۂ مشکل لذت کے لئے ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں ہوا، ممکن ہے۔ ایسا شخص لذت کے لئے نماز پڑھ رہا ہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے نہ پڑھ رہا ہو" پھر فرمایا: "یہ عامیانہ تصوف کہاں سے سیکھ لیا، یہ تو گویا کہ لئے نماز پڑھنا ہو گیا" پھر اپنے چند اشعار پڑھے۔

تیرے نام ہی میں حلاوت ملے جو ذوقِ محبت کی لذّت ملے
جو تیری رضا کی بشارت ملے تو دونوں جہانوں کی راحت ملے
محبت تو اے دل بڑی بات ہے یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے
ہر حال بندے پہ ہے بندگی کرم ہے جو ذوقِ عبادت ملے

ترے عشق کے غم کی دولت ملے تو سارے غموں سے فراغت ملے

اور فرمایا: "بس طالب مولیٰ بنیئے، طالب لذت نہ بنیئے، دوا سے صحت مقصود ہو۔ دوا کی لذت مقصود نہ ہو۔ حکیم کو منتخب کیا جائے تو اس سے یہ نہ کہا جائے کہ خمیرہ گاؤزبان لکھ دیجئے۔ اگر وہ چرائتہ لکھ دے تو آپ کو یہ حق نہیں کہ اس سے منع کریں۔

بدر و وصاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ ہر کہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

ایک دوسرے صاحب نے ایک موقع پر فقیر کی موجودگی میں عرض کیا "حضرت بعض اوقات ذکر شوق و ذوق سے نہیں ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات دل پتھر سا معلوم ہوتا ہے کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا" فرمایا۔

" یہ احوال ہیں۔ جو بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی فکر کی ضرورت نہیں۔ اصل چیز تو مقامات ہیں معلوم ہوتا ہے۔ ابھی تک آپ ان کیفیات و لذت وغیرہ کے چکر سے نہیں نکلے۔ ان ہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ کشف و لذت کچھ نظر آنا۔ یہ چیزیں التفات کے قابل نہیں مقامات کو حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ صبر و شکر، رضا وغیرہ، توجہ و کوشش کے قابل تو یہ چیزیں ہیں۔ غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑنا چاہئیے۔ جب تک ان چیزوں سے نہ نکلا جائے مقصود کا پتہ نہیں چلتا۔ غیر مقصود کو مقصود سمجھ لینا سب سے بڑی غلطی ہے"

ایک گرامی نامہ میں ارقام فرمایا۔

" ذکر میں لذت کی تلاش اور اس کے نہ ملنے پر مردودیت کا شبہ اس راہ کا سخت پتھر ہے اگر اس ذوق کا جاتا رہنا گناہ کے سبب سے نہ ہو تو مضر نہیں، اور یوں بھی "کل جدید لذیذ" کے اصول سے ایک مدت کے بعد اس کا مزہ باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ اغذیہ

مادی کا حال ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ لذت ملنے نہ ملنے پر تولید خون موقوف نہیں۔ وہ صرف ہضم ہونے والی غذاؤں سے بنتا ہے۔ آپ اپنی طرف سے کوشش کر کے غذا کھائے جائیں اور نتیجہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔"

ایک دوسرے مکتوب میں ہے:۔

"خوشی کی بات ہے کہ آپ تہجد پڑھتے ہیں۔ پہلے جو کبھی تہجد کا موقع ملتا تھا۔ اس وقت دعا اور گریہ جو ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی پڑھنے کی وجہ سے تھا۔ اب مداومت سے پڑھنے پر جو وہ کیفیت روزانہ نہیں ہوتی تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

یہ ایسی ہی ہے کہ جس کو کبھی کبھی پلاؤ کھانے کو ملتا ہے تو اسکو اسمیں بہت مزہ ملتا ہے۔ لیکن جب وہ ہی غذا کسی کو روزانہ ملنے لگے تو وہ مزہ اس کو نہیں ملتا، مساوات ہو جاتی ہے۔ پھر گریہ سے تہجد کی مداومت ہزار درجہ بہتر ہے اور شکر کے قابل ہے"

ایک خط میں تحریر فرمایا:۔

"لذت گو نعمت ضرور ہے۔ لیکن اس کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں"

ایک مرید کو لکھتے ہیں:۔

"سالک کو بڑا دھوکا ذوق وشوق اور لذت کا ہوتا ہے۔ سو اس کو پوری طرح سمجھ لیجئے۔ کہ یہ چیزیں آثار محمودہ ضرور ہیں۔ مگر مقصود نہیں۔ ان کا منشاء اسی قدر ہے کہ کام میں جی لگتا ہے اور آسانی ہو جاتی ہے۔ مگر اس کو قرب و رضا اور حصول ثواب میں کوئی دخل نہیں۔ کیونکہ یہ امور غیر اختیاریہ میں ہیں اور امور غیر اختیاریہ نہ مطلوب ہیں نہ مقصود، دوا کا اعلیٰ مقصود صحت بخشی ہے۔ خوش ذائقگی اور لذت نہیں۔ جب انسان کے بدن میں صحت آتی ہے۔ تو طاقت اور کھانے کی لذت خود آجاتی ہے۔ اس کے لئے کوئی الگ دوا کی حاجت نہیں۔

ایک سالک کو ارقام فرمایا۔

" ابتدائی جوش و شوق میں کمی فطری ہے۔ یہ مرحلہ زندگی میں پیش آتا ہے۔ یہ کوئی افسوس کی چیز نہیں۔ جوش و شوق ہو یا نہو عمل میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔ جس طرح آغاز شباب میں عروسِ نو کے ساتھ جو شوق و جوشِ طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ تمکین سے بدل جاتا ہے اور بجائے بوالہوسی کے دیرینہ محبت اور باہمی وفاداری اس کی جگہ لیتی ہے میرا ایک شعر ہے۔ ؎

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکون عشق کی۔

ہائے وہ جوش تو ہنگامہ آغاز ہے۔"

اپنے ایک مسترشد خاص کو ارشاد فرماتے ہیں:۔

" اگر آپ کو اپنے اعمالِ حسنہ کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سراب ہیں تو ایسا سمجھنا اس بنا پر ہے۔ کہ آپ کو ان میں چمک دمک اور لطف و تڑپ نہیں محسوس ہوتی، جو نتیجہ ہے۔ محبت طبعی اور محبت عقلی میں فرق نہ کرنے کا، محبت طبعی بہیمی چیز ہے۔ جس کے آثارِ ظاہرہ حیوانات تک میں محسوس ہوتے ہیں لیکن محبت عقلی میں کمال سادگی ہوتی ہے اور اس کا منشاء صرف طلبِ رضائے دوست اور اس کے حکم کی تعمیل ہے۔" (تذکرہ سلیمان ص۱۱۲)

ایک صاحب کو ارشاد فرماتے ہیں: " یہ انبساط و انشراح مبارک ہو۔ گو یہ انشراح و انقباض آتا جاتا رہتا ہے اس کی پرواہ نہ کیجئے۔ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے نیک امید رکھئے اور اپنے کام میں لگے رہیئے۔"

دوسرے مکتوب میں ہے!

" اس راہ میں ایسا ہوتا رہتا ہے (کہ سرور و لذت نہیں ملتا)۔ اس کی فکر نہ کیجئے، یہ

سرور ولذت ہمارے آپ کے اختیار کی چیز نہیں۔ ان کے درپے نہ ہوئیے! انکا معصیت، صحبتِ ناجنس اور غفلت نہ ہو۔ اس کا علاج استغفار کی کثرت ہے اور بہت نافع ہے" (تذکرہ صفحہ ۴۰۷)

" ذکر ہر حال میں کرنا چاہئیے۔ اگر لذت ملے تو نعمت ورنہ اداتے فرض کی نعمت تو بہر حال ہے۔

بہر حال بندہ یہ ہے بندگی. کرم ہے جو ذوق عبادت ملے . . . . .

. . . . کیا دوا کے استعمال سے غرض طلبِ صحت ہے یا لذّتِ کام و دہن؟ اگر یہ میسر آجائے تو فبہا۔ ورنہ دوا سے انکار تو نہیں کیا جائے گا (تذکرہ صفحہ ۴۳۳، صفحہ ۴۳۴)

" یہ احوال پیش آتے رہتے ہیں. مگر کیفیات قائم نہیں رہتیں، جیسے کوئی ہر وقت ہنستا، روتا، یا غصہ میں نہیں رہ سکتا۔ مگر طاعت میں علی کل حال لگا رہنا چاہئیے۔ اس سے کبھی غفلت نہ ہو۔ بلکہ لطف وکیفیت کے نہ ہونے پر بھی جو عبادت کی جاتی ہے۔ اس میں مجاہدہ کا ثواب زیادہ ہے کہ بندہ باوجود حظّ ولذّت سے محرومی کے کام میں لگا ہے۔ غلام کو خواہ آقا کی خدمت میں لذّت آئے یا نہ آئے خدمت میں لگا رہنا ہی ہے۔ ورنہ وہ آقا کی راحت کا نہیں بلکہ اپنی لذت کا طالب ہے۔ جو شرطِ وفا کے خلاف ہے۔ غرض اس راہ میں قبض یا بسط جو کچھ پیش آئے اس پہ راضی رہنا چاہئیے۔ آقا کی مرضی وہ جس حال میں رکھے۔"

سالکین کے لئے اس اقتباس کا ایک ایک حرف حرزِ جان بنانے کے لائق ہے کہ لذّت طلبی کے بارے میں حقائق کی عجیب عقدہ کشائی فرمادی ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

حضرت الشیخ قدس سرہ کے ان ارشادات سے لذّت کی غیر مقصودیّت واضح اور

میسر ہو جاتی ہے تاہم اگر لذت بے طلب خود سے میسر آئے تو اللہ تعالےٰ کی نعمت محمود اور قابل شکر ہے. چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں.

"حصول لذت محمود ہے مگر مقصود نہیں اس کے درپے نہ ہونا چاہیئے. وہ خود سے آئے گی ..... (ایسی) حلاوت ایمان ذکر کی کثرت اور اطاعت الہٰی کی مداومت سے حاصل ہوتی ہے."

......"یہ لذت و فرحت مبارک ہے جو گو بالذات مقصود نہیں لیکن محمود ہے. فالحمدللہ. اس پر خدا کا شکر ادا کیجئے. یہ بڑی نعمت ہے".

ان مباحث سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ لذت و ذوق وشوق کو قربِ الہٰی میں بالذات کوئی دخل نہیں. اس لئے ذکر و عبادات کو لطف ولذت وغیرہ کے جذبات سے خالی ہو کر صرف رضائے الہٰی کے لئے کرنا چاہیئے کہ خلوت خانہ دل میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہونا چاہیئے لذت تو صرف اس میں ہے کہ صرف اس کے لئے اس میں شاغل ہو کر اسی کے جلوؤں سے لطف اندوز ہو اور اس کی رضا و عطا پر سب کچھ قربان کرے. لذت ملی تو کیا نہ ملی تو کیا ے

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از غیر او تمنائے،

استغراق دلیلِ قرب نہیں

بعض حضرات حبِّ الٰہی اور عبادات میں مدہوشی و استغراق کو علامتِ کمال اور دلیل قرب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بقولِ امام الطریقہ حضرت تھانوی قدس سرّہٗ "اللہ تعالےٰ کا نام ہوش بڑھانے کے لئے لیا جاتا ہے نہ کہ ہوش کھونے کے لئے"۔

ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالےٰ اتباعِ احکام اور سیر سلوک کی جملہ منازل میں ہوشیاری و بیداری، تیقظ و ہوش کو باعثِ ترقی اور دلیل کمال سمجھتے تھے اور نری بے خبری و دیوانہ پن، استغراق و انہماک کو نہ تو نشانِ قرب قرار دیتے تھے نہ تو مفید طریق نہ ذریعہ ترقی روحانی،

چنانچہ ایک خادم کو لکھتے ہیں۔

"باقی جو آپ کی تمنا ہے کہ آپ کو عشقِ الٰہی اور عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ملے اور اس میں استغراق ہو جائے تو جہاں تک تمنا کا تعلق ہے۔ مناسب ہے لیکن یہ سمجھنا کہ آپ کو عشق الٰہی اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حاصل نہیں۔ صحیح نہیں۔ ہر مومن کو اس کا مرتبہ کچھ نہ کچھ حاصل ہے۔ اور آپ کی یہ صورتِ تمنا اس کی دلیل ہے۔ البتہ اس میں ترقی اعمالِ خیر میں ترقی ہی سے ممکن ہے۔ جس قدر اعمال میں ترقی ہو گی۔ اور محبوب حقیقی کے احکام کی تعمیل میں ترقی ہو گی۔ اس قدر اس مرتبہ میں ترقی ہو گی۔ انشاء اللہ تعالےٰ، باقی استغراق و انہماک کی طلب تو یہ ناسمجھی سے ہے۔ استغراق و انہماک کمال نہیں ہے۔ چنانچہ حضراتِ

انبیا علیہم السلام اور اُن کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے پاک تھے۔ آپ غور کریں۔ کہ کسی محبوب کے احکام کی تعمیل میں دیوانہ پن اور بے خبری دلیلِ کمال ہے یا ہشیاری اور بیداری کمال کی دلیل ہے۔ سنا ہے کہ انگریز سپاہی شراب میں مست ہو کر لڑتا ہے اور پٹھان پوری ہوشیاری اور بیداری سے بتائیے ان دونوں میں شجاعت اور بہادری کا اعلیٰ نمونہ کس میں ہے؟

ایک سالک نے لکھا:" ذکر کے وقت اکثر " حضور" حاصل نہیں ہوتا ..... گو ذکر کے ناغہ پر بے چینی رہتی ہے ..... پھر بھی اس کا رنج ضرور ہے کہ ذکر میں جو استغراق پیدا ہونا چاہیئے بالکل حاصل نہیں" (ملخصاً)

حضرت الشیخ قدس سرہ نے جواباً ارقام فرمایا۔

" ابھی تک آپ کی سمجھ میں ذکر کی حقیقت نہیں آئی، اس سے مقصود محبت الٰہی کی ترقی ہے۔" استغراق" اور" حضور" دو (الگ الگ) چیزیں ہیں" استغراق" تو اس کا نام ہے کہ انسان کا شعور باطل ہو جائے، بوجہ شدتِ انہماک کے یہ مطلوب و ممدوح نہیں۔ البتہ " حضور" مطلوب و ممدوح ہے۔ وہ اس کا نام ہے کہ فی الجملہ ذکر میں مذکور یعنی اللہ تعالےٰ کا استحضار ہو یا قلب کی طرف توجہ یا خود ذکر کی طرف دھیان ہو۔ ان میں سے جو بات جس وقت اور جتنی بھی حاصل ہو جائے وہ شکر کے قابل ہے کیونکہ وہ عطائے الٰہی ہے اختیاری نہیں۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہو گیا ہے کہ استغراق و بے خبری مطلوب و دلیل قرب و کمال نہیں۔ اس لئے اس کے درپے نہ ہونا چاہیئے اور جملہ اعمال کو شریعت مطہرہ کے احکام (ظاہری و باطنی) کے مطابق پورے ہوش و توجہ سے بجالانا چاہیئے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا ملفوظ ہے۔

"کیفیات وجذبات اور جوش پر عقل کو غالب کرنا اور عقل پر حکمِ شرع کو غالب کرنا اصل دین ہے"

قربِ ربّانی اور اختیاری وغیر اختیاری امور

انسان اختیاری امور کا مکلّف ہے اور اسے غیر اختیاری امور و اعمال کی تکلیف نہیں دی گئی۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ربانی ہے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا — خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (البقرۃ ـ ۴۰) (حکم) نہیں دیتا۔

دوسرے مقام پر ہے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا مَا اٰتٰھَا ط — اللہ تعالیٰ کسی پر اس سے زیادہ بار نہیں ڈالتا (الطلاق ـ ۱) جتنا اسے دیا ہے۔

یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ — اور (اللہ تعالیٰ نے) تمہارے لئے دین میں (حج ـ ۱) کوئی تنگی نہیں رکھی۔

بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت انسانوں کے لئے آسانی چاہتا ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ — خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں (بقرہ ـ ۲۳)

اس قسم کی آیتوں کی مزید وضاحت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی سے ہو جاتی ہے۔

فرمایا :-

اِنَّ ھذا الدین یسرولن یشادّ الدین احدٌ الّا غلبہ (کنزالاعمال بحوالہ بخاری ونسائی ج۲ ص۹ - سیرۃ النبی بحوالہ جمع الفوائد ج۶ ص۳۵)	یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا۔ تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔

اور فرمایا :-

لا تشدّدوا علی انفسکم فیشدّ علیکم فان قوماً شددوا علی انفسھم فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھم فی الصوامع والدّیارات رَھْبَانِیَّۃَ ابْتَدَعُوھَا مَا کَتَبْنَا عَلَیْھِمْ (کنزالعمال ج۲ ص۹ بحوالہ ابوداؤد)	اپنی جانوں کے اوپر سختی نہ کرو کہ تم پر سختی کی جائے۔ پس ایک قوم نے اپنی جانوں پر (دین) کے بارے میں سختی کی پس اللہ تعالیٰ نے ان پر (ان کی زیادتی کی وجہ سے) سختی کی پس یہ کلیساؤں اور کنیساؤں میں اپنی (دین میں تشدد کرنے والوں کے) بچے ہوئے افراد ہیں (جنہوں نے بزعم خود خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بقول قرآن پاک) رہبانیت کو اپنے لئے (خود) ایجاد کر لیا تھا اور ہم نے اسے ان پر واجب نہیں کیا تھا

ایک اور روایت میں ہے۔

یا ایھا النّاس علیکم من الاعمال ما تطیقون فان اللہ لا یملّ حتّیٰ تملّوا (کنزالعمال ج۲ ص۹ بحوالہ صحیح بخاری وصحیح مسلم)	اے لوگو! اعمال میں اتنے ہی کاموں کو اختیار کرو جتنا برداشت کر سکو۔ کیونکہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا۔

اس مفہوم کی متعدد روایات کتب حدیث میں نقل کی گئی ہیں (دیکھئے کنز العمال ج ۲۶ ص ۱۲۰۵ و سیرۃ النبی ج ۵ ص ۴۳، ۴۴)

ان نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو صرف انہیں اعمال کا مکلف بنایا گیا ہے جو اس کے اختیار وطاقت میں ہیں اسے تکلیف مالایطاق نہیں دی گئی اور نہ اس پر غیر اختیاری امور کا بار ڈالا گیا ہے۔ اسی سبب سے تمام "احکام الٰہیہ" اور جملہ "اوامر شرعیہ" انسانی استطاعت واختیار" اور "بنی آدم کی فطری وسعت وقوت" کے مطابق مشروع کئے گئے ہیں اور ہر شخص سے ان احکام کی بجاآوری کا مطالبہ اس کی "شرعی" استطاعت ووسعت کے بقدر ہے۔ اس لئے اسلامی سلوک کی جملہ گھاٹیاں اور قرب ربانی کی جملہ منازل صرف مامور بہا اختیاری امور پر عمل کرنے سے طے ہوتی ہیں۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اس راہ میں غیر اختیاری اعمال مقصود نہیں اس لئے ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے اپنی پوری ہمت وعزیمت سے اختیاری اعمال میں محنت وکوشش کرنا ہی کلید کامیابی ہے کہ طریق میں مامور بہا اختیاری احکام و اعمال میں تساھل وسہل انگاری کی گنجائش و اجازت نہیں۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں۔

"آپ اپنی طرف سے امور اختیاری میں تساہل نہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو ہماری راہ میں محنت کرے گا۔ ہم اس کو راہ دکھائیں گے ...... یہ راہ ہمت وعزیمت کے بغیر طے نہیں ہوتی۔ اسی کا نام مجاہدہ ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔ اللہ کی راہ میں پورا پورا مجاہدہ کرو۔

مجاہدہ یہی ہے کہ نفس کی باطل خواہشوں سے اعراض برت کر مقصدِ حق کو پورا

کیا جائے اور اسی پر دین و دنیا دونوں کی کامیابی کا انحصار ہے۔

ایک دوسرے سالک کو لکھتے ہیں:۔

"ایک اصول نہایت اہم سمجھ لیجئے۔ امورِ اختیاریہ میں بندہ کمی نہ کرے اور امورِ غیر اختیاریہ کے درپے نہ ہو۔۔۔۔۔ تمنا ہو تو صاحبِ تمنا کے پیش کیا کیجئے، وہ جو چاہیں گے اور جب چاہیں گے دیں گے اور اگر مدت تک بھی نہ ملے تو اس کے لئے تشویش نہ کیجئے ع

کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند"

۔۔۔۔۔۔۔ پراگندگیٔ خاطر کی کوئی بات نہیں اعمال سب معلوم ہے۔ ضرورت عمل کی ہے اور حصول تقویٰ اور رضائے الٰہی کی، ساری کوشش اسی کی چاہیئے، باقی سب فلسفہ ہے"

اس سے معلوم ہوا کہ مقصود صرف اختیاری اعمال صالحہ ہیں اور وہ جملہ امور جو انسان کی استطاعت و وسعت سے باہر ہیں یا اس کے دائرہ اختیار میں نہیں۔ انسان ان کا قطعاً مکلف نہیں، نہ وہ مقصود ہیں نہ ان کے درپے ہونا مفید و معین سلوک ہے یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ جملہ کیفیات و احوال، مواجید و مکاشفات، رویا و ندا، وغیرہ اعمال کے ثمرات عاجلہ ہیں جو انسانی دائرہ اختیار سے خارج اور جو محض عطائے رب ہیں، اس لئے یہ غیر اختیاری امور محمود تو ضرور ہیں لیکن مقصود ہرگز نہیں اور نہ ان پر رضائے الٰہی اور قربِ ربانی کا مدار و انحصار ہے اس لئے سالکین کو ابتدا ہی میں اچھی طرح یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اس قسم کے غیر اختیاری امور کے درپے ہونا رہزنِ طریق ہے پس امور اختیاری میں کمی نہ کی جائے اور غیر اختیاری امور کو نہ مقصد گردانا جائے نہ اس کے درپے ہوا جائے مقصود صرف عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ ہیں باقی تمام چیزیں ان کے نتائج و ثمراتِ عاجلہ ہیں

مربیِ حقیقی کی حکمتِ بالغہ جب اور جیسا مناسب سمجھتی ہے - ان نتائج و ثمرات کو مرتب فرماتی ہے ، کہ بقول حضرت سیدی قدس سرہ احوال قلبیہ گو غیر اختیاری ہیں ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے بھی قواعد مبنی بر حکمت رکھے ہیں ۔ اس لئے جب ان قواعد کی پابندی کی جاتی ہے تو عادتاً حکمت ربانی طالب کے مناسب احوال و کوائف کا ترتب فرمادیتی ہے ۔

تاہم اعمال و طاعات پر ان احوال و ثمرات کا ترتب اگر عمر بھر بھی نہ ہو اور سالک اخلاصِ تام کے ساتھ مرضیاتِ حق میں مشغول ہو ، تو اس کی ترقی روحانی میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوگی کہ رضاء و قرب ربانی کے حصول میں ان آثار کا عدم ظہور قطعاً حارج نہیں ۔ بلکہ ممکن ہے کہ ثمرات عاجلہ کا انتفاء مجاہدہ کی زیادت کی وجہ سے مزید ترقی کا سبب ہو ۔ اس لئے سالک کو ان چیزوں کے فقدان پر رنجیدہ و پریشان نہیں ہونا چاہیئے کہ مربی حقیقی کا معاملہ سالکین کے ساتھ انتہائی حکمت و شفقت پر مبنی ہے اس کا ہر تصرف عین لطف و عطا ہے اس لئے اختیاری امور کی بکمال عزیمت و اخلاص پابندی اور "غیر اختیاری" امور میں تفویض و سپردگی ہی ذریعہ قرب و رضا ہے کہ ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ ہرکہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

بہرحال اختیاری و غیر اختیاری امور میں تمیز اور اختیاری امور کا بکمال ہمت و اخلاص اختیار اور غیر اختیاری امور کا ترک (بقول مرشد تھانوی ؒ) نصف سلوک ہے " بلکہ اس عظیم اصول کا کامل ادراک و تتبع اور اس پر کمال عزیمت و اخلاص سے عمل پورے سلوک کا خلاصہ ہے جس سے جملہ مراحل و منازل بفضلہ تعالیٰ طے ہو جاتے ہیں اور طالب "کشاکش ہائے

رنگارنگ سے چھوٹ کر سلوک کی سیدھی اور مسنون راہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور رضائے الٰہی کی دولت سے ہمکنار ہو جاتا ہے کہ سالک کا کام تو صرف اخلاص کے ساتھ سنت نبویؐ کے مطابق سعی و محنت ہے۔ منزل تک رسائی تو محض اللہ تعالیٰ کے فضل کا کرشمہ ہے۔

ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا ملفوظ ہے۔ "ہم تو صرف طلب و کوشش کے مکلف ہیں۔ وصول کے مکلف نہیں"! سالک کے لئے امور اختیاریہ میں ہمت کرکے اپنی پوری سعی و کوشش کر لینا ہی کافی ہے۔ طالب صادق کو رحمت الٰہی کبھی محروم نہیں رکھتی کہ طریق کا ہر درست قدم راہ بھی ہے اور منزل بھی، ذریعہ بھی ہے اور مقصد بھی کہ بکمال اخلاص سنت نبویہ کے مطابق جو قدم بھی اٹھایا جائے گا۔ وہ رضائے رب کا مورد، اور قرب الٰہی کا سبب ہوگا۔ اس طرح اس راہ کا ہر قدم 'وصول' کا حکم رکھے گا۔ کہ مقصودِ طریق رضائے دوست ہے۔ دگر ہیچ،

غرض طلب و کوشش اور اختیاری امور کا اہتمام شرطِ وصول ہے۔ رحمت و فضل الٰہی اس کا ثمرہ جب چاہے گا مرتب فرما دے گا ؎

آ ہی جائیگا کبھی اُس تک بھی ساقی دورِ جام
منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تیری محفل میں ہے

اختیاری و غیر اختیاری امور میں تمیز، مقصودہ و غیر مقصودہ اعمال میں امتیاز، مقاصد و ذرائع میں تفریق طریق کا بنیادی پتھر ہے۔ ان چیزوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے طالب سلوک کی گھاٹیوں میں بھٹک کر رہ جاتا ہے اور سلوک کی صاف اور سیدھی نبویؐ شاہراہ پا نہیں سکتا۔ اس لئے محقق اور صاحب بصیرت مشائخ طالب کو اس راہ کے جملہ "مراحل و عقبات"

اور نزاکتوں سے آگاہ کرتے رہتے ہیں اور اس پر خطر اور نازک راہ کو گلکدۂ جنت کی سیر بنا دیتے ہیں کہ ع

ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

ہمارے حضرت والا قدس سرہ اس راہ کے دقیقہ رس و مبصر راہی و رہنما تھے۔ چنانچہ اپنے مسترشدین کو ہر ہر قدم پر ان حقائق سے آگاہ فرماتے رہتے تھے۔ حضرت الشیخؒ کے تربیتی مکتوبات اس پر شاہد عدل ہیں ایک مسترشد نے شکایت کی کہ "نماز میں وہ سرور و کیفیت نہیں پائی جاتی جو پہلے حاصل تھی ..... یکسوئی سے بھی (باوجود کوشش کے) محروم رہتا ہوں" محقق شیخؒ نے جواباً ارقام فرمایا۔

" اس راہ میں ایسا ہوتا رہتا ہے اس کی کچھ فکر نہ کیجئے، یہ سرور و لذت ہمارے آپ کے اختیار کی چیز نہیں اور جو امور اختیاری نہیں اُن کے درپے نہ ہوئیے، ارتکاب معصیت، صحبت ناجنس اور غفلت نہ ہو، اس کا علاج استغفار کی کثرت ہے اور بہت نافع ہے" (تذکرہ ص۲۸۲)

ایک دوسرے مکتوب میں اسی سالک کو لکھتے ہیں۔

" نماز میں دل لگنا یا نہ لگنا اپنے اختیار کی بات نہیں۔ اور جو چیز بندہ کی اختیاری نہیں وہ اس کا مامور بھی نہیں۔ بندہ پر اپنی طرف سے دل لگانے کی کوشش ہے جو اختیاری ہے جس طرح مریض کا کام دوا پینا ہے جو اس کے اختیار میں ہے۔ شفا کا حصول نہیں جو اس کے اختیار سے باہر ہے۔ نماز میں استحضار اور خشوع و خضوع کے لئے کوشش چاہیئے اور اس کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ معانی ادعیہ و سورِ قرآنی جو پڑھے ان پر نظر رہے اور ہر لفظ ارادہ سے نکلے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بتوجہ کثرت ذکر کا اہتمام رہے، اس سے انشاء اللہ مطلوب حاصل ہوگا۔ یعنی یہ نسخہ ہے جس سے شفا کی امید ہے۔ مگر شفا کا ہوجانا یہ

اللہ تعالیٰ کے اختیار اور بخشش کی بات ہے۔ مگر جس طرح عادت الٰہی جاری ہے کہ عموماً صحیح نسخہ کے استعمال کے بعد وہ شفا عنایت فرماتے ہیں۔ ایسے ہی اس طریقہ سے نماز میں استحضار و خشوع بفضلہٖ حاصل ہو جاتا ہے اور اگر کوشش کے بعد بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ محرومی انشاء اللہ مضر نہیں، طمانیت رکھیں، " لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (تذکرہ ۲۹۴)

ایک دوسرے گرامی نامہ میں انہیں تحریر فرماتے ہیں

" لطف مطلوب نہیں۔ اگر دل نہ چاہے اور پھر عبادت کی جائے تو مجاھدہ کا مزید ثواب ہے۔ لطف اختیاری چیز نہیں اور غیر اختیاری چیزیں عطیہ الٰہی ہیں ...... (سجدہ میں لطف کی) یہ کیفیت محمود ہے مگر اس میں کوئی قرب نہیں۔ قرب اطاعتِ محض میں ہے (تذکرہ صفحہ ۳۴۳)

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان صرف اختیاری امور کا مکلف ہے اور یہی اختیاری طاعات و اعمال انسان کے لئے قرب ربانی کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ غیر اختیاری اعمال گو محمود ہیں مگر مقصود نہیں اس لئے ان کا قرب میں کوئی دخل نہیں۔ پس سالک کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اختیاری اعمال میں کوتاہی نہ کرے غیر اختیاری امور و احوال و کیفیات کے درپے نہ ہو۔ حکمت ربانی جس وقت جس چیز سے نوازے اسی کو عین حکمت اور عطائے رب سمجھے۔ اگر ان چند باتوں کا اہتمام رہے تو سلوک کے بارے میں بیشمار الجھنوں سے خلاصی میسر آ سکتی ہے۔ اور سلوک کی راہ بکمالِ آسانی کے ساتھ طے ہو سکتی ہے۔

پانچواں باب

معمولاتِ سلوک

ذکر و تہجد و نوافل و تلاوتِ قرآن وغیرہ

طریقِ محبت کے راہی چونکہ حجلہ نشینِ ازل کے شیدائی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سوختہ سامانوں کا زادِ راہ یادِ حبیب اور توشہ درد و سوز ہوتا ہے۔ محبوب کی یاد میں ہر دم مگن، اس کے نام سے ان کی زبانیں تر، اس کے دھیان سے ان کے قلوب شاداں اور روحیں منور ہوتی ہیں۔ منشائے حبیب پر وہ جانیں قربان کرتے ہیں اور اس کے اشاروں پر ان کی ہر حرکت موقوف ہوتی ہے۔ ان کی زندگی میں اس کے اوامر سے ہی جان آتی ہے اور اس کے مشاہدہ سے ہی وہ قرار پاتے ہیں اس لئے ان محبینِ صادقین کی راہ پر جو گامزن ہونا چاہے اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ ان کا طریق اختیار کرے یادِ الٰہی سے اپنا ہر سانس اور قیام و سجود سے اپنی ہر رات زندہ رکھے۔ عبدیتِ کاملہ اس کا مشغلہ ہو، اور فنائے تام اس کا حال، کہ الٰہی رنگ بندگی کے کمال سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ میں اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

عبدیت کے فرائض و واجبات کی ہر حال میں ادائیگی اور سننِ نبویہ و مستحبات دینیہ کی پابندی و استقامت اور آخری سانس تک انہیں فضائل و مزایا کے حصول کی تگ و دو ان کی زندگی کا حاصل ہوتا ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق خود راہ ہست وہم منزل است

معمولات

دینی معمولات کا اہتمام اوران کی پابندی سالک کے لئے ترقیات کا زینہ، کامیابی کا ذریعہ، حصول مقصد کی کلید اور قطعِ منازل کا کامیاب وسیلہ ہے۔ سلوک کے جملہ احوال ومقامات حقیقتاً مامور بہ اعمال کا ثمرہ اور معمولاتِ شرعیہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ "معمولات" و اعمال اصلاً وہ شجرۂ طیبہ ہے جس کے برگ وبار کواٗئف ومعارفِ سلوک ہیں۔ موجودہ دنیا میں "حیات طیبہ" اور قرب ورضا" اس کا پھل اور آخرت میں جنت ورضوان اور انعامات خاصہ اس کا ثمر ہوگا۔ آخری سانس تک معمولات اور اعمال صالحہ کے اشتغال و استقامت کے اس پاکیزہ درخت کی آبیاری ہوتی رہتی ہے اور ہر عالم میں اس عالم کے مطابق اس کے پھل اور ثمرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ تُؤْتِیْ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔ حضرت سید الملۃ نوراللہ مرقدہ دینی معمولات کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہمیشہ طالبین کو معمولات کے اہتمام وپابندی کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ مختلف سالکین کو اس بارے میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو ارشادات رقم فرمائے ہیں وہ ہر راہی طریق کے لئے سرمہ بینش اور دلیل راہ ہیں۔

مختلف مکتوبات میں طالبین کو ہدایت فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:۔

"معمولات پر استقامت ضروری ہے اگر کسی عذر شرعی سے ناغہ ہوجائے تو حرج نہیں، مگر جیسے ہی موقع ملے، پھر اپنے کام میں لگ جانا چاہئے۔

"معمولات پر استقامت اور اپنی اصلاح کی فکر میں لگے رہنا کامیابی کی بڑی دلیل ہے.... مواعظ وملفوظات کے مطالعہ کی مداومت ہر مرض کے لئے اکسیر ہے اور

روحانی ترقی کی کامیاب تدبیر"

"استقامت اور مداومت حصول مقصد کا سب سے کارگر ذریعہ ہے"

"معمولات میں رخنہ پڑنا ترک ہونے کی تمہید ہے۔ اگر حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ کے رسائل روزانہ مطالعہ میں رہتے تو یہ کیفیت نہ ہوتی، نماز، نوافل، ذکر، تلاوت اور اخلاق و معاملات کی نگرانی یہ چند امور ہیں۔ جو لحاظ کے قابل ہیں ان پر نظر رہے تو روح مفلوج نہ ہوگی ...." "ہمیشہ کے لئے یہی نصیحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ تہجد اور ذکر کا اہتمام رہے۔ حضرت والاؒ کی تصانیف کا مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ ہر بے راہ روی سے آپ کو بچائے گا اور آپ کے قلب کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ رکھے گا:

"امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے اور اپنے معمولات کی بجا آوری میں مصروف ہوں گے .... معمولات میں اتفاقی کوتاہی کا تو کچھ حرج نہیں، مگر مسلسل کوتاہی قلبی احوال کے تنزل کا ذریعہ ہوتا ہے اور پھر وہ دوری بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ محرومی تک پہنچا دیتی ہے یہ راہ ہمت اور عزیمت کے بغیر طے نہیں ہوتی، اسی کا نام مجاہدہ ہے" وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ۔ اللہ کی راہ میں پورا پورا مجاہدہ کرو۔ مجاہدہ یہی ہے کہ نفس کی باطل خواہشوں سے اعراض برت کر مقصدِ حق کو پورا کیا جائے اور اسی پر دین و دنیا دونوں کی کامیابی منحصر ہے۔"

"آپ کے حالات سے واقف ہو کر اور معمولات کی پابندی کی خبر سے خوشی ہوئی... آپکے عراق جانے سے آپکے متعلق خطرہ تھا کہ آپ ماحول سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشنے والے اور محافظ ہیں .... بڑی نعمت اس دنیا سے ایمان

دعملِ صالح کے ساتھ رخصت ہونی ہے جس کا نام حسنِ خاتمہ ہے .... انسان کو ہر حال میں اپنے سے چوکنا رہنا چاہیئے. کہ اس کا نفس اس کو فریب میں مبتلا نہ کرے معاملات میں ہمیشہ صفائی اور ایمانداری اور سچائی پیشِ نظر رکھے"

" امید ہے کہ اب آپ اپنے معمولات پر قادر ہو گئے ہوں گے. سب سے بڑی چیز فرائض کے بعد اخلاقِ رذیلہ سے نجات حاصل کرنا ہے، جس کے لئے دعا کے علاوہ کوشش کرنا بھی ہے .... اللہ تعالیٰ آپ کی باطنی حالت کو آراستہ کرے اور باطنی احوال میں ترقی عنایت فرمائے ہر بات میں اور ہر حال میں رضائے مولیٰ پر نظر رہے"

" بحمداللہ کوئی شکایت کے قابل تبدیلی نہیں ہوئی. معمولات قائم رہیں، اور منہیات سے احتراز رہے. پھر عارضی قلت مضر نہیں .... تعلیم کے مشغلہ کی نسبت یہ خیال کریں. کہ یہ حصولِ رزق کی کوشش ہے اس نسبت سے یہ تعلیمی جد و جہد بھی عبادت ہی میں شمار ہوگی. بایں ہمہ اوقات نماز و نوافل و ذکر کو قائم رکھیں .... انشاءاللہ تعالیٰ یہ (دوامِ ذکر کی) نعمت آپ کو حاصل رہے گی"

چند مبتدی طالبین کو تحریر فرماتے ہیں.

اپنے حالات کی درستی اور معمولات کی پابندی میں لگے رہیئے. اور غیر ضروری افکار و خیالات کو دل سے نکال دیجئے. وقت کی پابندی کے بغیر معمولات

" معمولات کی تکمیل کی کوشش میں لگے رہیئے.

ناغہ ہوتے ہیں. اس لئے وقت کی پابندی کی ضرورت ہے (ذکر) رات کو نہ ہو سکے ظہر کے بعد بھی، تہجد میں اٹھنا نہ ہو سکے، تو اس کی دو تدبیریں ہیں، ایک یہ ہے کہ عشاء کی نماز و سنت پڑھنے کے بعد لیکن وتر سے پہلے دو دو رکعت کر کے چند رکعتیں صلوٰۃ اللیل

کی نیت سے پڑھ لیں، پھر وتر پڑھیں، دوسری یہ کہ اشراق و چاشت کے وقت تہجد کی قضا پڑھیں"

"معمولات کی ادائیگی اور تہجد کی پابندی ہو جاتی ہے تو بڑی بات ہے"۔

ایک طالب کی معمولات کی عدم پابندی پر ارشاد فرمایا۔

"یہ (جماعت سے نماز کا نہ ہونا اور معمولات میں کوتاہی وغیرہ) امور کیوں پیش آئے صرف اپنی سستی کے سبب سے ایسا نہ کیجئے۔ معمولات تو رات یا صبح کو انجام پاتے ہیں وہ کام کے اوقات نہیں ..... معمولات نماز و تلاوت و دعا میں سستی نہ کریں ..... نفع کے لئے (معمولات پر) مداومت شرط ہے۔ اگر کسی عذر شرعی سے ناغہ ہو جائے تو کچھ حرج نہیں۔ مگر اہتمام یہ ہو کہ ناغہ نہ ہونے پائے۔

"(معمولات کی پابندی کے لئے) ہمت کیجئے۔ ہمت سے دین اور دنیا دونوں کے کام ہوتے ہیں .... ان امور (یعنی معمولات) کا فائدہ نفس کی اصلاح اور قلبی ترقی ہے کیفیات پر نظر نہ رکھنی چاہیئے۔ یہ اعمال مثل دوا کے ہیں۔ دوا اگر خوش مزہ نہ بھی ہو اور جی بھی اس کے کھانے کو نہ چاہتا ہو اور پھر بھی کھاتے رہیں تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کا فائدہ ضرور ہوگا"

ایک طالب نے لکھا: "کبھی کبھی دن رات میں شیطانی و نفسانی خیالات کا غلبہ محسوس ہوتا ہے اس وقت یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جب یہ چیزیں خیالات کو مکدر کر دیتی ہیں تو اپنی نماز و ذکر و تلاوت وغیرہ معمولات کا کیا فائدہ"۔

حضرت الشیخ قدس سرہ نے حکیمانہ انداز میں ارشاد فرمایا۔

"تقاضائے طبیعت کو تو مٹایا نہیں جا سکتا۔ البتہ اس کے اقتضا پر عمل نہ کیا

جائے۔ یہی مجاہدہ ہے اور اسی کا ثواب ہے۔ تقاضائے طبیعت کے ظہور سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تقاضا نہ ہو پھر گناہ سے بچنا کیا مشکل ہے۔ پھر انسان بھی دیوار کی طرح ہے اگر اس میں کوئی تقاضا نہیں تو پھر اس کے لئے یہ کمال بھی نہیں۔"

ایک طالب کی معمولات میں کوتاہی پر تحریر فرمایا:۔

"یہ حالت تو سخت قابلِ اصلاح ہے اور عزمیت کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں اس حالت سے مرض شروع ہوتا ہے اس لئے آپ کو سخت تنبیہہ کی ضرورت ہے۔"

انہی کو ایک دوسرے خط میں لکھا۔

"معمولات میں کوتاہی اگر کسی عذر کے سبب ہے ہو تو خیر، ورنہ بظاہر اس کمی کا سبب تو اپنے ارادہ اور عزمیت کو کام میں نہ لانا ہے۔ پھر ندامت کس سے ہے۔ مجھ سے تو ہو نہیں سکتی کہ میرے کام میں تو قصور ہوا نہیں، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ندامت ہے۔ مگر ایسی ندامت جس کے ساتھ آئندہ کی عزمیت نہ ہو بیکار ہے اور رسمی ہے۔ ضروری اشغال میں غفلت کا علاج وقتاً فوقتاً قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول کر لینا ہے"

سفر میں معمولات کے بارے میں ارشاد فرمایا:۔

"ضرورۃً سفر درپیش ہونے میں حرج نہیں حتی الوسع معمولات کا اہتمام چاہیئے"

ایک طالب نے لکھا" "سفر میں معمولات وغیرہ چھوٹ جاتے ہیں۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالےٰ نے تنبیہہ فرمائی "معمولات تو خیر، فرائض میں تو سستی نہ کی جائے اس لئے بضرورت سفر کیا جائے"

معمولات پر استقامت

دوسرے مکتوبات میں ارقام فرماتے ہیں۔

"طبیعت کی افسردگی کا اثر معمولات پر نہ پڑنے

افسردگی و خوش طبعی کا نشیب و فراز تو دنیا میں ہوتا ہی رہتا ہے اس کی فکر نہ کریں۔

"مبارک کہ معمولات پر پابندی سفر میں نصیب ہو رہی ہے۔ سب کچھ ہو نتیجہ اچھا ہے"

"آپ کے حالات معلوم کر کے خوشی ہوئی اس پر قائم رہئیے۔ استقامت اس میں بڑی چیز ہے اس کی دعا مانگئے کہ اس پر حسن خاتمہ ہو" (تذکرہ سلیمان ص ۵۹۹-۶۰۰)

"یہ معمولات کافی ہیں۔ کسی معمول کو نہ کرنا یعنی اپنے معمول میں داخل نہ کرنا اتنا برا نہیں ہے جتنا اس کو معمول مان کر اس سے غفلت کرنا" (تذکرہ ص ۶۰۲)

"آپ کے معمولات اور احوال کو معلوم کر کے خوشی ہوئی۔ اسی طرح چلے چلئے ؎

چلا چل تو منزل بہ منزل یوں ہی

ٹھہرنے کی منزل ابھی دور ہے"

"معمولات کی پابندی استقامت کی دلیل ہے۔ اس کے آثار اعمال، معاملات اور اخلاق میں نمایاں ہونے چاہئیں .... کیفیات و احوال کی طرف توجہ نہ کیجئے اور صرف حسن عمل اور کثرتِ ذکر کی طرف توجہ رکھئے۔

"بحمد اللہ تعالے کہ آپ نے اپنے جو حالات پہلے لکھے تھے ان میں تبدیلی نہیں ہوئی معمولات پر پابند ہیں۔ ہر کام میں اللہ تعالے کی رضا جوئی پر نظر ہے"

"یہ کیا کم احسان ہے کہ معمولات پورے کرا دیئے جاتے ہیں۔ جائے شکر ہے"

"یہ نشیب و فراز اور تلوّن عالم کی ہر چیز میں ہے۔ انسان بھی اسی عالم میں ہے۔ اس سے گھبرانا نہ چاہئیے بلکہ اور زیادہ استقامت کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہنا چاہئیے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا اسی موقع کی ہے اس کو پڑھا کیجئے۔ یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک،

۔ بحمد اللہ کہ معمولات پورے ہوتے رہتے ہیں۔ تغیر و تبدل اور نشیب و فراز تو اس عالم کی ہر چیز میں ہے .... (آپ نے) طبیعت کے نشیب و فراز اور عدم استقلال کا جو حال لکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں اور سب کو اسی طرح پیش آتی ہے۔ اس کی فکر نہ کیجئے اور اپنے کام میں لگے رہیئے..... آپ کی استقامت و اصلاح احوال کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اصل معاملہ عمل کا ہے اس سے ترقی و تنزل کا اندازہ ہوتا ہے۔ معمولات (کی پابندی) اور احکام الٰہی کی اطاعت اور گناہ سے پرہیز ہی اصل چیز ہے۔"

.... اپنے کام میں تا آخر دم استقامت کے ساتھ لگے رہیئے۔ یہی بڑی دولت ہے"

" (آپ کو معمولات کی) استقامت پر مبارکباد دیتا ہوں، اب تو زندگی کے آخیر لمحہ تک یہ استقامت قائم رکھنا ہے۔ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ کی دعا چاہیئے ...... دھن کے ساتھ اپنا کام کئے جائیے۔ اور ظاہر و باطن کی تہذیب و درستی میں لگے رہیئے"

" (معمولات میں) جو کچھ ہو رہا ہے اس پر شکر کیجئے اور جو نہیں ہو رہا اس کے لئے ہمت کیجئے

" بارک اللہ تعالیٰ، (معمولات پر استقامت) بے شبہ شکر کا مقام ہے ...... اضطراری عذر کے سبب اگر کسی معمول میں کمی ہو جائے تو انشاء اللہ تعالےٰ ہمکو ہماری نیت کے مطابق حق تعالیٰ اس کی جزا عنایت فرمائیں گے۔ یہ اُن کی شان رحیمی و کریمی ہے .... الحمدللہ تعالیٰ کہ آپ اب اچھے ہیں۔ اگر دوران علالت میں معمولات بعذر ضعف و مرض انجام نہ پا سکے اور ارادہ یہی تھا کہ اگر یہ مانع نہ ہوتا تو آپ ضرور معمولات پورا کرتے تو انشاء اللہ تعالےٰ اس کا اجر بھی ملے گا۔"

" الحمدللہ کہ آپ معمولات کے پابند ہیں۔ اللہ تعالےٰ جلد منزلِ مقصود تک پہنچائے

"..... دوامِ عمل اور صحت فکر و نظر ہی کامیابی کی کنجی ہے"

"اس سے بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے معمولات جاری ہیں"

"اُمید ہے کہ آپ کے معمولات قائم و جاری ہوں گے اور اپنے نفس کے احتساب میں مصروف ہوں گے"

"آپ کا خط ملا، حالات معلوم ہوئے آپکے احوال پابندی معمول و استقامت علی الدین کو معلوم کرکے مسرت ہوئی اللّٰھم زد فزد"۔

"ایک طالب کے اظہار ارادت و عزم استقامت پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہ کیفیات محبت کے ہیں۔ اور محمود ہیں۔ اللہ تعالیٰ استقامت نصیب فرمائیں۔ کہ جو قدم صحیح سمت میں اٹھ چکے ہیں۔ وہ پھر اس وقت تک نہ رکیں۔ جب تک مرحلہ حیات ختم نہ ہو جائے، اسی کا نام حسنِ خاتمہ ہے جس کی تمنا اور دعا انبیاء علیہم السلام تک نے کی ہے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو مرتے وقت وصیت فرمائی۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ، حضرت یوسف علیہ السلام نے سلطنت کے کاروبار میں حصہ پانے کے بعد دعا کی۔ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ، یہ دعا حسن خاتمہ کے لئے پڑھنی چاہیئے۔ حضور صلعم فرماتے ہیں:۔ قُلْ رَبِّیَ اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقِمْ"

ایک سالک کو حضرت والا رحمہ اللہ تعالےٰ نے معمولات کے بارے میں جو ارشاد فرمایا ہے اس کی تفصیل افادہ کے لئے نقل کرتا ہوں۔

"آپ کسی وقت دو رکعت نفل باخلاص خضوع پڑھ کر استغفار کیجئے اور اسی وقت سے کام شروع کیجئے اور پوری توبہ گذشتہ تقصیروں پر کرکے آگے کے لئے اطاعتِ کامل کا

عزم کیجئے۔ اللہ تعالیٰ پورا فرمادیں گے۔ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔

۱:۔ نمازِ پنجگانہ کے علاوہ حسب ذیل نمازوں پر حتی الامکان مداومت کیجئے۔

نمازِ تہجد:۔ بعد مغرب ۶ رکعات نفل، طلوعِ آفتاب کے کچھ دیر بعد ۲ یا چار رکعات نفل۔ چاشت چار، نمازِ پنجگانہ کے بعد نوافل مسنونہ، نوافل اگر بعذر کبھی چھوٹ جائیں تو حرج نہیں۔

۲:۔ تمام منہیات سے توبہ کر کے ان سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

۳:۔ اس (اوامر و منہیات کے علم) کے لئے حضرت والا رحمہ اللہ علیہ کی اصلاح الرسوم اور بہشتی زیور مطالعہ کیجئے اور ان کے مطابق عمل کیجئے۔

۴:۔ تہجد کی نماز کے بعد درود کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں ہر شب بالحاح تمام اپنے لئے دعا کیجئے۔ دعا میں خضوع ہونا چاہیئے۔ عصر اور صبح کی نمازوں کے بعد بھی دعا خوب کیجئے اور مانگئے۔ جو آپ کے لئے مناسب ہو، انشاء اللہ ملے گا اس در سے کوئی محروم نہیں ہوا ہے۔

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ اُس کا اعلانِ عام ہے۔ الدعاء مخ العبادۃ

۵:۔ نماز میں اعتدال ارکان اور حضورِ قلب کی کوشش ہو۔

اب اس کے بعد اپنے احوال سے اطلاع دیتے رہیں۔۔۔۔ جس قدر مکاتبت کا سلسلہ رہے گا۔ انشاء اللہ نافع ہوگا۔ جو حال اس راہ میں ہو اُس سے اطلاع دیں۔ اس راہ میں ضرور ہے کہ مربی کے ہاتھ میں اس طرح دیدیں جس طرح مریض طبیب کے ہاتھ میں اپنے کو دیدیتا ہے

دوسرے مکتوب میں انہیں کو تحریر فرماتے ہیں:" اب ضرورت اس بات کی ہے کہ بعد فرائض وسنن ونوافل کی پابندی علی مراتب الوجوب والاستحباب کے منہیات شرعیہ سے احتراز کا لزوم کیا جائے اور ہمیشہ نظر اپنے احوال پر رہے اور جو عیب سب

سے زیادہ ابھرا ہوا علی العیان معلوم ہو۔ اس کے دفعیہ کی کوشش کیجئے۔ مثلاً کبر عجب، ریا، حسد وغیرہ، آپ اس عیب کی حقیقت پہلے دریافت کریں، اگر معلوم نہ ہو، اور پھر اس کا علاج دریافت کریں......

آپ کے لئے عالم مشغول کے اعمال کی تجویز تھی۔ اس سے آگے بڑھنے میں جلدی نہ کیجئے۔ اس (قصد السبیل) میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی تقلید کیجئے اس کتاب قصد السبیل کے آخر میں منہیات وامر کی تصریح ہے۔ وہ پیش نظر رہے۔ مقصود حصول تقویٰ ہے کہ قرآن پاک هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے۔ اور عبادت کا منشاء بجا آوری کے بعد حصولِ تقویٰ ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ"

ذکرِ الٰہی

ذکرِ حق پاک است چوں پاکی رسید
رخت بر بندد، بروں آید پلید
چوں درآید نام پاک اندر دہاں
نے پلیدی ماند و نے آں دہاں (رومیؒ)

بادۂ الست کے میگسار عشقِ الٰہی سے سرشار ہوتے ہیں۔
"قرب بے غیبت" ان کا حال اور "تصورِ جاناں" ان کا شعار ہوتا ہے ۔

قرب بے غیبت نماز عاشقاں
فی صلوٰۃٍ دائمون آرزوست ! (سید الملۃؒ)

"یادِ حبیب" سے ان کے دل پر انوار اور ان کی خلوت و جلوت عینِ بہار ہوتی ہے ان کے ظاہر و باطن کا نکھار اللہ تبارک و تعالیٰ کے دائمی دھیان و استغفار سے ہوتا ہے۔ حبِّ الٰہی کی طرح "یادِ حق" ان کے ریشے ریشے میں سرایت کر جاتی ہے ۔ ان کا ہر بُنِ مو "آوازِ دوست" سے پر شور ہو جاتا ہے اور ہر رگِ جان ذکر کی دلنواز صدا بن جاتی ہے۔ تہلیل و تسبیح ان کا مشغلہ، حمد و ثنا ان کا معمول اور ہمہ وقت دھیان الٰہی ان کا شیوہ ہوتا ہے ۔ وہ اس عالم میں "یادِ الٰہی" کے "زندہ نشاں" اور ذکرِ الٰہی

کی ایسی حجابیاں ہوتی ہیں۔ جن کے دیکھنے سے غفلت کے قفل کھل جاتے ہیں۔ غافلوں تک کو بے اختیار اللہ تبارک و تعالیٰ یاد آجاتے ہیں۔ حُبِّ الٰہی کا غلبہ انہیں ہر آن حق تعالےٰ جلّ شانہ میں شاغل رکھتا ہے اور "یادِ محبوب" کا دوام ان کے دلوں کو غیر سے فارغ کر دیتا ہے کہ جب ذکر کی حقیقت قلوب پر چھا جاتی ہے اور ذکر دل کے اندر پیوست و راسخ ہو جاتا ہے۔ تو ماسوا کا فکر و دھیان قلب سے کلیتہً خارج ہو جاتا ہے اور سالک پر آیۂ کریمہ " وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا " کی حقیقت جلوہ گر ہو کر اسے "غیر اللہ" سے منقطع اور ذاتِ ربانی" میں ہمہ تن مشغول کر دیتی ہے۔ ذکر سے دل انوارِ الٰہیہ سے معمور' اور تجلّیاتِ ربّانیہ کا محل بن جاتا ہے۔ شئون و صفاتِ الٰہیہ کی جلوہ سامانیاں' اور ذاتِ حق کی بارگاہِ قدس میں اس کا ذکر اسے ملاءِ اعلیٰ کی توجہات و فیضان کا مورد بنا دیتا ہے' الفاظِ ذکر سے حقیقتِ ذکر تک رسائی اسے ذکر' سے "مذکور" تک پہنچا دیتی ہے۔ سلوک کی ابتدا الفاظ ذکر سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا" مذکور" کی" صفات" کی معرفت اشتغال اور ذاتِ متعال کے بے چوں و بے چگوں" دھیان حضوری" کی کیف انگیزیوں میں ہوتی ہے۔ کیفیتِ احسانی" کی ایک پرسکون "نادیدہ تجلّی" ہر آن اس کے قلب کو مستورِ ازل کے دھیان میں مشغول رکھتی ہے۔

ذکر' "ذاکر" کے دل کو روشن' نرم' منقاد رذائل سے پاک اور فضائل سے

ﻟﮯ - حدیث نبوی ہے۔ ان من الناس مفاتیح لذکر اللہ اذا رأوا ذکر اللہ

کنز العمال ص ۱۰۶ ج ۱ بحوالہ مسند کبیر طبرانی عن ابن مسعود)

رفتہ رفتہ آراستہ کر دیتا ہے۔ "تجلیاتِ ذکر" سے ذاکر کو "مذکور" یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص "لگن"، "رابطہ" اور نسبت میسر آجاتی ہے اور وہ "محبوبِ حقیقی" کے رضا و قرب کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے اس لئے احکامِ الٰہی کی بے چون و چرا تعمیل اور نواہی سے پرہیز اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ "ذکر" کی قوتِ محرکہ "ذاکر" کو ہر آن تحسینِ اعمال اور اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کے حصول میں سرگرم رکھتی ہے۔ گویا "ذکر" کا لازمہ "احکامِ ربانی" کی پابندی اور منکرات و فواحش سے کلی پرہیز ہے۔ معاصی کے صدور کے ساتھ ذکرِ حقیقی کا اقتران محض دجل و تلبیس ہے وہ ذکر ذکر ہی نہیں جو ذاکر کو گناہوں سے نہ روک دے اور اسے احکامِ الٰہی کا پابند نہ کر دے، "ذاکرین" بارگاہ قدس جل جلالہ و عم نوالہ کی رضا و قرب اور اس کی عطایا و نوازشات کے طالب ہوتے ہیں اور اس کی بارگاہ عالی تک رسائی کے لئے معاصی سے اجتناب اوامرِ الٰہیہ کی پابندی اور اتباعِ سنت کا اہتمام شرط کا درجہ رکھتا ہے۔ گویا "ذاکر" وہی ہوگا۔ جو "مذکور" کے رنگ میں اپنے کو رنگ دے اور اس کے احکام کی کامل اطاعت اپنا معمول، گناہوں سے بچنے کا اہتمام و التزام اپنا شعار اور اتباعِ سنت کو اپنا حال بنا لے۔ ورنہ "صورتِ ذکر" ہوگی۔ حقیقتِ ذکر کا تحقق و وجود نہیں ہوگا۔

ذکر کی اسی حقیقت و اہمیت کی وجہ سے سلوک و ذکر لازم و ملزوم ہیں۔ یادِ حق سے غافل ہو کر اس راہ کا ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ طریق کا مقصد شریعتِ مطہرہ کے کامل ظاہری و باطنی اتباع سے اللہ تعالیٰ کی رضائے تام کو حاصل کرنا ہے اور چونکہ اصلاح کا سارا مدار قلب کی درستگی، تصحیح نیت اور اعمالِ قلبیہ کے سنورنے پر ہے اس لئے مشائخ کرام شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی، سنت نبویہ کے اتباع و

اہتمام کے ساتھ قلب کی پاکی اور صفائی پر زیادہ توجہ کرتے ہیں، کہ "دل" بن جانے سے انسان بن جاتا ہے اور دل کے بگاڑ سے انسان کا بگاڑ ہے۔ ظاہری اعمال عبادات و اخلاق ہوں یا معاملات و معاشرت ان کی خرابی کی اصل جڑ قلب کے کسی گوشہ میں ہی ہوتی ہے۔ ہدایت و اصلاح کے سب سے بڑے رمز آشنا سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے

"ہشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور وہ خراب ہو۔ تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، ہشیار رہو کہ وہ دل ہے (بخاری و مسلم)
اس دل کی جلا اور پاکی ذکر الٰہی سے میسر آتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

لکل شیء صقالۃ — ہر چیز کا صیقل (چمکانے والا) ہوتا ہے اور
وصقالۃ القلوب ذکر اللہ — دلوں کا صیقل اللہ تعالےٰ کا ذکر ہے۔

(مشکوٰۃ ص۱۹۹، بحوالہ البیہقی)

حضرت سید الملۃ قدس سرہ اس حقیقت کا اظہار اپنے اشعار میں فرماتے ہیں۔

ذکر حق سے صیقل کامل ہوا
محو دل سے نقش ہر باطل ہوا
چار جانب بارش انوار ہے
جلوہ فرما وہ مہ کامل ہوا
دولت کونین سے محروم ہے
جو بھی تیری یاد سے غافل ہوا

قلب کے "تخلیہ" اور "تجلیہ" کے لئے ذکر کی کثرت اکسیر کا حکم رکھتی ہے اس لئے

جملہ مشائخ طریق سالکین کو ذکر کے مختلف طرق بتاکر ان کے قلب کو "غیر اللہ" سے فارغ اور ذاتِ حق میں شاغل بناکر استحضارِ ربّانی کے ساتھ احکامِ الٰہی اور سنت مطہرہ کا پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب دل غیر اللہ کا جویا نہ رہا - اور اس میں ایک اللہ جل جلالہٗ عم نوالہٗ سما گیا تو انسان ہر چیز سے کٹ کر اس کا ہو جاتا ہے - اور اس کی زندگی اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا مظہر بن جاتی ہے -

نسبت ولونِ تھانویہؒ

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ مشائخ سے جس سلسلۃ الذہب کی سنہری کڑی تھے، اس میں ہندوستان میں رائج چاروں سلاسل چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ ایک ہی سلسلہ میں مجتمع ہو گئے تھے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مرشدِ روحانی شیخ الکل حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ چاروں سلسلوں میں بیعت لیتے تھے، لیکن ان کی نسبت غالبہ چشتی ذوق وشوق اور نقشبندی وقار و سکون کا مجمع البحرین تھی - قادری اور سہروردی نسبتیں اپنے الوانِ مختلفہ اور اذواقِ طیبہ کے ساتھ اسی نسبت غالبہ میں مدغم ہو گئیں تھیں، سلوک میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی عبقریت و مجددیت نے انہیں اپنا ایک خاص لون عطا فرمایا تھا جو اپنی جامعیت میں جملہ سلاسل کی نسبتوں کا خلاصہ تھا - آپ کی تجدیدی شان نے اذکار و اوراد کے انتخاب کو بھی نیا رنگ اور رونق بخشی، جو اس عہد کے سالکین کے احوال کے عین مناسب تھے

تشخص سلیمانیؒ

ہمارے حضرت والا قدس سرہ جب اس سلکِ عالی سے منسلک ہوتے تو شیخ میں "فنائیت" کے کمال کے ساتھ اپنے گوناگوں فضائل وکمالات کی بناء پر "مشیخت" میں اپنی البیلی اور تربیت میں اجتہادی شان کو قائم رکھا علم وفضل میں تمام عمر شبلی مرحوم سے عقیدت و تلمذ کے والہانہ رشتہ کو باقی

دیکھنے کے باوجود سید صاحبؒ کا اپنا ایک خاص تشخص تھا۔ جو شبلیؒ اور سلیمانؒ میں امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت والا رحمہ اللہ تعالےٰ کی شخصیت شیخ کامل میں فنا ہو کر بھی اپنے کمالات و فضائل کی امتیازی حیثیت برقرار رکھ سکی۔ اس درازنفسی سے مدعا یہ ہے کہ حضرت والا قدس سرہٗ گو حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کے اذکار و اوراد سے استفادہ و افادہ فرماتے رہے تاہم ایک شیخ کامل اور محقق مربّی کی طرح اذکار و اشغال کی تلقین میں آپ نے اپنی اجتہادی صوابدید کو برقرار رکھا اور سالکین کو ان کے حسب حال اذکار تلقین فرما کر ان کا تعلق اللہ سبحانہ و تقدس سے جوڑتے رہے اذکار کی مثال اغذیہ روحانی کی ہے۔ جیسے جسمانی غذائیں ہر انسان کی طبیعت و مزاج کے مطابق ہی مفید ثابت ہوتی ہیں اور تولیدِ خون کا سبب بنتی ہیں۔ اسی طرح اذکار بھی سالکین کے مزاج، استعداد اور قوت قلبی کے مطابق ہی فائدہ مند ثابت ہو کر روحانی فضائل و مزایا کا سبب بنتے ہیں۔ اذکار کا تنوّع، تعداد اور قلت و کثرت سب سالک کی قوت طبعی و قلبی کو دیکھ کر متعین کی جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک شیخ حاذق اور عطائی پیر میں نمایاں فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور حافظؔ کا یہ پرحکمت شعر حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے ؎

ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجا است
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

غرض معمولاتِ ذکر کا تنوع، کمی بیشی، اوقات کا تعین، شیخ کامل کی رہنمائی کے بغیر سالک کو گاہے نقصان پہنچا سکتا ہے اور اسے "سالک" سے "مجذوب" بلکہ "مجنون" تک بنا سکتا ہے حالانکہ بقول حکیم الامت نور اللہ مرقدہ اللہ تعالےٰ کا نام

ہوش بڑھانے کے لئے لیا جاتا ہے نہ کہ ہوش کھونے کے لئے"

ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ حذاقتِ فن، مہارت طریق، دقتِ نظر، شفقت علی الطالبین و اشرافِ خواطر کے جس مقام پر فائز تھے اس کا اندازہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے تربیتی نہج اور تلقین کردہ اذکار کے ایک ایک حرف و شوشہ سے نمایاں ہے۔ آئندہ سطور میں اسی اجمال کی کچھ تفصیل ہے۔

اہمیتِ ذکر

حضرت سید صاحب قدس سرہ ذکر کی اہمیت کی وضاحت فرماتے ہوئے ایک طالب کو ارشاد فرماتے ہیں:-

"دو باتوں کا خاص لحاظ رکھا جائے، اول فرائض کی ادائیگی کا پورا پورا اہتمام دوم نوافل مسنونہ اور "اذکار کی کثرت" ان کے علاوہ ہر قسم کے گناہوں سے احتراز کا اہتمام رکھا جائے کہ دل میں تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو"۔

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

"ہمیشہ کے لئے یہی نصیحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت نہ ہو، تہجد اور ذکر کا اہتمام رہے"۔

ایک دوسرے مکتوب میں ہے۔

"تہجد اور ذکر یہ دونوں اس طریق کی ضروری چیزیں ہیں۔ ان پر مداومت رکھئے"

ایک پریشان حال طالب کو کس مشفقانہ انداز میں ذکر کی طرف متوجہ فرماتے ہیں:

"زندگی میں چین کہاں؟ یوں ہی گذر جائے گی، چین کا انتظار کام میں لگ کر نا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اطاعت میں لگے رہیے اور اسی سے اپنی مشکلوں کے حل کے لئے دعا مانگا کیجئے۔ وہی آپ کی سب مشکلوں کو حل فرمائیں گے۔ دل کو اللہ تعالیٰ ہی سے

لگائے رہیئے"

ایک دوسرے طالب کو تلقین فرماتے ہیں:۔

" اللہ کے ذکر سے اطمینان ہوتا ہے ..... (ذکر) آپ زبان ہی سے کئے جائیے ۔ انشاء اللہ تعالیٰ دل تک اثر کریگا ۔ ضروری اشغال میں غفلت کا علاج وقتاً فوقتاً قلب کو اللہ تعالےٰ کی طرف مشغول کر لینا ہے"

ایک اور جگہ ارشاد ہے

" دل چاہے تو (ذکر) ضرور کیجئے ، ذکر مفرد کیجئے " اللہ اللہ " دو تین ہزار..... نماز پنجگانہ با جماعت تلاوت اور تہجد اور ذکر کا اہتمام چاہئیے "

ایک نو شادی شدہ طالب کو ارقام فرماتے ہیں :۔

" شادی کے بعد آپ کی طبیعت میں جو سکون ہوا ، اس کو ذکر خدا اور فکر آخرت میں خرچ کیجئے صرف یہ خیال رہے کہ بددینوں کی صحبت سے احتراز ہونا چاہئیے ۔ ذکر الٰہی سے دل کو تازہ رکھا جائے ۔ اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھا جائے ..... اللہ تعالیٰ پابندی سے ذکر کی توفیق بخشیں ۔ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ ..... (یعنی) یاد الٰہی سے غفلت نہ ہو ۔ ذکر کا مقصود یہی ہے ۔

ایک مسترشد خاص کو ارقام فرماتے ہیں ۔

اختلاط مع الانام بے شبہ تعلق باللہ میں حارج ہے ۔ گو اپنی نیت صحیح ہو ، جس کا ثواب ملے گا ۔ مگر نجاستوں کی پلیدی سے تو چارہ نہیں ، اگر کوئی کوئلہ کے گرد و غبار کو حسن نیت سے صاف کرے تو ثواب تو ملے گا ۔ مگر ہاتھوں اور کپڑوں میں سیاہی لگنا بھی ممکن ہے .... اس دنیا میں

سکون صرف تعلق باللہ اور ترکِ علائق غیر میں ہے ؂

نہیں جمع دل جمع اسباب سے ٭ رہ جمع دل ذکر اللہ ہے

(تذکرہ سلیمان)

مقصود و ذکر

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ — اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (الجمعہ ۲)

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ — اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے (العنکبوت ۵)

ذکر الٰہی کی اہمیت و تاکید سے قرآن حکیم اور احادیث نبویہ کا صفحہ صفحہ روشن ہے ذکر فریضۂ عبدیت، لازمہ محبت، موجب رضائے الٰہی جاذب رحمت رحمانی اور جالب توجہات ربانی ہے۔ ایمان کا تقاضا غایت حب الٰہی ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ — اور وہ لوگ جو ایمان والے ہیں اللہ تعالیٰ کی محبت انتہائی درجہ کی رکھتے ہیں۔ (البقرہ ۲۰)

اور ایمان و اعمال صالحہ محبت کی نشو و نما کا بڑا ذریعہ ہیں

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا — جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے۔ رحمٰن (خدا) ان کے لئے محبت پیدا کر دے گا۔ (مریم ۶)

محبت کا منطقی نتیجہ "یاد محبوب" ہے۔ کہ محبت خود "یاد" کا سب سے بڑا سبب ہے اس لئے "عقل و ہوش" رکھنے والا حقیقت میں "محبین" کا ہی گروہ ہے جو آیات الٰہیہ میں غور و فکر کے ساتھ ہر حال میں یاد الٰہی میں مشغول رہتا ہے

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ — وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو کھڑے بیٹھے

قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ الایۃ   لیٹے (ہر حال میں) یاد کرتے ہیں ....

(آل عمران - ۲۰)   الایۃ

یہ وہی طبقہ ہے جسے معاش کے مشاغل یادِ حق سے غافل نہیں کرتے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ   (النور - ۵)   ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید وفروخت یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتی۔

"صادقین ومخلصین" کا یہ گروہ "یادِ حق" محض امرِ الٰہی سمجھ کر رضائے ربّانی کے لئے کرتا ہے کہ ان کی محبت بھی حکمِ ربانی سے ناشی ہوتی ہے اور محبّت کا تقاضا بھی اپنی چاہت کا پورا کرنا نہیں بلکہ رضائے دوست کے لئے مرمٹنا ہے

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب

کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

بلاشبہ "داعیہ محبت" "یادِ حبیب" ہے اور ثمراتِ ذکر کا شمار نہیں لیکن اصلاً مقصودِ ذکر فقط ادائیگی فرض اور حصولِ رضائے رب ہے، عاشقِ صادق کی نگاہ اپنے پر نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی نگاہ ہر آن منشائے محبوب کی تلاش وجستجو میں اور اس کے اشاروں پر دل وجان سے عمل کرنے میں گذرتی ہے۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن

دل بدست دگرے دادن وحیران بودن

مدعا یہ ہے کہ ذکر کا اصل منشاء اور حقیقی داعیہ امرِ الٰہی کی عظمت اور رضائے ربّانی کی رغبت ہو اور حبِّ طبعی کے تقاضے اس عظمت ورغبت میں اس طرح مندمج ہو چکے ہوں کہ نیّتِ ذکر میں صرف امتثالِ امرِ الٰہی اور رغبتِ حصول

رضا کا جذبۂ صادقہ کارفرما ہو۔ دگرسب ہیچ'

حضرت الشیخ الامام نوراللہ مرقدہٗ اپنے ایک مسترشد خاص کو ارقام فرماتے ہیں

"ذکر ہر حال میں کرنا چاہیئے۔ اگر لذت ملے تو نعمت' ورنہ ادائے فرض کی نعمت تو بہرحال ہے ؎

بہرحال بندہ پہ ہے بندگی

کرم ہے جو ذوق عبادت ملے

ذکر کا خاصہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے ارشاد کے مطابق "اُذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ" — تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اس سے بڑھ کر نعمت کیا ہو سکتی ہے کہ ذاکر کو بوقت ذکر خود حق تعالےٰ یاد کرتے ہیں ذرا اس کا تصور تو کیجئے اور جب "اللہ" کہیے تو تصور کے کان سے سنئے کہ "عبدی" کی آواز آتی ہے ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا میرے لئے انعام ہے

آپ خود سنتے ہیں آکر جو میرا پیغام ہے

(تذکرہ سلیماں ص۴۳۳)

حقیقتِ ذکر

'ذکر' کی حقیقت اس کے مفہوم ہی سے واضح ہے۔ 'ذکر' لغتہً 'یاد کرنے' یا 'یاد رکھنے' کے معنیٰ میں آتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے۔ کہ 'محل ذکر' یا 'ذاکر' صرف 'دل' ہے۔ کہ جب کسی کی یاد آئے گی یا کسی کو یاد کیا جائے گا۔ تو زبان سے اس کا 'ذکر' یا نام لینا ضروری نہیں ہوگا۔ بلکہ دل ہی میں 'مذکور' کا 'خیال و دھیان' آئے گا اور دل ہی اصلاً ادھر متوجہ ہوگا۔ گویا 'حقیقتِ ذکر' کا تحقق[1] دل ہی میں ہوگا۔ پس دل سے کسی کی طرف متوجہ یا ملتفت ہونا، یا دل میں کسی کی یاد و دھیان' آجانے کا نام ذکر ہے، الفاظِ ذکر اسی مدلول پر دال اور اسی حقیقت کا زبانی اظہار ہیں۔ گویا 'قلبی یاد' حقیقتِ ذکر ہے اور الفاظِ ذکر صورتِ ذکر، قلبی یاد کو اصلاً الفاظِ ذکر کی ضرورت نہیں۔ لیکن الفاظِ ذکر اپنی حقیقت 'معنیٰ' کے تحقق کیلئے سراسر یادِ قلبی کے محتاج ہیں

اس تشریح کو ذہن میں رکھتے ہوئے ذکر کی شرعی و صوفیانہ اصطلاح کے

---

[1] یہ افادہ حضرت مولوی شاہ عبدالباری ندوی مدظلہ کا ہے۔ دیکھو تجدید تصوف و سلوک

معنی بھی متحقق و واضح ہو جاتے ہیں، شریعت و سلوک میں 'ذکر' سے مراد 'یاد الٰہی' ہے گویا 'یاد الٰہی' سے مراد حقیقتاً 'دل' سے اللہ تبارک و تعالیٰ کا یاد کرنا اسے دل میں بسانا، اسکا دھیان جمانا اور اسکا فکر و استحضار ہے۔ حضرت والا ایک سالک کو ارقام فرماتے ہیں۔

"اللہ معی کا تصور کہ ہر وقت وہ ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے قریب ہے۔ اور ہمارے ہر فعل و خیال کا حاضر و ناظر ہے۔ اسکے مضمون پر غور کیا جائے اور اس کے مناسب آیات کا استحضار رہے۔ جیسے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ، وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ، یا وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ، اور وَلَا تَخْفٰى عَلَيْهِ خَافِيَةٌ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ، نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ اور اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ اور اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى۔ اسی کیفیت کا رسوخ اصل روح ہے۔ جسکا طریقہ ذکر و شغل ہے۔"

اگر کسی خوش نصیب کو کسی وقت بغیر ادائیگی الفاظ کے ذکر کی یہ دولت میسر آجائے اور ایسی حالت میں وہ الفاظ ذکر ادا نہ بھی کرے تو حرج نہیں۔

ایک طالب نے حضرۃ سیدی قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا۔

"قلب کو سکون صرف توجہ الی اللہ سے ملتا ہے اور اس وقت الفاظ ذکر بھی منقطع کر دینے پڑتے ہیں۔ صرف توجہ سے دل کی سیاہی مٹتی محسوس ہوتی ہے۔"

حضرت الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارقام فرمایا

"ذات کی طرف توجہ اصل ہے۔ اگر اس حالت میں معانی و الفاظ کا استحضار نہ رہے تو کوئی حرج نہیں۔ اصل توجہ مذکور کی طرف ہونی چاہیئے یہ نہ ہو تو ذکر کی طرف۔"

عارفِ رومی نے اس مقام کی طرف اشارہ اپنے شعر

مست ولا یعقل نہ از جامِ ہو — اے زہو قانع شدہ بزنامِ ہو

کے پہلے مصرع میں فرمایا ہے۔ مولانا کی مراد یہ ہے کہ ایک طبقہ "احسان" کی اس کیفیت کا حامل ہونا چاہیئے جہاں حسنِ ازل باوجود 'مستور' ہونے کے 'تجلّیات شہود' سے قلب عارف کو اپنے میں مشغول و مسرور رکھتا ہے۔ اور "انوارِ ماہ کی تابانی[1]" سے سالک کا دل منوّر ہو کر ان کی بے حرف و صوت[2] یاد" میں شاغل ہو جاتا ہے، "جام ہو" کے سرشاروں کا یہ طبقہ استحضارِ سرمدی میں مخمور رہتا ہے۔ ان کا دھیان ہی اصل ذکر ہے۔ حضرت سیّدی نور اللہ مرقدہٗ کے یہ اشعار بھی غالباً اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی — آ دل میں مرے چھپ جا اے صورت جاناں تم

---

[1] مولاناؒ کا شعر ہے

قلب را تاباں کن از انوار ماہ — زانکہ از آسیب ذنب شد دل سیاہ

[2] مولانا فرماتے ہیں:

اے خدا بنما جان را آں مقام — کاندر وے بے حرف می روید کلام

غرض ذکر سے اصل مقصود اللہ تعالیٰ کا دھیان و یاداشت قلبی ہے۔
حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک سالک کے استفسار پر کہ "ذکر سے اصل مقصود قلب کو مشغول رکھنا ہے یا محض زبان کو یا دونوں کو" تحریر فرماتے ہیں۔
"ذکر سے اصل مقصود تو مذکور یعنی 'اللہ' کا استحضار ہے۔ یہ نہ ہو تو 'ذکر' کا بھی نہ ہو تو 'ذاکر' یعنی 'قلب' کا (تذکرہ سلیمان ص ۵۸۲)
مباحث بالا کا حاصل یہ ہے، کہ 'ذکر' کا اصل تعلق دل سے ہے اور "یاد قلبی" ہی حقیقی ذکر ہے

ظہورِ آثارِ ذکر
یا
وسعتِ ذکر

حقیقتِ ذکر کی اس تشریح سے واضح ہوگیا۔ کہ غایتِ 'ذکر' 'دل' میں "یاد و دھیانِ حق" کا ایسا بسانا ہے کہ 'علائق غیر' اشتغالِ قلبی اور مشغولیتِ حق' میں دراندازی اور حارج نہ ہوسکیں۔ اور خلوت و جلوت 'تماشائے جمال' کیلئے یکساں ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کا اتنا گہرا تعلق و استحضار سالک کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوگا۔ کہ انسان کا ظاہر و باطن اور تمام 'جسم' 'دل' کا تابع ہے۔ 'دل' کی لگن پورے جسم کو اسی راہ پر لگادیتی ہے۔ جس 'راستے' 'دل' گامزن ہوتا ہے۔ خصوصاً عشق و محبت کی تاثیر تو جسم کو بھی 'دل' کے حکم میں لے آتی ہے۔ کسی عرب شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ لیس الفواد محل عشقك وحدہٗ

کل الجوارح فی ھواك فواد

(یعنی صرف میرا دل ہی تیرے عشق کا مقام نہیں۔ بلکہ سارے اعضا تیرے عشق میں دل بن چکے ہیں) اس لئے ذکرِ حقیقی جب 'قلب' ذاکر کی وسعتوں پر چھاتا ہے۔ تو اس کی

تاثیر اس کے رگ و پے اور ریشے ریشے میں سرایت کرجاتی ہے۔ اور سالک کے تمام اعضاء جوارح اور ظاہر و باطن کو محبوب حقیقی کے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ ے

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
جیسے شاخِ گل میں باد سحرگاہی کا نم

ذکر کے 'انوار' قلب' سے نکل کر پورے 'قالب' کو متجلّی و نورانی اور عظمت الٰہی سے متاثر اور منقاد بنا کر کلیتہً احکام ربّانی کا تابع بنا دیتے ہیں۔ اور ذاکر جملہ اوامر الٰہیہ کا پابند اور تمام معاصی سے مجتنب ہو جاتا ہے۔

ذکر کا کمال یہی ہے۔ کہ 'ذاکر' یاد الٰہی' کے دائمی اشتغال و استحضار کے ساتھ ہر حال میں گناہوں سے بچتا رہے اور احکام ربّانی کی پابندی اس کا شعار ہو کہ' ذکر' کی حقیقت شرعی اسی طرح میسر آسکتی ہے۔ ورنہ اطاعتِ ربانی سے گریز اور معاصی کی آلودگی کے ساتھ 'ذکرِ حقیقی' کا تحقق نہیں ہوسکتا جو ذکر لسانی' یا 'موہوم ذکرِ قلبی' احکامِ الٰہیہ کی پابندی اور معاصی سے اجتناب نہیں سکھاتا۔ اِسے ناقص اور رسمی ذکر' یا "قشر و صورتِ ذکر" تو کہا جاسکتا ہے لیکن اس پر' ذکر مطلوب و کامل' کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت والا کو ایک سالک نے لکھا:۔

"اسم ذات کا ورد و ذکر تو روزانہ ہے۔ مگر کسی خاص کیفیت کا ظہور ہنوز نہیں ہوا ہے۔ عنایت خاص کی ضرورت ہے۔"

حضرۃ الشیخ قدس سرہٗ نے عجب حکیمانہ ومحققانہ جواب دیا ہے فرماتے ہیں۔

"ذکر سے کیفیات مقصود نہیں ہیں اصل شئی احکام الٰہی کی کلی اطاعت، حلال وحرام کا خیال، معاملات کی صفائی، اخلاق کی نزاہت، اتباع نبوی ﷺ کا دھیان اور تمام امور میں رضائے الٰہی کی طلب ہے۔ ان امور کی طرف توجہ فرمائیں کہ یہ اصل ہیں۔ باقی سب فروع وتدابیر۔

ذکر کے اثر کا ظہور یہی ہے کہ طاعات ومرضیات الٰہی کے اتباع کا ذوق بڑھے اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہر حال میں ہو، باقی کیفیات تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ اگر روز پلاؤ ملے تو پلاؤ کا مزہ بھول جائے۔

از دستِ ہجرِ یار شکایت نمی کنم
اگر نیست غیبتے نہ دہد لذتِ حضور،

اپنے کام میں تا آخر دم استقامت کیساتھ لگے رہیئے یہی بڑی دولت ہے؛

تا دم آخر دمے فارغ مباش"

ایک طالب نے اثراتِ ذکر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

"اب جب بھی فکر کروں اللہ تعالیٰ کی قربت یوں محسوس ہوتی ہے گویا وہ میرے سانس کے ساتھ ہیں۔ لیکن بے کیف وبے چگوں بلکہ مجھ سے میری ذات سے بھی زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے اعمال صالحہ میں کوتاہی ہوجاتی ہے۔"

حضرت الشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا:۔

"جب انسان اللہ تعالیٰ کو ایسا حاضر وناظر یقین کرتا ہے۔ تو اس

سے فرضِ اعمال صالحہ کی بجا آوری میں سستی کیوں کر ہو سکتی ہے،

وہ جب یقین کرے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ اور ہم سے ایسے قریب ہیں۔ تو اس کو شرمندہ ہونا چاہیئے کہ اس حالت اور اس عنایت کے باوجود اعمال صالحہ میں کوتاہی کیوں ہو۔ اگر پھر بھی حالت نہ بدلے تو موت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اور یہ سوچنا چاہیئے۔ کہ ایک دن خدا کے سامنے حاضر ہونا اور ایک ایک بات کا جواب دینا ہے۔ اسوقت بندہ اس کوتاہی کا کیا جواب دے گا۔ اور پھر دنیا کی دولت و ثروت جس کی محبت میں انسان گرفتار ہے۔ کیا کام آئے گی۔ اس وقت صرف اعمال صالحہ کام دیں گے اس سے خدا کا خوف پیدا ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔"

یہ تحریریں تو ہر ذاکر کیلئے مفید ہے۔ لیکن اُن "متصوفین" کی خاص توجہ کے لائق ہے۔ جو" موہوم ذکر قلبی' (جسے وہ اپنی اصطلاح میں 'قلب کا جاری ہونا' کہتے ہیں) کے زعمِ باطل میں فرائض الٰہیہ تک سے غفلت برت جاتے ہیں۔ اور پھر گمان کرتے ہیں کہ" ہمیں اب ان اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں تو ہر وقت 'قرب و وصل' نصیب ہے" یاد رکھنا چاہیئے کہ ذکر وہی مطلوب و مقصود ہے۔ جو ہمیں ہر حال میں احکام الٰہیہ کا کامل پابند بنا دے اور گناہوں سے کلیتہً بچا دے۔ بلکہ فقیر سمجھتا ہے۔ کہ " ذکر شرعی" وہی ہے جو شریعت مطہرہ کی ظاہری و باطنی پابندی کے ساتھ مقترن ہو۔ ورنہ رسمِ ذکر ہے۔ حقیقت ذکر کا تحقق نہیں۔ اور نہ ایسا ذکر غایتاً مامور و مقصود ہے۔

ذکرِ رسمی استحضارِ صفات سے ذکرِ حقیقی بن سکتا ہے

اِس لئے اگر" نام نہاد ذکر و قربت" کا ' واہمہ' (نفسانی فریب اور شیطانی دجل ہے) ہمیں احکام الٰہیہ کا پابند نہ ہونے دے۔ تو اسکا علاج 'مذکور' کی 'صفات جلالی' کا استحضار اور ' احکم الحاکمین مالک یوم الدین' کی پیشی کا اعماقِ قلب سے دھیان ہے۔ کہ خشیت ربّانی پیدا ہو جو ہمیں حقیقت ذکر سے ہمکنار اوامر کا پابند اور گناہوں سے روک سکے چونکہ بعض اوقات" عظمت الٰہیہ اور صفاتِ ربّانی سے معرا ذکر' کی کثرت سے بھی مطلوب نتائج مرتب نہیں ہوتے۔ اس لئے 'مذکور' کی صفات کا دھیان و استحضار حقیقتِ ذکر میں شامل ہے۔ کہ جلالی صفات کا لازمہ عظمت و خشیتِ رحمانی اور جمالی صفات کا نتیجہ حبّ و اشتیاقِ ربّانی ہے جس سے رغبت و رہبت پیدا ہوتی ہے جو اعمال صالحہ کے شوق اور گناہوں سے نفرت پر منتج ہوتی ہے۔ اس طرح ذاکر 'ذکر کامل' سے بہرہ مند ہو کر قلباً ذات حق میں شاغل اور قالباً اعمال صالح و احکام الٰہی کی فرمانبرداری میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور 'ذکر مطلوب' کا ثمرہ میسر آجاتا ہے۔ پس 'ذاکر' کیلئے ضروری ہے کہ 'ذکر' صفات الٰہی کے دھیان اور عظمت ربّانی کے استحضار کے ساتھ کرے تاکہ 'حقیقت ذکر' سے ہمکنار ہو سکے۔ ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

" اللہ تعالیٰ اس ذات کا نام ہے۔ جو تمام صفاتِ حسنہ کی جامع ہے۔ ' اللہ' کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا دھیان اس کی تمام صفات حسنہ

کے ساتھ ہونا چاہیئے، غالباً مولانا رومؒ نے مثال کے طور پر بتایا ہے کہ جس طرح سو کے عدد میں ایک دو تین کے عدد شامل ہوتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات میں تمام صفات حسنیٰ جمع ہیں جب انسان "اللہ" کہے تو یقین ہو کہ "لا خالق الا اللّٰہ"، "لا مالک الا اللّٰہ"، لا قادر الا اللّٰہ، لا رب الا اللّٰہ، لا فاعل الا اللّٰہ لا موثر الا اللّٰہ، لا سمیع الا اللّٰہ، لا بصیر الا اللّٰہ، لا رازق الا اللّٰہ، لا معطی الا اللّٰہ، لا مانع الا اللّٰہ، لا نافع الا اللّٰہ، لا ضار الا اللّٰہ .... اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے ان جملہ صفات کی نفی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ ہی میں تمام صفات کو سمجھا جائے ......"

جب جملہ صفات کے استحضار کے ساتھ ذکر کیا جائے گا تو تقاضائے صفات یعنی احکام الٰہیہ، عبدیت و عبودیت اور اس کے لوازم، حساب و کتاب حشر نشر، دوزخ و جنت، ترغیبات و ترہیبات، جزا و سزا، مغفرت و عذاب، جزاءِ اعمال ایک ایک چیز مستحضر ہو جائے گی۔ اور یہ ذکر حب ربانی و خشیت الٰہی کے دوگونہ جذبات پیدا کر کے ہر وقت ذاکر کو عنایات الٰہیہ کا راجی و متمنی اور اپنے اعمال کی پاداش سے خائف و ترساں رکھے گا اسکی زندگی کے ظاہر و باطن میں مامور بہ انقلاب آئے گا۔ اب وہ ہر قدم حکمِ الٰہی کو دیکھ کر رضاء و رحمت ربانی کی طلب میں اپنے عجز و کمزوری، کوتاہی و نارسائی پر نظر رکھتے ہوئے رغبۃً و رہبۃً شریعت مطہرہ اور سنت نبویہؐ کے مطابق

اٹھائے گا۔ اس طرح اسکی "زندگی" ذکر کا محل بن جائیگی۔ وہ خالق ہی کا ہوکر رہ جائے گا کہ جو سب کچھ رب العلمین ہی دیکھتا ہے اور جس پر "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ اس کی زندگی اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا حقیقی مظہر بن جائیگی۔ وہ ہر ایک سے بے نیاز ہوکر ایک کا 'نیاز مند' اسی کا طالب اسی سے لینے والا بن جاتا ہے وہ "الحمد" یعنی جملہ محامد وصفات کو جب "اللہ" ہی کیلئے وجداناً و ایقاناً خاص سمجھنے لگتا ہے تو 'العلمین' کی بے نوائی و فقر اس پر کھل جاتا ہے۔ اور وہ اسی کے در کا فقیر بن کر "رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ" اس کا حال بن جاتا ہے۔ اپنی جملوں حاجتوں کو اس کی ذات سے متعلق کر دیتا ہے اور عبدیت و عبودیت، عجز و درماندگی، حاجت وضرورت اسکی جملہ عبادات ومعاملات نماز وقربانی، زندگی و موت کو صرف اللہ تعالیٰ کیلئے کر دیتی ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کے ہر ہر فکر و عمل، قول و فعل اور حرکت و سکون سے 'مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ' کا منظر پیش کرتا ہے۔ تفویض کامل و توکل تام اس کا مقام بن جاتا ہے۔ اور تجرید و تفرید کے اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی تجلیات اور اس کی صفات و شئون کی نیرنگیوں کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ "مخلوق و کائنات" کے جملہ احوال و امور میں تصرفات الٰہیہ ہر آن کا لعین مشاہد ہوتے ہیں۔ اور قلب ہر 'غیر' سے پاک و فارغ ہوکر معرفت ربانی سے پرنور اور حب رحمانی و خشیت الٰہی سے معمور ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی کا مشغلہ "طلب رضائے دوست، پابندی احکام محبوب، اطاعت حق

اور اتباع نبوی بن جاتا ہے۔ اور تسلیم و رضا، باہمہ بے ہمہ، اس کا حال ہو جاتا ہے۔ حقیقت ایمانیہ۔ اس کے جذرِ قلب میں راسخ ہو کر طاعت و اعمالِ ایمانیہ کو اس کے لئے محبوب اور کفر اور اعمال کفریہ فسوق و عصیان کو مبغوض و ناپسندیدہ بنا دیتی ہے۔ حضرت سیدی نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد ہے

ہر حالت میں اور ہر وقت اپنی خواہشات کو روک کر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عمل کرنا اپنا ریاض ہے یہی اصلی مقصد اور یہی تصوف ہے۔

حضرت سیدی الشیخ نور اللہ مرقدہٗ کے ان ارشادات سے "ذکر کے اثرات" کی وسعت و حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مدعاء یہ ہے کہ 'ذکر' صرف ایک 'نصابِ اذکار و اوراد' کے رسمی طور پر پورا کر دینے کا نام نہیں بلکہ 'ذکر' اپنی وسعت میں پوری زندگی پر محیط ہے

طرق وطرزِ ذکر و منازلِ اذکار

ذکر کی سلوک میں اہمیت کے پیش نظر حضرت الشیخ نور اللہ مرقدہٗ مختلف طالبین، و مسترشدین کو ان کی صلاحیت و استعداد کے مطابق 'ذکر' کی تلقین و تاکید فرماتے تھے۔ طالب کے "حسبِ حال" ذکر کا تعین اور پھر 'ذکر' کی مختلف "منازل" میں "احوالِ ذاکر" کے مطابق وقتاً فوقتاً حکیمانہ اور تیر بہدف رہنمائی حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاص امتیاز و کمال تھا ہر طالب کو ایک ہی تعداد اور طرز یا نصابِ ذکر نہیں بتاتے تھے۔ بلکہ اپنی فراستِ کاملہ بصیرتِ تامہ و تربیت باطنی کے خداداد ملکۂ راسخہ سے جس کے مناسب حال جو ذکر خاطرِ عاطر پر القا ہوتا تھا۔ وہی بتا دیتے تھے اور طالب اگر اس ذکر کو حقیقتاً اپنا معمول بنا لیتا تھا تو اثرات و آثارِ ذکر کا تعین مشاہد ہو جاتے تھے حضرت والا قدس سرہٗ 'مراحلِ ذکر' کو تدریجاً طے کراتے تھے اور 'عقباتِ ذکر' میں 'حقیقت'، و 'صورت'، اوہامِ باطلہ اور حقائقِ صادقہ میں تفریق کی ایسی لکیر کھینچتے چلے جاتے تھے۔ کہ حضرتؒ کی پُر حکمت، حاذقانہ و مشفقانہ رہبری

ذاکر کو کیفیاتِ ذکر کی "پُرپیچ گھاٹیوں" میں سے اس آسانی سے نکال لیتی تھی کہ نہ تو اسے 'راہ کے تماشے' اپنے میں الجھاتے تھے، نہ اسے وساوسِ شیطانی و اہوائے نفسانی اپنے میں پھنساتے بلکہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریر و ارشاد ہی 'پریشان حال راہی' اور متحیر سالک کو قلبی پریشانی اور 'ورطہ حیرت' سے نجات دلا دیتی تھی اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا تھا: ؎

تیرے اک چھینٹے سے اے ابرِ بہاری ان دنوں
سبز ہے شاداب ہے سیراب ہے گلزارِ دل
دور ہوتی جا رہی ہے ہر کھٹک جو دل میں تھی
تیرے سوزن سے نکلتے جا رہے ہیں خارِ دل

حکیم شیخ کا پرشفقت اندازِ تربیت "اذکار و اوراد"، اشغال و مراقبات کے بارے میں بھی راہی کو مقصود و غیر مقصود، مقاصد و ذرائع کی حقیقتوں سے شناسا کرتا جاتا تھا۔ کہ بیشتر ذاکرین ان کے فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے "سلوک کی گھاٹیوں" میں بھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اور عمر بھر کی محنت منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتی۔ بلکہ غیر مقصودہ 'انوار و لذات، کیفیات و احوال" بزرگانہ اوہام و لاطائل خیالات "کشوفِ کونیہ و مواجید" ہی ان کا مقصد بن جاتے ہیں اور اس "بھول بھلیاں" میں زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ کہ ہدایت 'ذکر' سے "حقیقت ذکر' اور پھر مذکور تک رسائی، اور قلب کا ہر غیر سے فراغ اور ذات متعال میں اشتغال عادتاً فی الفور نہیں ہو جاتا۔ بلکہ راہ کی گھاٹیاں 'پُرپیچ و دشوار خارزار' ہیں جن سے کسی آبلہ پا کا صحیح و سالم نکل جانا توفیقِ رب اور خاصانِ حق کی

عنایت د رہبری سے ہی ہو سکتا ہے۔

غرض ہمارے شیخِ محققؒ اپنے زیر تربیت " ذاکرین و سالکین " کو راہ کی نزاکتوں، خطرات اور باریکیوں سے بھی آگاہ فرماتے رہتے تھے: تاکہ ہر راہی' اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر" عقبات ذکر' کو پار کرلے کہ شیخِ کامل کا کمال ہی یہی ہوتا ہے کہ اس کی برکت سے خار گل اور سرکہ شراب ؟ بن جاتا ہے مشکلات آسان ہوجاتی ہیں اور بیابان و صحرا گل کدہ جنت دکھائی دیتا ہے۔ ع

ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

حضرت والا نوراللہ مرقدہٗ کی یہی حذاقتِ فن اور بصیرت باطنی اور کمالِ تربیت و برکت تھی جس کی وجہ سے ہر ذی استعداد سالک " سلوک کی زہرہ گداز گھاٹیوں " کو طمانیت و انشراح، انبساط و مسرت کے ساتھ علی وجہ البصیرۃ طے کرلیتا تھا اور جادۂ حبیب کی بادیہ پیمائیاں گلگشت کی حیثیت اختیار کرلیتی تھی۔ اور سلوکِ اشرفی کی یہ "شاہی راہ " سلیمانی آئینہ میں انسانیت کی شاہراہِ معرفت دکھائی دیتی تھی۔ جو ہر خاص و عام کو صلائے عام دے رہی تھی کہ ؎

وہ چشمِ محبت تو جو یائے محبت ہے
دیکھے تو ذرا کر کے اس سے کوئی یارانہ

اور اِس راہ کا ہر راہی ببانگ دُہل پکار رہا تھا۔

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
اس نوید جانفزا سے سر د بالِ دوش ہے

غرض سلیمانی رہنمائی، سالکین و ذاکرین کو نہ صرف ' الفاظِ ذکر' سے آگاہ کرتی تھی

بلکہ حقیقت ذکر کا شناسا بنا کر بادۂ الست کے ان میگساروں کو مستورِ ازل کا والہ و شیدا بنا کر اسی کی ذات میں مگن، اس کی یاد میں شاغل، اسکی مرضیات کا طالب اسکے احکام کا متبع اور اس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی و فرمانبردار بنادیتی تھی۔ جن کی خلوت و جلوت، ظاہر و باطن تجلیاتِ ربانی سے پر انوار اور اذکارِ الٰہی سے روشن ہوتا تھا، قرب بے غیبت، اور "حضوریِ قلب" سے ان کا دل متجلّی کیفیت احسان و حقیقتِ ذکر سے ان کا باطن آئینہ اور تحسینِ اعمال سے انکی پیشانیاں نورانی ہوتی تھیں۔" سلیمانی تلقین ذکر کے کچھ نمونے آئندہ سطور میں دیکھنے والوں کو نظر آئیں گے۔"

ایک مرید کو مختلف خطوط میں وقتاً فوقتاً اور تدریجاً 'ذکر' کی تلقین و رہنمائی فرماتے ہیں۔ ان اقتباسات کا بنظرِ غائر مطالعہ جہاں" طالب کے تدریجی مدارج ذکر کو نمایاں کرتا ہے۔ وہاں شیخِ حاذق و کامل کے کمالِ تربیت و شفقت اور دقّت رسی اور فن دانی پر بھی شاہدِ ناطق ہے۔ ابتداً ذکر کی تلقین کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

" آپ پندرہ منٹ مراقبہ کیلئے وقت نکال لیتے ہیں، اگر کچھ وقت اور ملے، جیسے صبح کی نماز کے وقت یا تہجد میں یا کسی اور وقت تو ایک ہزار دفعہ " اللہُ اللہ " ذرا ہلکے نغمہ سے اس حد تک کہیں کہ آپ کے کان میں آواز آئے، تسبیح پر گن کر ذکر کر لیا کیجئے، آنکھیں بند ہوں۔ اور یہ تصور ہو۔ کہ اللہ کا کلمہ نورانی حروف میں آپ کے سینے پر لکھا ہے۔ اگر آپ تعلیم یا کسی اور کام میں مصرف ہوں۔ تو اس میں

نقصان نہ ہو۔ ہر کام میں خدا کی رضا کی نیت رہے۔ انشا اللہ تعالیٰ آپ کے لئے دین کا راستہ کھلے گا۔"

دوسرے والانامہ میں تحریر فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ آپ کو برکت عنایت فرمائیں۔ اسی طرح وقت اور فرصت کے ساتھ ساتھ اس ذکر کی تعداد کو بڑھاتے جائیے بشرطیکہ کسی دوسرے کام میں حرج نہ ہو"

ایک اور مکتوب میں ان ہی کو لکھتے ہیں:۔

"ہر وقت ذکر کی مصروفیت یعنی دوامِ ذکر قلب بڑی نعمت ہے جو آپ کو مل رہی ہے۔ اس کو جاری رکھیئے۔"

دوام ذکر اور کثرتِ اعمالِ صالحہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:۔

"یہ بھی ذہن میں رہے۔ کہ کشف والہام وغیرہ محض محمود ہیں مقصود نہیں ان باتوں کو قربِ الٰہی میں کوئی دخل نہیں ۔۔ قربِ الٰہی صرف ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ ہے اس لئے دوامِ ذکر اور کثرت اعمالِ صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیئے۔"

اِن ہی کو تاکید کرتے ہیں:۔

"کیفیات واحوال کی طرف توجہ نہ کیجئے اور صرف حسنِ عمل اور کثرتِ ذکر کی طرف توجہ رکھیئے"

ایک اور گرامی نامہ میں تسلی دیتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

تعلیم کے مشغلہ کی نسبت یہ خیال کریں کہ یہ حصولِ رزق کی کوشش ہے

اس نیت سے یہ تعلیمی جد و جہد بھی عبادت میں شمار ہو گی۔ با ایں ہمہ اوقات نماز و نوافل و ذکر قائم رکھیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ نعمت (یعنی دوام ذکر) آپ کو حاصل رہے گی"

ہر جملہ بلکہ ہر ہر لفظ و نکتہ شفقت و حذاقت فن میں اپنی مثال آپ ہے ہائے کیا دن تھے ؎

حیف در چشم زدن صحبت گل آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

ایک دوسرے طالب کو مختلف مکتوبات میں ارشاد فرماتے ہیں :

"عصر اور فجر کی نمازوں کے بعد تسبیح فاطمہ یعنی ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ دفعہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھا کریں اور چلتے پھرتے اور سوتے وقت استغفار ——

" اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ "

پڑھا کریں۔ سوتے وقت ستر دفعہ پڑھا کریں اور سوتے جاگتے وقت کی دعائیں یاد کریں۔"

"اگر آپ ذکر کرتے ہوں تو اس کی تعداد بڑھا دیں اور آپ بکثرت تسبیح " سبحان اللہ ، الحمد للہ، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ" اکثر زبان سے پڑھا کریں۔ ذکر نہ کرتے ہوں تو ذکر کی صورت مجھ سے سمجھ لیں۔"

ان ہی کو دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں :۔

"آپ کو میں نے کل ذکر کی زبانی اجازت دی تھی، اب تحریری دیتا ہوں، بعد تہجد پہلے گیارہ دفعہ۔" اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ پھر ۱۱ دفعہ اللّٰھمّ صلّ علی محمّد النبی الامّی وعلی اٰلہٖ وصحبہٖ وبارِك وسلّم پڑھ کر تین دفعہ یہ دُعا پڑھیں،۔

اللّٰھم نوّر قلبی بأنوار معرفتك وطھّر قلبی عمّا سواكَ،

پھر ڈھائی ہزار دفعہ **اللّٰہ** ذرا ہلکی آواز سے پڑھیں۔ ضرب کے ساتھ یا بلا ضرب (مگر یہ سمجھیں کہ ضرب کوئی دینی امر نہیں ہے بلکہ محض علاج کے طور پر ہے۔ کہ موثر ہو) اس کے بعد درود مذکور پڑھ کر ختم کردیں۔

ذکر کے وقت یہ تصور کریں، کہ عرش سے نور آپ کے قلب پر پڑ رہا ہے (یہ تصور بھی دینی امر نہیں بلکہ بطور معالجہ کے ہے تاکہ یکسوئی ہو......"

اسی طالب کو ایک دوسرے گرامی نامہ میں شفیق و محقق شیخ تحریر فرماتے ہیں:

"استقامت اور مداومت حصول مقصد کا سب سے کارگر ذریعہ ہے۔ اگر نیند کا غلبہ ہو تو نوافل تہجد کی جگہ پر دن کو بعد اشراق پڑھیں یا نماز عشاء کے بعد وتر سے پہلے پڑھ لیں۔ ذکر کا وقت دن کو کسی سکون کے وقت مقرر کرلیں۔

نور کے تصور کا استحضار نہیں ہوتا تو کوئی حرج نہیں یہ مقصود خود نہیں ہے مقصود تو یکسوئی ہے۔ توجہ ذکر کے وقت دراصل مذکور

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ ورنہ ذاکر یعنی قلب کی طرف ہو، ورنہ ذکر کی طرف ہو۔"

اِن اقتباسات سے یہ بات مبرھن ہو جاتی ہے کہ حضرت الشیخ قدس سرہ ابتدا ہی میں طالب پر 'اصول و مقاصد' اور "ذرائع و آلات" کا امتیاز و فرق واضح فرما دیتے تھے۔ تاکہ راہی کا کوئی قدم' غلط سمت کی طرف نہ اٹھے اور 'ذرائع' کو 'مقاصد' قرار دے کر 'طریق' کی "صراط مستقیم" سے بھٹک نہ جائے۔ اور 'موصل' کو 'اصل' سمجھ کر اپنے اوقات کے ضیاع میں مبتلا نہ ہو جائے۔ آج ایک کثیر طبقہ انہیں اغلاط کے پیچاک میں مبتلا ہو کر "سلوک" کو "عقدۂ لاینحل" اور "بھول بھلیاں" بنا چکا ہے۔ وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ یَهْدِی السَّبِیْل۔

ایک عالم نے (جو پہلے حضرت تھانوی و حضرت مولوی محمد عیسٰی رحمہما اللہ سے کچھ تعلق رکھ چکے تھے) حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا۔ حضرت الشیخ قدس سرہٗ نے ان کے قدیم تعلق کے بنا پر ان کی تربیت کا نہج اور ذکر کی تلقین بالکل "اشرفی طریق" کے مطابق رکھی۔ کہ سالک جب کسی ربانی شیخ کے زیر تربیت رہ چکا ہوتا ہے۔ اور اذکار کو ایک خاص طرز کے مطابق کر چکا ہوتا ہے۔ تو اس کی طبیعت اس طریقِ تربیت اور نصابِ ذکر سے انسیت و موافقت اختیار کر لیتی ہے۔ اور اس کے باطنی ملکات کی نشو و نما اس نہج پر ہونے لگتی ہے۔ اِس لئے حکیم و محقق شیخ حتی الوسع اس کے معمولات میں تغیر نہیں کرتا، ہاں ضروری تراش خراش اور مزید تربیت اپنی صوابدید کے مطابق سالک کے مناسبِ حال کرتا رہتا ہے۔ اور یہ عالم مذکور تو حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے اپنے شیخ نور اللہ مرقدہٗ

سے ہی تعلق رکھے ہوئے تھے۔ بہر حال ان کے نام حضرت والاؒ کے خطوط کے اقتباسات افادۂ عام کے لئے نقل کرتا ہوں۔

اولاً حضرت والا قدس سرہٗ نے ان سے استفسار فرمایا۔

"حضرت (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف سے تصوف یعنی علم احسان و اخلاص کا مقصود و مدعا تو سمجھ میں آگیا ہوگا۔ یہ اولین چیز ہے بالفعل آپ کے معمولات کیا ہیں؟ آپ نے قصد السبیل[1] ملاحظہ فرمائی ہے۔ آپ اپنے کو چار قسموں میں سے کس قسم میں داخل کرتے ہیں[2]۔"

---

[1] قصد السبیل حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مختصر لیکن سلوک و تصوف کی تعلیمات پر نہایت اہم اور جامع و مانع رسالہ ہے۔ شیخ نے سمندر کو کوزہ میں حقیقتاً بند کر دیا ہے۔ حضرت سید قدس سرہٗ اس رسالہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"قصد السبیل جو پچاس ساٹھ صفحوں کا مختصر رسالہ ہے۔ لیکن اس کوزہ میں دریا بند ہے فن سلوک کے تمام حقائق و تعلیمات جو سالہا سال میں معلوم ہو سکے ہیں۔ اور جن کے نہ جاننے سے سالکین و طالبین غلط راستوں پر پڑ کر منزلِ مقصود کو گم کر دیتے ہیں۔ اس میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اگر کوئی طالب صادق صرف اسی ایک رسالہ کی تعمیل و تکمیل میں عمر صرف کر دے تو اس کے لئے انشاء اللہ کافی و وافی ہے (رسالہ معارف اعظم گڑھ صفحہ ۱۰ ج ۵۳)

[2] حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے سالکین کی سہولت کیلئے مذکورۃ الصدر رسالہ میں طالبین کی چار قسمیں قرار دی ہیں؛

(۱) عامی مشغول۔ (۲) عامی فارغ۔ (۳) عالم مشغول۔ (۴) عالم فارغ

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مولوی صاحب موصوف کا جوابی خط آیا جس میں انہوں نے حضرت تھانویؒ کی تقسیم کے مطابق اپنے کو "مشغول" "عالم مشغول" کے زمرہ میں شمار کیا تھا۔ حضرت والاؒ نے جواباً ارقام فرمایا :-

---

اور ان چاروں قسموں کے جداگانہ معمولات (دستور العمل) مقرر فرماتے ہیں۔ حضرت سیدی رحمہ اللہ تعالیٰ کا اشارہ ان ہی چار قسموں کی طرف ہے ۔ یہاں حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں طالبین کی اس "چارگانہ تقسیم" کا سبب نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، مرشد تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں :

"طرز تعلیم ہر شیخ کا جدا ہے اس کی تفصیل اس رسالہ میں لکھنا ضروری نہیں لیکن ایک مختصر دستور العمل جو کہ غایت نافع ہونے کے اعتبار سے میرے نزدیک **عطر تصوف** کہنے کے قابل ہے جو بہت سی خاک بیزی کے بعد ہاتھ آیا ہے۔ عام طالبین کے لئے عموماً اپنے شیخ کی خدمت میں پہنچنے تک کے واسطے اور اپنے دوستوں کیلئے خصوصاً ہمیشہ کیلئے عمل کرنے کے واسطے ضبط کئے دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے قوی امید کرتا ہوں کہ اس کے موافق عمل کرنے والا محروم نہیں رہے گا۔ پھر اگر کسی کا شیخ اسی کو منظور و جائز رکھے تب تو قصہ سہل ہوا۔ اور اگر اوراد و اذکار اور اشغال کے متعلق کچھ اور تجویز کرے تو اسکے موافق کرنا چاہئے البتہ اس میں جتنے امور شرعاً ضروری ہیں۔ ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بحالہ رہیں گے پس خلاصہ اس دستور العمل کا یہ ہے کہ طالب یا عامی ہے یا عالم اور ہر ایک ان میں سے فکر معاش و حقوق عباد سے فارغ ہے یا مشغول، یہ چار قسمیں طالب کی ہوئیں۔ ایک عامی فارغ، دوسرا عامی مشغول، تیسرا عالم فارغ، چوتھا عالم مشغول ان میں ہر ایک کے لئے ایک ایک دستور العمل خاص ہے ...... "

(قصد السبیل صہ ۱۳، صہ ۱۴ - (دستور العمل کی تفصیلات کیلئے رسالہ مذکور ملاحظہ ہو۔ م - ا)

"آپ اسی میں اپنے کو شامل سمجھیں" حضرت سیدی قدس سرہٗ کی مراد یہ تھی کہ معمولات و اذکار کا جو دستور العمل[۱] حضرت تھانویؒ نے 'عالم مشغول' کے لئے مقرر کیا ہے۔ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

مولوی صاحب نے لکھا۔ "دیگر اوراد مفیدہ بھی معمول میں ہیں"

۱؎ شیخ الکل حضرت تھانویؒ نے "عالم مشغول" کا دستور العمل تعیین فرمایا ہے:

"اوقات فارغہ میں کوئی وقت ایسا جس میں قلب افکار و تشویشات سے کسی قدر خالی ہو اور معدہ نہ پُر ہو۔ نہ بھوک کا تقاضا ہو متعین کر کے اس میں بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) سے چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) تک جس قدر ممکن ہو خلوت میں بیٹھ کر اسم ذات یعنی اللہ اللہ باوضو خفیف جہر و ضرب کے ساتھ قلب کو متوجہ کر کے پڑھا کریں۔ اور تہجد کی پابندی کریں۔ اور کسی وقت قرآن شریف کی تلاوت اور مناجات مقبول کی اصل عربی کی ایک منزل کا التزام رکھیں۔ اور اگر مدرس ہیں فبہا ورنہ ایک معتدبہ وقت تدریس طلبہ علم دین میں ضرور صرف کیا کریں۔ اور گاہ گاہ جب ضرورت دیکھی جاوے ضروری احکام کا وعظ کہہ دیا کریں...... احیاء العلوم وغیرہ مطالعہ میں رکھیں، لیکن شیخ سے دور رہ کر شغل نہ کریں۔ البتہ چندے شیخ کے حضور میں اگر یہ کام کیا ہو۔ اور وہ اب بھی تجویز کرے تو مضائقہ نہیں۔" (قصد السبیل ص۱۷، ص۱۸)

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کا جو جواب لکھا، وہ ہر سالک و ذاکر کے لئے سرمۂ بصیرت ہے، کلکِ سلیمانیؒ گوہر افشاں ہوتا ہے۔

"نفس اوراد کی کثرت غیر ضروری ہے۔ آہستہ چلئے مگر دوامگ چلئے، فائدہ کثرت میں نہیں دوام میں ہے وَاِن قلَّ، مگر اخلاص اور یکسوئی ضروری ہے۔ تاکہ نفع جلد ہو" ......

ان ہی کو مزید تاکید ہوتی ہے

"آپ کیلئے" عالم مشغول" کے اعمال کی تجویز تھی۔ اس سے آگے بڑھنے میں جلدی نہ کیجئے۔ اس میں جو کچھ لکھا ہے۔ اسی کی تقلید کیجئے اس کتاب قصد السبیل کے آخر میں منہیات و اوامر کی تصریح ہے وہ پیش نظر رہے، مقصود حصولِ تقویٰ ہے۔ کہ قرآن پاک ہُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے۔ اور عبادت کا منشا بجا آوری بعد حصول تقویٰ ہے لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ"

ایک اور گرامی نامہ میں انہیں توجہ دلائی کہ :۔

"آپ نے شاید قصد السبیل کو غور سے نہیں پڑھا۔ اس میں عالم مشغول کا جو شغل و ذکر اور کام بتایا گیا ہے۔ اس کی پوری تقلید کیجئے اور کتاب مذکور کو بار بار پڑھیئے۔ تاکہ سلوک کی حقیقت آپ پوری طرح سمجھ جائیں۔"

ایک دوسرے خط میں ارقام فرماتے ہیں :

"ذکر اللہ اللہ آپ کس وقت اور کس قدر کرتے ہیں۔ جو تعداد ہو۔ اس پر مداومت کی جاتے اور یکسوئی کے ساتھ یہ تصور کیا جائے کہ نور

کا نزول ہو رہا ہے۔ اور یہ بھی لکھیں کہ دل پر کیا احوال وارد ہوتے ہیں۔ ورود واحوال ضروری نہیں، مگر اگر ورود ہو تو لکھیں۔ لیکن نہ اس ورود واحوال کی کوشش کریں کہ یہ مقصود نہیں اور نہ اس غرض سے اس کی طرف توجہ کریں۔ کہ یہ فساد نیت کا باعث ہوگا......

نفی واثبات کا ذکر قبل از وقت ہے۔ قصد السبیل میں اس کی ہدایت آپ دیکھیں۔"

ان کا جواب آیا کہ "اسم ذات کا ذکر قلیل تعداد میں گاہے گاہے کیا کرتا ہوں...."

حضرت والا رحمہ اللہ نے جواباً تحریر فرمایا،

"اس کی ضرورت ہے کہ وقت معین کر کے پوری توجہ کے ساتھ اسم ذات کی معین مقدار کا ایک نشست میں یا متعدد نشستوں میں حسب سہولت ایسی آواز سے جو سُنی جا سکے بغیر ضرب کے ذکر کریں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ تعداد ۲۴ ہزار اور کم سے کم تین ہزار ہے۔ آپ کم سے کم شروع کر کے حسب ذوق و توفیق جس قدر پہنچا سکیں۔"

مولوی صاحب نے حضرت والاؒ کے ارشاد گرامی کے مطابق ذکر کرنے کے کچھ عرصہ بعد لکھا کہ :-

"ارشادات عالیہ پر بدستور سابق عمل پیرا ہوں، لیکن ہفتہ عشرہ سے رقت و گریہ اس شدت سے طاری ہے کہ مسجد میں مقتدیوں کے سامنے اور امامت کے دوران میں اپنے پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ بعض اوقات بے اختیار دوران امامت میں اللہ اللہ جاری ہوگیا....

اب رمضان کی وجہ سے کثرتِ تلاوت کے باعث گاہے ذکر کا ناغہ کرنا پڑے گا۔"

مشفق و حکیم شیخؒ نے جواباً ارقام فرمایا :

"آپ نے جو حال لکھا ہے۔ مبارک ہے۔ اضطراب بھی انشاء اللہ مبدل بہ سکون ہو جائے گا۔ خاکسار نے کبھی کہا تھا ؎

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکون عشق کی
ہائے ہوئے جوش تو ہنگامہ آغاز ہے

اگر آپ کی حالت نماز میں ایسی ہو جو ضبط سے باہر تو چندے امامت سے باز رہیں ..... بے شبہ رمضان المبارک میں آپ کو امامت تراویح کے لئے تلاوت میں زیادہ مصروفیت ہو گی تو ذکر کم کر دیں، مگر ترک نہ کریں، ذکر بالقلب نماز میں حارج نہیں باللسان سے احتیاط کرنی چاہیئے اصل شے نماز میں حضور اور خشوع ظاہری و باطنی ہے ....

اس (نام حق میں حلاوت ملنے) پر خدا کا شکر ادا کیجئے، یہ بڑی نعمت ہے۔

تیرے نام ہی میں جو حلاوت ملے   تو سارے غموں سے فراغت ملے"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ان ہی کو ارقام فرماتے ہیں :-

"...... اب اس (اولاد و معاش کی طرف سے) طمانیت کو ذکر و طاعت میں صرف کیجئے کہ اسکا شکر یہی ہے۔ جوش و خروش کی کمی کی فکر نہ کیجئے کام میں لگے رہیئے اور اپنی اصلاح و تربیت کی دھن میں

لگے رہیئے تاآنکہ اللہ کے سوا دل سے ہر چیز کی محبت فنا ہوجائے اور
لا الہ الا اللہ کی تکمیل ہوجائے ..... (اس لئے) اذکار کی تعداد میں
اضافہ فرمالیجئے۔ نوعیت میں تبدیلی کی ضرورت نہیں"

دوسرے مکتوبات میں ان ہی کو تحریر فرماتے ہیں،

"وظائف کی کثرت کا شوق بیکار ہے۔ غرض صحت ہے نہ کہ نسخوں کی کثرت اور یاد وہ ایک نسخہ سے بھی حاصل ہوجاتی ہے.... کسی نئی چیز کی حاجت نہیں، سبق کا بار بار رٹنا ہی کامیابی کا موجب ہے (اس لئے) ہر حال میں ذکر لساناً وقلباً جاری رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو"

ماسوا سے بے نیازی کیلئے لا الہ الا اللہ کا ذکر ومراقبہ اس کے معنیٰ کے استحضار کے ساتھ کافی ہے (غیر اللہ سے بے خوفی) کیلئے بھی یہی ذکر کافی ہے اس کے معنیٰ کا استحضار چاہیئے ..... اس کی کثرت غفلت کو دور کردیتی ہے (اسلئے دوام ذکر اور عدم غفلت کیلئے) بھی یہی ذکر ہے۔"

مولوی صاحب مذکور نے لکھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ باایں ہمہ مشغولی معمولاتِ شبانہ روز میں کوئی فرق نہیں ہوا۔"

حضرت الشیخ قدس سرہٗ نے ہمت بڑھاتے ہوئے حکیمانہ جواب دیا،

"بحمد اللہ تعالیٰ، آپ کو استقامت پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اب تو زندگی کے آخیر لمحہ تک یہ استقامت قائم رکھنا ہے توفّنی

مُسْلِماً وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ کی دُعا چاہیئے ....

اپنی تکمیل اور اصلاح سے کبھی غفلت نہ برتیں۔ ہم ہر حالت میں

ناقص ہیں۔ یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہو۔ ذکر کا مقصود یہی ہے

بدعات و رسوم سے احتراز رہے"

آخری مکتوب میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ مولوی صاحب موصوف کو

ارقام فرماتے ہیں :۔

"آپ کا لفافہ ملا ، حالات سے واقفیت ہوئی، سن کر خوشی

ہوئی۔ کہ معمولات پر استقامت نصیب ہے ۔ مبارک ،

الاستقامۃ فوق الکرامۃ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں قُل ربی اللہ

ثم استقم ، استقامت سلوک کی اصل کلید ہے۔

عوارض کی وجہ سے کمی باعث افسوس نہیں، وہ کمی افسوس کے قابل

ہے۔ جو غفلت اپنی ارادی کوتاہی کے باعث ہو ،

ابتدائی جوش و شوق میں کمی ہے (یہ) فطری ہے۔ یہ مرحلۂ زندگی میں

پیش آتا ہے ، یہ کوئی افسوس کی چیز نہیں، جوش و شوق ہو یا نہ ہو، عمل میں

کوتاہی نہ ہونے پائے۔ جس طرح آغاز شباب میں عروس نو کے ساتھ

جو شوق و جوشِ طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہ تمکین سے بدل جاتا ہے

اور بجائے بوالہوسی کے دیرینہ محبت دباہمی وفاداری اس کی جگہ لے

لیتی ہے ۔

میرا ایک شعر ہے :۔

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکون عشق کی

ہائے سوئے جوش تو ہنگامہ آغاز ہے،

مولوی صاحب موصوف کے نام حضرت الشیخ قدس سرہ کی ان تحریروں کے بنظر غائر مطالعہ سے حضرت والاؒ کا تلقین اذکار' میں مسلک، تدریجی تربیت طالبین پر شفقت اور حذاقت فن اور مہارتِ طریق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

کثرت و تعدّد

اوراد و وظائف میں نہیں

بعض حضرات اوراد و وظائف کی کثرت کے شوق میں "مجموعۂ وظائف" بن جاتے ہیں، اِس بارے میں مسلکِ سلیمانیؒ انتہائی معتدل، واضح اور درمیانہ روی کا حامل تھا

ایک ندوی فاضل نے (جو اوراد و اذکار کے دلدادہ تھے) حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا۔ حضرت الشیخؒ نے ان کے معمولات معلوم کرنے کے بعد ان میں جو حذف و ترمیم کی وہ "اوراد و وظائف" کا مجموعہ بن جانیوالے ذاکرین کیلئے سامانِ بصیرت ہے۔ وضاحت کیلئے حضرت والاؒ اور فاضل مذکور کے خط کا متعلقہ حصہ بعینہٖ نقل کرتا ہوں۔

جواب حضرت الشیخ نور اللہ مرقدہٗ	مکتوبِ فاضل مذکور
. . . .	. . . .
. . . .	معمولات

بن جاتے ہیں یا بنائے جاتے ہیں اس بارے میں مسلکِ سلیمانیؒ

مکتوب فاضل مذکور

معمولات

(۱) تہجد کی نماز کے لئے عموماً ۲ بجے اٹھتا ہوں

(۲) تہجد کے بعد ۱۲ تسبیح پڑھتا ہوں۔ پھر مناجات مقبول کی ایک منزل، سورۂ یٰسین، الرحمٰن، المزمل، الکہف، الملک، صلوٰۃ وسلام، درود تاج، اسمائے حسنیٰ، دعائے گنج العرش، حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء کی تلاوت اور چند آیات کو حفظ کر لیتا ہوں، اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔

جواب حضرت الشیخ نور اللہ مرقدہٗ

. . . .

(۱) صبح صادق سے گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے اٹھنا کافی ہے آپ اپنے یہاں کے اوقات سے اندازہ لگالیں، صبح اٹھنے کے لئے رات کو سویرے بعد عشا سونا لازم ہے تاکہ صحت پر اثر نہ پڑے۔

(۲) یہ بہت زیادہ ہے، تہجد کے بعد بارہ تسبیح کافی ہے۔ وقت اس سے زیادہ نہیں مل سکتا، وقت ملے تو درود وسلام مختصر پڑھیں، درود تاج اور دعائے گنج العرش اور اسمائے نبویؐ کی تلاوت معمول سے خارج کر دیجئے۔

ان سورتوں کی اس طرح تلاوت سے بہتر یہ ہے کہ روزانہ نمازِ صبح کے بعد ایک پارہ قرآن پاک بہ ترتیب پڑھیں اور اس کے بعد مناجاتِ مقبول کا ایک جز

(۳) ہر فرض کے بعد کَشَفۡنَا عَنۡكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الۡيَوۡمَ حَدِيۡدٌ تین بار پڑھ کر انگشت شہادت پر دم کرنے کے بعد آنکھوں میں اپنی انگلیوں کو پھیر لیتا ہوں صرف صبح کی نماز کے بعد سینہ پر دونوں ہاتھ رکھکر الفتاح ۷۱ بار پڑھتا ہوں اَللّٰهُ لَطِيۡفٌ بِعِبَادِهٖ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَاءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ۷ بار، قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الۡمُلۡكِ ...... بِغَيۡرِ حِسَابٍ اسکے بعد سات بار

(۴) ہر فرض نماز کے بعد الولی، النور، القوی، الودود، الوھاب، الرحمان، الرحیم، الرزاق۔ ۷، ۷ بار یا عزیز یا مجیب ۴۱، ۴۱ بار پڑھنے کا معمول ہے پھر سبحان اللہ، الحمد للہ ۳۳، ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھتا ہوں

(۵) پانچوں وقتوں کی نماز کی فراغت کے بعد لا الہ الا اللہ، سبحان اللہ الحمد للہ، اللہ اکبر سو سو مرتبہ

(۳) ع ۵ اگر تبرکاً نور بصر کے قیام و افزائش کے لئے کرتے ہیں تو خیر ورنہ اوراد مسنونہ میں یہ نہیں ہے۔

اسی طرح صبح کی نماز کے بعد الفتاح کا پڑھنا کس غرض سے ہے یہ بھی خارج کریں۔ اللہ لطیف الخ تک پڑھ سکتے ہیں

(۴) ان سب کو موقوف کریں، تحمل کے مطابق کام کرنا چاہیئے

البتہ عصر و صبح کے بعد سبحان اللہ ۳۳ الحمد للہ ۳۳، اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھا کریں

(۵) اِس کو روزانہ ہر نماز کے وقت تسبیح پر پڑھ لیا کریں۔

پڑھتا ہوں۔

اس کے بعد اپنے گھر والوں کو قرآن پاک ناظرہ صحت و تجوید کے ساتھ مشق کراتا ہوں۔	مناسب ہے
اس کے بعد اشراق کی نماز پڑھتا ہوں۔	اشراق ضرور پڑھیں
ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ پھر سو رہتا ہوں۔	نیند کا غلبہ ہو تو سو سکتے ہیں۔ مگر بہتر وقت اس کے لئے قیلولہ کا وقت ہے
اٹھنے کے بعد چاشت کی نماز پڑھتا ہوں۔	چاشت کی نماز پڑھا کریں۔
اس کے بعد مولوی انوار احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں چلا جاتا ہوں۔	صالحین کی صحبت مفید ہے۔
کچھ دیر دینی باتیں سن کر پریس آتا ہوں۔ پریس کے کاموں میں مشغول رہتا ہوں۔ پاس انفاس صلی اللہ علیہ وسلم جاری رکھتا ہوں۔	پریس کے کاموں کو پوری مستعدی سے انجام دیا کریں۔ کیونکہ طلب رزق حلال واجب ہے۔ پاس انفاس صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتا کیا چیز ہے۔ بہرحال یہ ہمارے ہاں مروج نہیں۔ اسکو موقوف کریں، پاسِ انفاس یہ ہے کہ کوئی

ظہر کے بعد وہی وظائف ہیں جو اوپر لکھ چکا ہوں۔ البتہ ظہر کی نماز کے بعد کلام مجید کا ناظرہ پاؤ پارہ، نصف پارہ یا ایک پارہ پڑھ لیتا ہوں

عصر کی نماز کے بعد بھی وہی وظائف ہیں۔

مغرب کی نماز کے بعد ان وظائف و اوراد کے علاوہ اول و آخر گیارہ مرتبہ درود شریف اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ایک سو مرتبہ پڑھتا ہوں۔ الباعث (۱۰۰) البدیع (۱۰۰) الخافض (۱۰۰) یا مغنی (۱۰۰) اور اوابین بھی پڑھتا ہوں۔

(اوابین کے بعد اپنے گھر والوں

سانس اللہ کے ذکر سے خالی نہ ہو اور اس کے لئے اللہ کافی ہے۔

ظہر کے بعد تلاوت کا مضائقہ نہیں اگر صبح کو نہ ہو سکے، وظائف کی کثرت کوئی مفید چیز نہیں، اعتدال سے کام کرنا چاہیئے

عصر کے بعد تسبیح سبحان اللہ و الحمد للہ، اللہ اکبر، پر کفایت کیجئے۔

مغرب کے بعد اوابین پر قناعت کیجئے۔

...... یہ اوراد کی کثرت کس غرض سے ہے۔ اور یہ مختلف اسمائے حسنیٰ کا انتخاب کس اصول پر کیا گیا ہے۔ تشتت اسماء سے انتشار پیدا ہوتا ہے۔ ایک اللہ کا نام کافی ہے۔ اور سب چھوڑ دیں

کو بٹھا کر حضرت تھانویؒ کے مواعظ پڑھکر سناتا ہوں اور ان دنوں بیان القرآن پڑھکر سناتا ہوں یہ سلسلہ عشا تک رہتا ہے۔

یہ بہت مناسب ہے۔

عشا کی نماز میں بھی وہی وظائف رہتے ہیں۔ صرف ان وظائف کا مزید اضافہ کر دیتا ہوں، درود شریف اول و آخر سو سو مرتبہ اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ پانسو مرتبہ اور استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ سو مرتبہ الخالق سو مرتبہ۔

عشاء کی نماز کے بعد سو دفعہ استغفار کر کے سونے کے وقت کی دُعائے مسنون پڑھ کر سو رہیئے۔

اِس کے بعد کھانا کھا کر سو رہتا ہوں یا کبھی کبھار دین کی باتیں اپنے گھر والوں سے کرتا ہوں۔ یا کبھی مولوی انوار احمد صاحب کے پاس آدھ گھنٹہ کے لئے دین کی باتیں سُننے چلا جاتا ہوں ...... "

عشاء کے بعد کھانے اور سونے کے علاوہ مجلس نہ کریں تو بہتر ہے۔

مندرجۂ بالا طویل اقتباس اور حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ متعدد وظائف کی بے طریقہ کثرت مفید نہیں۔ بلکہ بسا اوقات انتشار ذہنی، تشتت قلبی، پراگندگی فکر کا سبب بن جاتی ہے۔ اور اگر کوئی شیخ کامل میسر نہ آئے تو یہی کثرت دل و دماغ پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔ اس لئے بقول حضرت والا قدس سرہٗ؛

"نفس اوراد کی کثرت غیر ضروری ہے۔ آہستہ چلئے مگر دواماً چلئے" فائدہ کثرت میں نہیں دوام میں ہے۔ و اِن قلّ مگر اخلاص و یکسوئی ضروری ہے تاکہ نفع جلد ہو"

مراتبِ ذکر

گذر چکا۔ کہ یادِ قلبی، اصل ذکر ہے، اور رفتہ رفتہ وہ اپنی وسعت میں پوری زندگی کو گھیر لیتی ہے۔ 'حقیقت ذکر' کی سچی یافت و تحقق' اور اس کے زندگی کے ریشے ریشے[1] میں سرایت کر جانے کیلئے ایک مدت چاہیئے' ؎

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ درد جگر کہاں

'بدایت ذکر' اور 'نہایتِ ذکر' کے درمیان بے شمار مدارج و مراتب ہیں۔ ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست
آنکہ بروے می رسی بروے مایست

آسانی و قرب فہم کے لئے ذاکرین کی عموماً تین درجوں میں تقسیم کر دی

---

[1] اقبال مرحوم کا شعر ہے:- آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
جیسے شاخ گل میں ہے باد سحر گاہی کا نم

جاتی ہے۔

(۱) مبتدی۔ (۲) متوسط (۳) منتہی

ورنہ ہر درجہ اپنے اندر 'مدارج' رکھتا ہے خصوصاً منتہی تو متعارف 'وصول' کے بعد بھی ذکر کے لامتناہی منازل میں سیر کناں رہتا ہے، ؎

ہر لحظہ نشانِ حسن بدلتی رہی جگر
ہر آن اک جہان دگر دیکھتے رہے
نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ مے بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

مبتدی کیلئے 'اسم' کی یاد و تکرار ہی 'ذکر' ہے۔ متوسط عموماً قلبی دھیان سے الفاظ ذکر اور اس کے معانی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ منتہی ذات بحت میں ایک 'خاص لطافت' کے ساتھ قلباً مشغول رہتا ہے جس کا ادراک بھی "چون وچگون" اور گفتنی حدود' سے وراء الوراء ہے۔ کہ اصل تنزیہہ محض ہے۔ حضرت سیدی الشیخ نور اللہ مرقدہ کا شعر ہے ؎

آتے ہو تصور میں بھر بھر کے نئے روپ
ان سب سے سوا سمجھیں تم کو تو یہ ایمان ہے

عارف رومی نے خوب کہا ہے۔ ؎

اے بروں از وہم وقال وقیل من خاک بر فرقِ من وتمثیل من

شیخ شیرازؒ نے کیا عارفانہ بات کہی ہے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

خسروؒ کہتے ہیں:

اے بازکن در معانی　　بر ما بکلید آسمانی
ہرچہ از تو گمان برم بجوئی　　آن من بوم و تو زآں برونی

حقیقت یہی ہے کہ وہ ذاتِ بے ہمتا ہر کیف و تصور سے بالا ہے بقول سیّدی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ادب سے دیکھ لیں مشتاق دور سے ان کو
مجال ہے جو انہیں کوئی ہمکنار کرے

اب 'منتہی حضرات' کے دھیان د توجہ حق کے متعلق یہی کہا جائیگا۔ کہ یہ 'وجدانی و ذوقی' کیفیت ہے۔ اور ذوقی کیفیات' کا قلم متحمل بھی نہیں ہو سکتا۔ اور بقول شیخ الکل مرشد (تھانوی) نور اللہ مرقدہٗ

"امور وجدانیہ وجدان سے ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ اور وجدان محض سننے دیا پڑھنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست　　گفتم چوں ما شوی بدانی

حضرت والاؒ ذکر میں اصل توجہ مذکور کی طرف قرار دیتے ہیں۔
یہ نہ ہو تو ذکر میں انتشار ذہنی کے دور کرنے کیلئے' ذاکر یعنی 'قلب' کی طرف اور یہ بھی نہ ہو تو ذکر کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین فرماتے تھے۔ ایک مکتوب میں تحریر

فرماتے ہیں۔

"ذات کی طرف توجہ اصل ہے۔ اگر اس حالت میں معانیٔ الفاظ کا استحضار نہ رہے۔ تو کوئی حرج نہیں۔ اصل توجہ مذکور کیطرف ہونی چاہیئے۔ یہ نہ ہو تو ذکر کی طرف"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں مزید وضاحت فرماتے ہیں:

"ذکر سے اصل مقصود تو مذکور یعنی 'اللہ' کا استحضار ہے۔ یہ نہ ہو تو ذاکر یعنی قلب کا، یہ بھی نہ ہو تو ذکر کا"

ایک اور طالب کو تحریر فرماتے ہیں:

"نور کے تصور کا استحضار نہیں ہوتا تو کوئی حرج نہیں، یہ مقصود خود نہیں، مقصود تو یکسوئی ہے، توجہ ذکر کے وقت دراصل مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، ورنہ ذاکر یعنی قلب کی طرف ہو، ورنہ ذکر کی طرف ہو'

ایک مسترشد نے اپنی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا، "ذکر کے وقت اکثر حضور حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے بعض مرتبہ گمان ہوتا ہے۔ کہ اس طرح زبان سے اللہ اللہ کہے جانے سے کیا حاصل ہے.... لیکن جب کبھی صبح کسی وجہ سے ذکر ناغہ ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک ذکر پورا نہ کرلیا جائے ..... اس کا رنج ہے کہ ذکر میں جو استغراق پیدا ہونا چاہیئے بالکل حاصل نہیں (ملخصاً)

حضرۃ اشیخ قدس سرہٗ نے جواب باصواب رقم فرمایا،

"ابھی تک آپکی سمجھ میں ذکر کی حقیقت نہیں آئی، اس سے مقصود محبّتِ الٰہی کی ترقی ہے۔ "استغراق" اور "حضور" دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ "استغراق" تو اسکا نام ہے۔ کہ انسان کا شعور باطل ہوجائے بوجہ شدت انہماک کے تو یہ مطلوب و ممدوح نہیں، البتہ "حضور" مطلوب اور ممدوح ہے وہ اسکا نام ہے کہ فی الجملہ ذکر میں مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کا استحضار ہو یا قلب کی طرف توجہ ہو یا خود ذکر کی طرف دھیان ہو۔ ان میں جو بات جس وقت اور جتنی حاصل ہوجائے وہ شکر کے قابل ہے۔ کیونکہ وہ عطائے الٰہی ہے۔ اختیاری نہیں" (تذکرہ سلیمان ص۴۲۹)

ان ہی نے ایک دوسرے عریضہ میں بعض صورتوں میں لفظ 'اللہ' کے 'الف' کی ادائیگی میں دقت اور بعض دیگر مشکلات کا تذکرہ کیا۔

حضرت والا رحمۃ اللہ نے جواباً تحریر فرمایا:

"آپ ان مشکلات اور دقتوں کی پرواہ نہ کیجئے۔ نہ ذکر کے اندر ان لفظوں پر دھیان دیجئے۔ آپ مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کا تصور کریں، بشکل نور، خواہ قلب میں لفظ "اللہ" کا نورانی تصور، تلفظ اپنی کوشش بھر صحیح ہو، پھر جو کچھ ادا ہوتا ہے وہ صحیح ہے"۔ (تذکرہ ص۴۲۷)

مسترشد موصوف نے استفسار کیا۔ "حق تعالیٰ کی ذات تو وراء الوراء ہے پھر ذکر کے وقت ذات کا تصور کس طرح کیا جائے؟" حضرت والا نے ارقام فرمایا:

"تصور ذات کا نہیں ہوتا، اس کی صفات کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

کے اسمائے حسنیٰ کا تصور کیجئے۔ نورانیت کا تصور بھی اس کی
صفت ہی کا تصور ہے"

اگر کسی سالک کو یہ کیفیت میسر آجائے کہ زبان و دل کے اشتراک کیساتھ متوجہ بحق ہوکر ذکر کرسکے تو نور" علی نور ہے۔ کہ اسطرح جملہ' افراد ذکر، ذکرِ لسانی توجہ قلبی اور استحضارِ ربانی مجتمع ہوجائیں گے۔ ــــ

مراد یہ ہے کہ زبان الفاظِ ذکر معانی کے استحضار کے ساتھ اسطرح ادا کرے کہ جس وقت لفظِ ذکر زبان سے ادا ہو، اسی وقت "زبان و قلب کا اشتراک و یکجائی" ایسی ہو، کہ وہی لفظ "دل" سے بھی سن رہا ہو۔ اور ادائیگی کے وقت دھیان ذات الٰہی کی طرف ہو، ایک ہی وقت میں ان مختلف باتوں کا " اجتماع " ایک مثال سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ استاد کی فرمائش پر جب کوئی متعلم قرآن کریم کا ترجمہ الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ سنا رہا ہو تو ایک ہی وقت میں اسے چند باتوں کا خیال ہوتا ہے۔ معلّم کی موجودگی اور اس کی رویت و سماعت کا استحضار، تلفظ کا صحیح ادا کرنا' اور معنی کیطرف دھیان کہ ترجمہ میں غلطی نہ ہوجائے، اس کے علاوہ یہ بھی ذہن میں ہوتا ہے کہ اگر قرأت و ترجمہ درست ہوا۔ تو استاد خوش ہوکر انعام سے نوازے گا، اور غلطی ہوجانے پر استاد کی ناراضگی اور سزا کا ڈر ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر سالک قربت و معیّت اور رویت و سماعتِ رحمانی کے استحضار، اجابت و قبولیت الٰہی کے یقین و اذعان اور رضاء و عطائے ربانی کی طلب و امید میں محبت و شوق میں ڈوب کر اللہ تبارک و تعالیٰ کا حق اور

فریضہ عبدیت سمجھ کر رغبتہً و رہبتہً، ایماناً و احتساباً ذکرِ لسانی قلب کے اشتراک و دھیان کے ساتھ کرتا رہیگا۔ تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس ذکر کی برکات سے اس کے سینہ و قلب کو پر انوار اور اس کے اعضاء و جوارح کو احکام ﷺ کا تابع و منقاد بنا دے گا، آخرت میں انعامات و رضوانِ الٰہیہ کا حصول تو یقیناً ہو کر رہے گا کہ مقصود اصلاً وہی ہے۔ اس دنیا میں بھی اللہ چاہے تو عطائے ربّانی کا نظارہ اپنے اندر کا لعین مشاہد ہو جائیگا۔ توحیدِ خالص، اتباعِ نبوتِ عظمیٰ، عبدیت و عبودیتِ کاملہ، مقاماتِ عالیہ، اخلاق فاضلہ، حیاتِ طیبہ، استقامت علی الحق، فراستِ ایمانی، بصیرتِ قلبی، عقائد دینیہ کی حلاوت و یقین اور اعمال صالحہ کیساتھ دلی و طبعی مناسبت و محبت و خشیت وغیرہا، انعامات الٰہیہ کی ایسی دولت نصیب ہوگی جس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گرد کی حیثیت نہیں رکھتی۔ انہیں باطنی انعامات سے مالا مال ایک مردِ درویش (سیدنا حضرت عبد القادر جیلانی نور اللہ مرقدہ) نے اپنی کیفیت باطنی کا ایک ہلکا سا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

چوں چترِ سنجری رخ بختم سیاہ باد　　　در دل بود اگر ہوس ملکِ سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب　　　من ملکِ نیم روز بیک جو نمی خرم

اس کے علاوہ حکمتِ الٰہیہ نے اگر مناسب سمجھا۔ تو علوم و معارف احسانیہ، دقائقِ تشریعیہ، حقائق کونیہ کا قلب پر ایسا ورود و القا ہوگا۔ جس کے متعلق حضرت عارف رومی نے کہا ہے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

حضرت والا نوراللہ مرقدہٗ ایک طالب کو انہی انعامات الٰہیہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں،

"جو کچھ اللہ تعالیٰ سے ملا۔ اس کا شکر ادا کیا جائے اور جو اب تک نہیں ملا اللہ تعالیٰ سے امید رکھنی چاہیئے کہ وہ مناسب موقع پر اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائیں گے ... جس قدر حضور بھی نصیب ہو۔ وہ شکر کے قابل ہے ... یہ علوم و اسرار کتاب و سنت کے مطابق ہوں تو بہتر ہیں اور اگر مطابق نہ ہوں تو قابل رد ہیں۔"

ان ہی کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"دائم حضوری بھی انشاء اللہ کبھی حاصل ہو گی لیکن اس وقت بھی جو کچھ حاصل ہو جاتی ہے۔ شکریہ کے قابل ہے شکریہ سے نعمت کی زیادتی ہوتی ہے"

ایک اور طالب کو ہدایت فرماتے ہیں:

ان کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت نہیں، اور نہ اس کیلئے تشویش خاطر کی ضرورت ہے ہر چیز اپنے وقت پر حسب استعداد اللہ تعالیٰ عطا فرمائینگے[1] ... ایک اصول نہایت اہم سمجھ لیجئے امور اختیاریہ میں بندہ کمی نہ کرے اور غیر اختیاریہ کے درپے نہ ہو، تمنا ہو، تو صاحب تمنا کے سامنے پیش کیجئے[2]۔ وہ جو چاہیں گے اور جب چاہیں گے دینگے[3]۔ اور اگر مدت تک نہ بھی ملے تو اس کیلئے تشویش نہ کیجئے کہ ؎ "خواجہ خود روش بندہ پروری داند"

---

[1] آہی جائیگا کبھی اس تک بھی ساقی دور جام منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تیری محفل میں ہے (سید صاحب)

[2] سنا تو دے اسے افسانہ غم ہجراں وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے (〃〃)

[3] انہیں کے دینے سے ملتا ہے جسکو ملتا ہے وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے (〃〃)

ذکرِ قلبی

ذاکر جب "زبان وقلب کے اشتراک" سے کثرت کیساتھ ذکرالٰہی کرتا رہتا ہے تو "قلب" میں "حدیثِ نفس" کے طور پر ذکرالٰہی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور توجہ سے "ذکر" محسوس ہوتا ہے۔ اصطلاحاً اِسے "ذکرقلبی" کہتے ہیں۔ دعائے ماثورہ ہے:- اللھم اجعل وساوس قلبی خشیتك وذکرك

"یعنی اے اللہ میرے دل کے وسوسوں کو بھی اپنا ڈر اور یاد بنا دے"

گویا جیسا عامۃ الناس کے وساوس "غفلت الٰہی" سے ناشی ہوتے اسی طرح ایسے قلوب بھی ہیں، جن کے "قلب کے وساوس" "ذکر وخشیت رب" بن جاتے ہیں۔ "وسوسۂ قلبی" کی اس یاد وخشیت بن جانے کی کیفیت کو ہم "ذکرقلبی" کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں۔ اور کیونکہ خشیت الٰہی مطلوبہ وہی ہے جو معاصی سے روک دے تو مطلوب ذکر قلبی بھی وہی ہوگا۔ جو معاصی سے اجتناب کا سبب بن جائے۔

اے:۔ دعائے ماثورہ ہے:- اللھم اقسم لنا من خشیتك ما تحول بہ بیننا و بین معاصیك (مشکوٰۃ ص۲۱۹ بحوالہ الترمذی) (اے اللہ ہمارے لئے اپنی وہ خشیت مقدر فرما جو ہمارے اور ہمارے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے۔

ایک مسترشد نے حضرۃ الشیخؒ سے استفسار کیا کہ "قلب کے ذاکر ہونے کی کیا تدبیر ہے۔"

حضرت سیدی الامام نور اللہ مرقدہ نے جواب تحریر فرمایا:

"قلب کا ذاکر ہونا کوئی فن کی اصطلاح نہیں۔ کثرت ذکر سے قلب میں ذکر لفظ اللہ ھو یا لا الہ الا اللہ یا کوئی اور مرکوز ہو کر حدیث نفس کے طور پر جاری ہو جاتا ہے۔ جو ارادہ کے بغیر بھی قائم رہتا ہے۔ بلکہ اسکا استحضار بھی نہیں رہتا، کہ ذکر جاری ہے۔ بہر حال اسکا طریق صرف کثرتِ ذکر، توجہ تام ہے۔ اور یہ کوئی مشکل نہیں، ذکر کے اثر کا ظہور یہی ہے۔ کہ طاعات و مرضیات الٰہی کے اتباع کا ذوق بڑھے اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہر حال میں ہو۔"

ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اس (ذکر قلبی) کا طریقہ یہی ہے کہ کثرتِ ذکر کی کوشش کیجائے۔"

ایک اور طالب کو ارقام فرمایا:

"ذکر لسانی کی کثرت سے ذکر قلبی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

انہی کو تحریر فرمایا:

"یہی (اسم ذات کا .... ہزار دفعہ ذکر) کافی ہے۔ اس سے ذکر قلبی کی کشائش ہو جاتی ہے۔"

"جذرِ قلوب" میں ایک لطیفہ ہے۔ جو امانت الٰہی[1] کا مورد اور فطرتاً مشتاق ربانی اور جویائے 'قرب و یادِ الٰہی' ہے۔ اس کی تسکین و تسلی صرف ذکر حق سے

---

[1] ان الامانۃ نزلت فی جذر قلوب الرجال (الحدیث بخاری و مسلم)

ہوتی ہے۔ جب توجہِ باطنی سے ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ تو یہ لطیفہ زندہ ہو کر مشغول بیادِ الٰہی ہو جاتا ہے۔ اسی "لطیفہ" کی یہ "مشغولیت بذکرِ خاص" ذکرِ قلبی کہلاتی ہے۔ اور یہ 'ذکرِ خاص' عادتاً وہی ہوتا ہے جسے ذاکر کثرت سے کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اصلِ قلب میں جڑ پکڑ جاتا ہے۔ یہ 'لطیفہ' قرآن و حدیث سے بھی ثابت ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ارقام فرماتے ہیں۔

"(لطائف ستہ) حدیث و قرآن سے ثابت نہیں۔ حدیث و قرآن سے صرف لطیفہ قلب ثابت ہے، قرآن پاک میں "قلب منیب" اور 'قلب سلیم' کا ذکر آتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے وہ ٹھیک ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ 'الا وھی القلب' اس لئے حاجی صاحب رحمہ اللہ کے سلسلے میں سارا زور قلب کے تزکیہ پر ہے"

یہ 'ذکرِ قلبی' گو مامور بہ اور وجہ تسکینِ قلب ہے لیکن اشتغال اور ذہنی مشغولیت میں 'ذہول' کا بھی اندیشہ ہے۔ اسلئے 'ذکرِ قلبی' کے ساتھ" ذکرِ لسانی کا اقتران بھی ضروری ہے۔ کہ اگر بالفرض 'ذکرِ قلبی' کا ذہول ہو جائے تو 'ذکرِ لسانی' کی برکت سے تو انسان محروم نہ رہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اصل ارادہ اور زبان سے ذکر کرنا ہے۔ تاکہ ذاکر اس خیال سے کہ ذکرِ قلبی جاری ہے۔ ذہول میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ نئے ارادہ کے ثواب سے محروم نہ رہے۔"

"ذکرِ قلبی" کیونکہ بغیر حرکتِ لسان ہوتا ہے۔ اس لئے نماز میں بھی حارج نہیں
حضرت والا ایک سالک کو جس پر "غلبۂ ذکر" کا حال طاری تھا۔ ارقام فرماتے ہیں،
"ذکر بالقلب نماز میں حارج نہیں باللسان سے احتیاط کرنی چاہیئے"

دوامِ ذکر ایک طالب کو جنہیں حق تعالیٰ نے بفضلہٖ دوامِ ذکر کی نعمت عطا فرمائی۔ حضرت والا مختلف مکتوبات میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"ہر وقت ذکر کی مصروفیت یعنی دوامِ ذکرِ قلب بڑی نعمت ہے۔ جو آپ کو مل رہی ہے۔ اس کو جاری رکھئے۔"

"یہ بھی ذہن میں رہے کہ کشف والہام وغیرہ محض محمود ہیں۔ مقصود نہیں۔ ان باتوں کو قربِ الٰہی میں کوئی دخل نہیں ـــ قربِ الٰہی صرف ایمان اور عمل صالحہ کا نتیجہ ہے۔ اس لئے دوامِ ذکر اور کثرتِ اعمالِ صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیئے۔"

اِن ہی کو تاکید کرتے ہیں:

"کیفیات و احوال کی طرف توجہ نہ کیجئے۔ اور صرف حسن عمل اور کثرتِ ذکر کی طرف توجہ رکھئے۔"

پاسِ انفاس دوامِ ذکر کی ایک نوعیت پاس انفاس ہے۔ کہ کوئی سانس یادِ الٰہی سے خالی نہ جائے

یہ بھی 'کثرتِ ذکر' کی مخصوص صورت سے میسّر آتا ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ سالک "ہر سانس" کو اس توجہ سے لے کر اس سانس کے ساتھ "اللہ اللہ" یا 'اللہ ھو' یا 'لا الٰہ الا اللہ' جاری ہے۔ زبان کا تلفظ نہ ہو "ذکرِ قلبی" ہو

اور دھیان یہ ہو کہ ہر "تارِ نفس" کے ساتھ 'ذکر' کی آمد و رفت ہے۔
کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

نوائے صبحگاہی نے جگر خون کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے
اگر میں کیمیا گر ہوں تو میری کیمیا کیا ہے
یہی تارِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے

ایک سالک نے حضرت والا سے "پاس انفاس" اور اس کے فائدہ کے متعلق پوچھا حضرت الشیخ نور اللہ مرقدہ نے جواباً لکھا:

"پاسِ انفاس یہ ہے۔ کہ کوئی سانس ذکرِ الٰہی سے خالی نہ جائے۔ اس کی صورت یہ ہے۔ جو آسانی سے ہو سکتی ہے۔ ہر سانس کے ساتھ اللہ۔ اللہ جاری رہے۔ بغیر تلفظِ لسانی، محض ذکرِ قلبی کے ساتھ — اِس کا ذکر ہے۔ جو حسب استطاعت مامور ہے۔"

ایک دوسرے طالب کو تحریر فرمایا:۔ "پاس انفاس یہ ہے کہ کوئی سانس اللہ کے ذکر سے خالی نہ ہو۔ اور اس کیلئے اللہ کافی ہے"

ذکرِ سِرّی

حقیقتِ ذکر' کے ضمن میں یہ بات گذر چکی ہے. کہ 'قلبی یاد' ہی حقیقتاً ذکر ہے' پس' ذکر' کا اصل مدعا' اسی 'قلبی یاد' کی دائماً 'یافت' ہے کہ دل ذکر سے اتنا "زندہ و بیدار" ہو جائے. کہ 'یادِ الٰہی اور استحضارِ ربّانی' کا ذاکر اپنے دل میں ہر آن و ہر حال میں عیاناً و حالاً ادراک کر سکے، 'یادِ قلبی' دل کا ملکۂ راسخہ' مزاج اور فطرتِ ثانیہ بن کر 'حقیقتِ ثابتہ' کی صورت میں "حاسۂ قلبی' یا جذبِ قلب اس میں پیوست و مرتسم ہو جائے۔ اور "ذکرِ حق" کی یہ

ا 'قلبِ ذاکر' ہی دل زندہ ہے. حدیثِ نبویؐ ہے

مثل الذی یذکر ربہ والذی لا یذکر ربہ مثل الحی و المیت (مشکوٰۃ ص۱۹۶ بحوالہ)

اس شخص کی مثال جو اپنے پروردگار کو یاد کرتا ہے اور جو نہیں یاد کرتا زندہ مردہ جیسی ہے یاد کرنیوالا زندہ اور نہ کرنیوالا مردہ ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

مجھے یہ غم ہے دل زندہ تو نہ مرجائیے
کہ زندگی عبارت ہے تیرے جینے سے

یافت قلبِ ذاکر کا شغلِ دائم بن جائے۔ جو اسے ہر وقت ذاتِ حق میں مشغول اور اس کے دھیان سے خرم و مسرور رکھے۔

اسی 'ملکہ یاد داشت' کے حصول کیلئے مختلف سلاسلِ سلوک نے مختلف طرقِ اذکار اختیار کئے ہیں۔ مقصود سب کا ایک ہی ہے۔ کہ ذکرِ حقیقی کا دوام و استمرار شریعت مطہرہ کے ظاہری و باطنی اتباع کے ساتھ میسر آجائے ہے

عبارا تنا شتّٰی وحسنک واحدٌ وکل الی ذاک الجمال یشیر

ان ہی طُرقِ اذکار میں ایک 'ذکرِ سری' بھی ہے۔ کہ ذاکر اپنے جملہ حواس ظاہری و باطنی کو مجتمع کر کے 'قلب' کی طرف پوری بیداری سے متوجہ ہو کر یوں تصور کرتا ہے۔ کہ 'دل' سے 'اللہ' 'اللہ' کی آواز نکل رہی ہے زبان میں حرکت نہیں ہوتی، اور 'دل' سے یہ آواز 'مسموع' سمجھ کر 'کان' گوش بر آواز' رہتے ہیں۔ اس ذکر میں 'تعداد' کی بجائے 'اوقات' کا اعتبار ہوتا ہے۔ ایک معتدبہ وقت کی مشق و ممارست سے 'باطنِ قلب' میں اللہ کا لفظ مرتکز ہو کر "لطیفۂ قلبی" کی زندگی اور اس میں 'ذکر کے احیاء' کا سبب بن جاتا ہے۔ اور 'سمع' اسی 'آواز' کو قلب سے سنتا ہے۔ "تصور جاناں" اور "سماعتِ نامِ محبوب" کی یہ مشق 'درِ جاناں' تک رسائی کا محض ایک 'ذریعہ' ہے۔ جس سے حواس پر "تصورِ جاناں" کو مستولی کیا جاتا ہے۔ اور دیگر 'خیالات' سے بچا کر 'مذکور' پر 'دل و دماغ' کو

مرکوز کر دیا جاتا ہے۔ جب حواس 'غیرِ حق' کے احساس اور دھیان و خیال سے فارغ ہو جاتے ہیں، تو 'مستورِ ازل' کا 'چہرہ یا قتاب' تجلیات و انوار کے حجابات[1]' میں بھی سالک کیلئے نورِ دیدہ و دل بن جاتا ہے'

عارف رومی کا شعر ہے

لب ببند و چشم بند و گوش بند ، گر نہ بینی روئے حق بر من بخند

بہر حال یہ 'تصوراتِ عشق یادِ محبوب اور دھیانِ حبیب بھی زینۂ قربِ ربانی ہے۔ جو سالک کے مراتب و حسنِ باطنی کو بڑھاتا ہے یہ شعر

یزیدك وجهه حسناً اذا ما زدته نظرا

'مجاز' میں مبالغہ ہو تو ہو، لیکن، 'حقیقت' میں عین حقیقت ہے عرب شاعر نے سچ کہا ہے۔

اراى اثرا منه بعينك بيناً لقد اخذت عينك من عينه حسنا

سالک کی کیفیت کا نقشہ اس بارے میں کسی عارف نے خوب کھینچا ہے

جمالت آفتابِ ہر نظر باد ز خوبی روئے خوبت خوبتر باد

مرا از تست ہر دم تازہ عشقے ترا ہر ساعتی حسنِ دگر باد'

غرض تصور کے ذریعہ ذکرِ حقیقی' کی یافت' ذکرِ سری' کا مقصد و منشاء ہے 'ذکرِ سری'، خصوصاً خانوادۂ نقشبندیہ میں معمول بہ ہے۔ ہمارے حضرت والا قدس سرہٗ چاروں سلسلوں میں مجاز تھے۔ اس لئے طالب کی مناسبت و مصلحت کے مطابق جس سلسلہ کے ذکر میں کشائش کار دکھائی دیتی تھی وہی تلقین فرماتے تھے کہ اصل مقصود "حقیقتِ ذکر" کی یافت ہے نہ طرقِ حصولِ ذکر'

---

[1] حجابہ النور الحدیث کی طرف اشارہ ہے۔ (محمد اشرف)

حضرت والاؒ کے ایک مسترشد خاص جسمانی کمزوری کی بنا پر ذکرِ جہری کا تحمل نہ فرما سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے اس ضعف کا تذکرہ حضرۃ الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ سے کرتے ہوتے لکھا۔ اس لئے باوجود شوق و ذوق کے ذکر و شغل کی زیادہ تاب بھی نہیں پاتا اور حضرت والا سے خاطر خواہ استفادہ سے محروم ہوں.....“

حکیم و محقق شیخ شفیق نے جواب باصواب عنایت فرمایا؛

”جسمانی صلاحیت کے مطابق ہی کام کیجئے۔ یاد ہوگا۔ کہ ذکر کی تعداد بڑھانے میں میں نے سہولت کی قید لگائی تھی۔ ایک مرتبہ بہت زیادہ بڑھا لینے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ اب بھی یہی مشورہ ہے ـــ اگر ذکر جہری[1] سے مشقت ہوتی ہے تو سری کیجئے۔ جو نقشبندی طریقہ میں رائج ہے۔ یعنی یہ کہ زبان بالکل بند تالو سے لگی ہوئی اور تصور کیجئے۔ کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز نکل رہی ہے۔ اس میں تعداد کی قید نہیں۔ وقت کا معیار ہے۔ یعنی پندرہ منٹ، بیس منٹ، آدھ گھنٹہ ایک گھنٹہ جیسی فرصت ہو“ (تذکرہ سلیمانؒ ص۵۲۷، ص۵۲۸)

سالک مذکور نے ایک خط میں تحریر کیا ”بحمد اللہ معمولات پر پابندی ہے۔ ذکر سری کر رہا ہوں۔ قیامِ توجہ کے لئے تسبیح بھی رکھ لیتا ہوں اس میں حرج تو نہیں۔“

---

[1] جہری سے یہاں مراد جہر غیر مفرط ہے۔ م۔ا

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارقام فرمایا :

" الحمد للہ بارک اللہ

ذکرِ سرّی میں زبان کو حرکت نہیں ہوتی، صرف قلب سے تصور میں ذکر ہوتا ہے۔ اسلئے اس کیلئے قلب کی توجہ اور بیداری کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ تسبیح سے اس توجہ میں کمی آجاتی ہے۔ کیونکہ توجہ تسبیح کے دانوں اور مقدار پر ہو جاتی ہے، مگر آپ کو اگر اسی میں آسانی ہے۔ تو کیجئے، مقصود ذکر سے ہے۔...... (ذکر میں) مقصود کمیت نہیں کیفیت ہے " (تذکرہ سلیمان صلا۵۵، صلا۵۵۱)

ایک دوسرے مکتوب میں ان ہی کے ایک استفسار کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :

" ذکرِ جہری اور سرّی دونوں مشروع ہیں۔ اب جس کو جس سے مناسبت ہو، جہری کے معنیٰ یہ ہیں۔ کہ جس کی آواز اپنے کانوں کو سنائی دے، جس کو قرآن پاک میں "دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ" کہا گیا ہے۔ اس کی تفسیر میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ جہراً اور حضرت ابوبکرؓ سراً تہجد پڑھتے تھے۔ تو حضرت عمرؓ کو فرمایا گیا۔ کہ ذرا آہستہ پڑھو اور حضرت ابوبکرؓ کو کہا گیا کہ ذرا زور سے پڑھو۔ " (تذکرہ صلا۵۸۲)

جیسا کہ معلوم ہوا۔ ذکر سرّی کا مدار قوت تصور کے استعمال و استمرار پر ہے۔ اور اسی کے ذریعہ یکسوئی اور حقیقتِ ذکر تک رفتہ رفتہ رسائی حاصل کی جاتی ہے۔"تصور" کی ان کارفرمائیوں" اور ان سے حواس کی یکجائی" "یادِ حق کے حصول کی کوشش اور" دھیان ربّانی" کی مشق کا تذکرہ حضرت سیدی الامام قدّس سرہ نے اپنے اشعار میں بھی فرمایا ہے "
ارشاد ہوتا ہے :-

دیکر تجھے حواس بفریب نوید دید اجزائے منتشر کو بہم کر رہا ہوں میں
سجدہ میں رکھ کے سر ترے پائے خیال میں
تعمیر اک بہشت ارم کر رہا ہوں میں
سر ہے زمین پر تو تصور ہے عرش پر
تعمیر اک اور حرم کر رہا ہوں میں

بات یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے انسان کو مختلف قوائے ظاہری و باطنی اور طرح طرح کی استعدادیں مرحمت فرمائیں ہیں۔ اور جس طرح خلقتِ بشری اس ابتلا کی گھاٹی (یعنی عالمِ ناسوت) میں نری 'عبدیت' اور 'فرائض عبودیت' کی بجاآوری کے لئے ہوئی ہے۔ اسی طرح جملہ انسانی ظاہری و باطنی و جسمانی و روحانی استعدادیں و قوئی اسی" بندگی کے کمال" کے حصول کے لئے عطا فرمائے گئے ہیں۔ کہ بندہ اس عالم میں جس کام کیلئے آیا ہے یعنی بندگی و سرافگندی' اطاعت و معرفت' اس کے حاصل کرنے کیلئے اپنی پوری مایہ ظاہری و جسمانی استعداد باطنی و روحانی جواہر کو

لگا دے ۔ قوت متخیلہ و تصور کی طاقت بھی خزائنِ الٰہیہ میں سے بندے کو اس لئے ہی دی گئی ہے کہ اس کا استعمال بھی اسی "مقصد عالی" کے حصول کیلئے کیا جائے اور اس کا جزو کل رضائے الٰہی، معرفت حق، فرائضِ عبدیت کی ادائیگی کے لئے صرف ہو، 'صوفیہ صافیہ' جنہیں اللہ تعالیٰ نے بصیرتِ باطنی سے نوازا ہوتا ہے۔ اور جو اپنی موت و حیات' ظاہر باطن غرض اپنی جملہ کائنات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے ان گھاٹیوں سے گذر چکے ہوتے ہیں۔ ہر استعداد کا صحیح محلِ استعمال بفضلہ وعونہ تعالیٰ ان کی فراست ایمانی پر کھول دیا جاتا ہے وہ تصور کے اس خزینہ قوت' کو بھی معرفتِ حق، یاد الٰہی اور استحضار و حضورِ ربانی کا ذریعہ بنا دیتے ہیں۔ اور جس طرح علمائے نفسیات' نفسیاتی علاج' (Psychological treatment) سے نفسیاتی اور بعض جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ "حکمائے باطنی" قلبی اور روحانی امراض کا علاج' اسی 'نفسیاتی و تصوراتی طریقہ علاج سے کرتے ہیں۔ لیکن دونوں میں فرق کے سمجھنے کیلئے 'حکمتِ ایمانی' کا جاننا ضروری ہے جو محقق اہل ایمان' کی صحبت ہی سے میسر آتی ہے مولانا فرماتے ہیں۔

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم بخواں؛

'صوفیہ کے اس طریقہ علاج کے متعلق حضرت الشیخ قدس روحہ اپنے ایک مرید با اختصاص کو ارقام فرماتے ہیں:

"یہ شبہ کہ ذکر و فکر میں تجلیات و کیفیات کا ورود سب تصوری و ذہنی معلوم ہوتا ہے م-۱) بالکل صحیح ہے۔ اسی لئے

یہ انوار و تجلیات جن کو عام طور پر انوار و تجلیات کا نام دیا جاتا ہے وہ نفسانی افکار ہیں۔ اور ا ان کی مثال ایسی ہے جیسے اسی عملِ نفسیاتی کے ذریعہ بعض علمائے نفسیات بیماری کا ازالہ اور صحت کا حصول کرتے ہیں۔ اور اسی نفسیاتی اصول سے صوفیہ امراضِ باطنی کا علاج کرتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ اب جسطرح پہلے یہ طے کیا جا چکا ہے کہ صحت اچھی چیز ہے۔ اور بیماری بری چیز ہے۔ اور بیماری کو دور اور صحت کا حصول اس تدبیر نفسیاتی سے کیا جاتا ہے۔ اور اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ اسی سے مشاہدہ اور استحضارِ ربّانی کی کیفیت جس کے حصول کا مطلوب ہونا الگ دلیل سے ثابت ہے اس کے حصول کیلئے یہ نفسیاتی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔ اور اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ اس طریق میں عموماً جو مشاہدات ہوتے ہیں۔ وہ ذہنی افکار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ امام نقشبند (خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس سرہ) کا یہ فقرہ اس پر دلالت کرتا ہے

"آنچہ دیدہ شود و دانستہ شود ہمہ غیر خدا است"

بحمداللہ کہ یہ حقیقت آپ پر ظاہر ہو گئی۔ غرض اصلاً یہ مشاہدات و تصورات مطلوب نہیں۔ یہ تو بطور تدبیر ہیں۔ اصل ان کے نتائج ہیں" مقصود مقصد تک رسائی ہے جس کیلئے ہر جائز ذریعہ کا استعمال ہے۔ ذکر سّری میں بھی یہی صورت ہے اور مشاہدہ اس کے خاطر خواہ نتائج پر شاہد ہے۔

۱؎ ۲؎ عام طور اور عموماً کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔

لطائفِ ستّہ

اِسی (ذکرسری) کے ضمن میں لطائف کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِن 'لطائف' میں بھی ذکر، تصوّر کی قوتِ متحرکہ سے ہی زندہ ہو کر محسوس ہوتا ہے۔ 'لطائف' کی تعداد اور ان کے مقامات میں اختلاف ہے۔ کہ سوائے لطیفہ قلبی کے (جو قرآن وحدیث سے ثابت ہے) باقی کشف سے معلوم ہوئے ہیں۔ اِس لئے اختلافِ اہل کشف کی بنا پر ان کی تعداد اور تعین مقامات میں اختلاف ہے۔ عام طور پر حضرات نقشبندیہ کے ہاں جو 'لطائف' مذکور ہیں۔ ان کا نام اور مقام بیان کیا جاتا ہے

نام لطیفہ	مقام
۱:۔ نفس	زیرِ ناف
۲:۔ قلب	بائیں پستان کے نیچے
۳:۔ روح	دائیں پستان کے نیچے
۴:۔ سِر	قلب و روح کے لطائف کے درمیان
۵:۔ خفی	دونوں ابرو کے درمیان
۶:۔ اخفی	سر کا تالو (ام الدماغ)

ان لطائف کے زندہ' وصاف اور جاری یعنی ذاکر کرنے کیلئے بھی 'لطیفہ قلبی' کی طرح ایک ایک[ل] لطیفہ کی طرف متوجہ ہوکر' اللہ اللہ' کی آواز تصور سے اسی طرح سنی جاتی ہے۔ جیسے' لطیفہ قلبی' سے مسموع ہوتی ہے اور حس کا تذکرہ ' ذکر سری' کے ضمن میں گذر چکا ہے۔ مشق و ممارست سے بعض اوقات علحدہ علحدہ لطیفہ ' ذاکر و زندہ ' ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ' فوقانی لطیفہ' کے ' احیاء' سے دوسرے لطائف بھی جاری و ذاکر اور زندہ ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اگر ایک ایک ' لطیفہ' کو صاف کر لیا جائے تو قیام رسوخ و اجراء ذکر میں سہولت رہتی ہے۔ بہر حال شیخ کی صوابدید پر ہے۔ ہمارے ہاں ' لطیفہ قلبی' کے علاوہ دیگر لطائف عموماً معمول بہا نہیں حضرت والا لطائف کے متعلق مختلف مکتوبات میں اپنے ایک عزیز خاص کو ارقام فرماتے ہیں:-

"نقشبندیہ سلسلہ میں لطائفِ ستہ کا جو ذکر آتا ہے وہ) حدیث و قرآن سے ثابت نہیں۔ حدیث و قرآن سے صرف لطیفہ 'قلب' ثابت ہے قرآن پاک میں "قلب منیب" اور قلب سلیم کا ذکر آتا ہے حدیث میں ہے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ الا وھی القلب۔ اسلئے حاجی صاحب کے سلسلہ میں سارا زور قلب کے تزکیہ پہ ہے"....

ل اگر استعداد ہو تو احیاناً بیک وقت بھی جملہ لطائف سے اسی اللہ اللہ کی آواز کو سننا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائے سلوک میں مشق و ممارست کیلئے شیخ کی اجازت سے یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن ادنی اولیٰ ... م ۱

لطائف جاری ہونے کا منشا یہی ہے کہ اللہ اللہ کی آواز ہر جگہ سے موہوم ہوتی ہے ...... ہمارے سلسلہ میں دوائر اور لطائف اور تنزلات وغیرہ کے مسائل معمول بہا نہیں۔

(تذکرہ سلیمان ص۵۱۹، ص۵۲۰ و ص۵۲۹)

غرض خانوادۂ نقشبندیہ میں ذکر کو "رگ وپے" میں بسانے کے لئے جملہ لطائف کو بھی ذکرِ سرّی کے ذریعہ پر انوار کیا جاتا ہے۔ اور جو حضرات اس راہ سے گذر چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ لطائف کے اجراء سے ذکر کی نورانیت کیسے چھا جاتی ہے اور انسان کیسے آلہ ذکر بن جاتا ہے۔

ذکر جھری و خفی
اور
ذکر دون الجھر

حضرت الشیخ الامام نور اللہ مرقدہٗ 'ذکر لسانی' میں 'جہر مفرط' کو ناپسند فرماتے۔ حدیث شریف میں بھی ہے۔

اربعوا علی انفسکم انکم لا تدعون اصم ولا غائبا ان الذی تدعون سمیع قریب۔	کہ تم بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے۔ اپنے نفسوں پر نرمی کرو جسے تم پکارتے ہو۔ وہ سننے والا اور قریب ہے۔
(ابن کثیر صہ ۲۲۱ ج ۲ بحوالہ الصحیحین)	

ایک مرتبہ حضرت سیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک مرید سے (جس سے بے اختیار بہت اونچی آواز سے 'الفاظ ذکر' نکل جاتے تھے) تربیتاً فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ کا کسی کے چنگھاڑنے سے کیا بنتا ہے۔ انسان غیر اختیاری امور کا مکلف نہیں۔ لیکن اپنی طرف سے توضبط کی کوشش ہو"

— کہ ذکر میں کیفیتِ قلبی مقصود ہے۔ نہ آواز کی بلندی و پستی، اسی سبب سے ایک طالب کے استفسار پر کہ ذکر کیسے ہو فرمایا تھا ع

نالہ پابندِ نے نہیں ہے

پھر مزید ارشاد ہوا تھا، میرے دو شعر ہیں ؎

جو آج لذتِ دردِ نہاں کا جویا ہے　　وہ پہلے سوز سے سینہ تو داغدار کرے
وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں میرے نالوں کو　　وہ طرز نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے

شیخ کی مراد یہ تھی، کہ ذکر کچھ اس درد و سوز، اخلاص و یقین اور تاثیر قلبی میں ڈوب کر کیا جائے کہ رحمت الٰہیہ کو جوش آجائے اور وہ "انجذابی" صورت میں متوجہ ہو جائے، کہ بقول عارف رومی

گر نہ گرید کودکے کہ جوشد لبن　　گر نہ گرید ابر کے خند دچمن

ایسا 'ذکر' جس میں 'خون جگر' اور پارہ ہائے دل' کی آمیزش ہو تو عنایات الٰہیہ کا خاص مورد ہے۔ غرض ذکر کی کیفیت قلبی میں جس قدر طلب و سوز، والہیت اور توجہ تام ہوگی۔ اسی قدر ذکر مؤثر ہوگا۔ اور یہ تمام 'کیفیات' "میانِ عاشق و معشوق رمزیست" کی مصداق ہیں۔ جن کا اظہار و اعلان 'طریق عاشقی' و 'آئین درویشی' کے خلاف ہے۔ کہ بقول سلطان الہند امام خانوادۂ چشتیہ حضرت شاہ معین الدین اجمیری رحمہ اللہ تعالیٰ،

"وہ شخص دوستی کے قابل نہیں۔ جو دوست کے راز کو فاش کرے۔"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا شعر ہے۔

المدد توفیقِ ضبط و المدد تابِ سکوت　　لب پہ لے آئے نہ جوشِ دل کبھی اسرارِ دل

؎ حضرت سیدی قدس سرہٗ کا شعر ہے۔

قطرہ اشک میں ہوں دل کے بھی ٹکڑے شامل　　نطرتِ دیدۂ خونبار کہاں سے لاؤں

سچی بات ہے کہ ہر ایک کا کلیجہ نہیں، کہ دل پر آرے چلیں اور زبان پر اف تک نہ ہوے

تو لے مردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو
کہ بینی خندہ بر لبہا و آتش پارہ در دِلہا

خصوصاً حضرات چشتیہ جن کا شعار ہی اِس شعر کا مصداق ہے

سوختن وافروختن وجامہ دریدن پروانہ زمن، شمع زمن گل زمن آموخت

غرض 'ذکر' 'مذکور' سے تعلق کیلئے ہے اور 'مستور از ل' سے تعلق قلبی' اور اسکی یاد جس قدر 'مستور' ہو بہتر ہی ہے۔ خصوصاً مبتدی حضرات کا اکثر حالات میں 'سمع و ریا' سے بچاؤ ذکر خفی یا جہر غیر مفرط ہی سے ہو سکتا ہے۔ اسلئے شریعت مطہرہ میں جہاں جہر کا حکم ہے وہاں تو بقدرِ امر الٰہی جہر مامور ہے۔ ورنہ عام حالت میں 'ذکر خفی' ہی مناسب ہے۔ الّا یہ ہے کہ شیخ علاج یا کسی اور حکمت کی بنا پر جہر کی تلقین کرے اور وہ جہر بھی ایسا ہو، جس سے حقوق العباد ضائع نہ ہوں اور کسی کو اذیت نہ پہنچے، کہ جہر مقصود بالذات نہیں بلکہ حدود و قیود کے ساتھ جائز ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے سلسلہ میں 'ذکر بالجماعۃ' کا بھی دستور نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض شیوخ و سلاسل تربیتی مصلحتوں و حکمتوں کی بنا پر اسے اجتہاداً بہتر سمجھتے ہوں۔ اس لئے اعتراض کی گنجائش نہیں ع

و للناس فیما یعشقون مذاھب

ورنہ مسلکِ سلیمانی حضرت الشیخ قدس سرہ کی تحریر سے ظاہر ہے

"ذکر بالجماعہ کا دستور ہمارے ہاں نہیں۔ اس میں ریا اور دوسری خرابیاں"

ہوتی ہیں۔ (تذکرہ سلیمان ص۴۲۲)

بہر حال حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ طالبین کو ذکر 'خفی' ذکر سری' یا ذکر 'جہر غیر مفرط' (جسے قرآن میں " دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ' کے لفظوں سے یاد کیا گیا) کی تلقین فرماتے تھے۔ ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"آپ جو پندرہ منٹ مراقبہ کیلئے وقت نکالتے ہیں، اگر کچھ وقت اور ملے، جیسے صبح کی نماز کے وقت یا تہجد میں یا کسی اور وقت تو ایک ہزار دفعہ 'اللہ اللہ' ذرا ہلکے نغمہ سے آہستہ آہستہ اس حد تک کہ آپ کے کان میں آواز آئے تسبیح پر گنکر ذکر کر لیا کیجئے۔ آنکھیں بند ہوں' اور یہ تصوّر ہو کہ اللہ کا کلمہ نورانی حروف سے آپ کے سینہ پر لکھا ہے۔ اگر آپ تعلیم یا کسی اور کام میں مصروف ہوں۔ تو اس میں نقصان نہ ہو، ہر کام میں خدا کی رضا کی نیت رہے۔ انشاءاللہ آپ کیلئے دین کا راستہ کھلے گا"

اپنے ایک مسترشد خاص کو رقم فرماتے ہیں۔

" ذکر جہری اور سری دونوں مشروع ہیں' اب جس کو جس سے مناسبت ہو، جہری کے معنی یہ ہیں۔ کہ جس کی آواز اپنے کانوں کو سنائی دے' جس کو قرآن پاک میں " دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ" کہا گیا ہے.... "

ایک اور سالک کو تحریر فرمایا:۔

"...... پھر ڈھائی ہزار مرتبہ ذرا ہلکی آواز سے پڑھیں، ضرب کے ساتھ یا بلا ضرب کے، مگر سمجھیں کہ ضرب کوئی دینی امر نہیں،"

ایک اور مرید کو تلقین فرماتے ہیں۔

"اِس کی ضرورت ہے۔ کہ وقت معین کرکے پوری توجہ کے ساتھ اسم ذات کی معین مقدار کا ایک نشست میں یا متعدد نشستوں میں حسب سہولت ایسی آواز سے جو سنی جا سکے بغیر ضرب کے ذکر کریں، اسکی زیادہ سے زیادہ تعداد ۲۴ ہزار اور کم سے کم ۳ ہزار ہے۔ آپ کم سے کم شروع کرکے حسب توفیق جس قدر پہنچا سکیں۔

ذکرِ جہر میں مستی ہے

ذکر بالجہر کیونکہ نسبتاً اونچی آواز سے ہوتا ہے اس سے طبعاً قلب میں رقت یا جوش اور بعض اوقات مستی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک طالب نے لکھا :۔

"پچھلے کچھ دنوں سے قلب میں اِک سوز کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ مستی محسوس کرتا ہوں، عشقیہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور ان سے تسکین ہوتی ہے۔ ذکر بھی جو کہ ہمیشہ خفی کرتا ہوں (اِلّا ما شاء اللہ) جہری کرنے کو جی چاہتا ہے"۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواباً ارقام فرمایا ۔۔۔ "یہ بھی ایک کیفیت ہے جو مستحسن و محمود ہے، ذکر جہری کرنے یا عشقیہ اشعار پڑھنے کو جی چاہے تو پڑھ لیں، خواجہ مجذوب صاحبؒ کے اشعار اس کیلئے مفید ہیں"۔

ایک اور مسترشد نے لکھا ۔۔۔ "ذکر خفی کی بجائے پھر جہری کی طرف طبیعت کا میلان ہے مگر اس میں ضعفِ دماغی کا قوی امکان ہے"۔

حضرۃ الشیخ نور اللہ مرقدہٗ نے تحریر فرمایا ۔۔۔ "ذکر جہری میں مستی ہے۔ اسلئے جی چاہتا ہوگا، اپنی طبیعت کا اندازہ کریں پھر فیصلہ کریں"۔

ذکرِ اسماء اللہ تعالیٰ
اور
ذکرِ اسمِ جلالہ

اے نامِ تو دافعِ بلاہا بیماری قلب را شفاہا

اللہ تبارک و تعالیٰ کو اس کے جملہ مفرد ناموں سے یاد کیا اور پکارا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط (اسرائیل - ۱۲)

آپ فرما دیجئے کہ (اللہ تعالیٰ کو) خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو گے۔ اس کیلئے سب اچھے نام ہیں۔

سورۂ اعراف (۲۲) میں ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ص وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ط

اور اللہ ہی کیلئے ہیں سب اچھے نام اس کو ان ناموں سے پکارو، اور ان لوگوں سے علحدہ رہو جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

محبِّ صادق کیلئے محبوب کی ہر صفت میں کشش دلستانی کا پیام ہے اور اس سے منسوب ہر چیز میں جذب وشوق کا سامان ہے۔ نامِ محبوب (وہ ذاتی ہو یا صفاتی) چونکہ ذاتِ محبوب پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے عشاق کیلئے اس کا تذکرہ سرمایۂ سکون وطمانیت ہے اور یاد ازدیادِ محبت وتعلق کا سبب ہے عارف رومیؒ نے مجنونِ عامری کی ایک حکایت نقل کی ہے۔ کہ صحرا میں بیٹھا انگلیوں سے ریت پر کچھ لکھ رہا تھا۔ کسی نے پوچھا کیا کر رہے ہو۔ فراق زدہ قیس (مجنون) رمزِ محبت کا شناسا تھا پکار اٹھا ع

گفت مشقِ نامِ لیلیٰ میکنم　　　خاطرِ خود را تسلّی می دہم

مجنونِ لیلیٰ کیلئے نامِ لیلیٰ میں جس قدر تسلّی کا سامان ہے۔ ایک عاشقِ ربّانی کیلئے نامِ باری تعالیٰ عز اسمہ میں اس سے بڑھ کر راحت وتسکین ہے کہ ع

عشقِ مولیٰ کہ کمتر از لیلیٰ بود　　　گوئے گشتن بہرِ او اولیٰ بود

اسماء الٰہیہ چونکہ محبوبِ حقیقی کی ذات وصفات پر دلالت کرتے ہیں۔ اس لئے ہر اسم کا تذکرہ ویاد سالک کیلئے حلاوتِ روحانی، ترقیِ باطنی اور قربِ ربانی کا ذریعہ ہے کہ بقول عارف رومیؒ

از صفت وز نام چہ زاید خیال　　　وآں خیالش ہست دلّالِ وصال

اسمائے الٰہیہ سے شغف ومحبت حُبِّ الٰہی کا ثمرہ ونتیجہ ہوتا ہے کہ بقول حضرۃ الشیخ قدس سرہ۔

"—— اسم میں خود محبوبیت نہیں ہوتی۔ اسم میں محبوبیت محبوب کی ذات پر دال ہونے کے سبب سے ہی ہوتی ہے۔ پس اسم کی

محبوبیت ذات کی محبوبیت کا نتیجہ ذلل ہے۔"

ایک طالب علم کو ارقام فرمایا۔ اِس نام حق میں لذت ملنے، پر خدا کا شکر کیجئے۔ یہ بڑی نعمت ہے ؎

تیرے نام ہی میں جو حلاوت ملے تو سارے غموں سے فراغت ملے

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :-

"تعلیم محمدی کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ سے بھرا ہوا ہے۔ بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن پاک کا کم کوئی ایسا رکوع ہوگا۔ جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو۔ اور یہ تمام اوصاف اور نام اُس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں۔ جو اِس محبوب ازل اور نورِ عالم کیساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیئے (سیرۃ النبی ج ۴ ص ۵۹۶)

غرض اللہ تعالیٰ کا ہر اسم پاک بندۂ مومن کے قلب کی جلا اور نور ہے اور اسکی پیہم یاد و تکرار محبت الٰہی کی دلیل اور اس کے تعلق باطنی کا نشان ہے۔ جو بارگاہِ کردگار میں بار پانے کا بڑا سبب ہے۔ 'اسم' 'مسمیٰ' تک رسائی کیلئے موصل کا کام کرتا ہے اور اگر صدق وصفا اور اخلاصِ تام شامل حال ہو، تو 'ذکر اسمی' 'فراغت قلبی' اور 'تبتل الی اللہ' کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ قول ربانی ہے

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل - ۱)	اور پڑھے جا نام اپنے رب کا اور چھوٹ کر چلا آ اسکی طرف سب سے الگ ہو کر۔

غرض ہر نام الٰہی کی رٹ نام والے تک پہنچا دیتی ہے۔ اور اس اسم کی تجلی ذاکر کے قلب روح اور جسم وجان کو منور کر دیتی ہے۔ لیکن جملہ اسمائے الٰہیہ میں جو جامعیت وعظمت، برکت و وسعت گہراؤ اور گیرائی اسم جلالہ "اللہ" میں ہے۔ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے قرآن کریم میں ہر جگہ یہی نام خداوند قدوس کیلئے اسم "علم" کے طور پر استعمال ہوا ہے اور علماء نے اسے اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا نام اور اسم ذات قرار دیا ہے۔ اور جملہ اسمائے الٰہیہ کی معنویت وحقیقت کو اسی "نام پاک" میں منطوی و مندمج سمجھا ہے۔ اس لئے اسم ذات کا ذکر جملہ اسمائے حسنیٰ کی تجلیات و برکات کا جامع ہے۔ ہمارے حضرت والا قدس اللہ روحہ کا ملفوظ ہے

"اللہ تعالیٰ اس ذات کا نام ہے۔ جو تمام صفات حسنہ کی جامع ہے۔ "اللہ" کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا دھیان اس کی تمام صفات حسنہ کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ وہ نافع بھی ہیں۔ ضار بھی ہیں، معطی بھی ہیں مانع بھی، خالق بھی وہی ہیں، رازق بھی وہی ہیں، اللہ تعالیٰ کہتے ہوئے ان کی تمام صفات کا استحضار ہونا چاہیئے

... اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا ہر چیز سے ان صفات کی نفی ہو۔ اور اللہ ہی میں تمام صفات کو سمجھا جائے۔"

حضرت سید الملتہؒ سیرۃ النبیؐ (جلد چہارم) میں اسم "اللہ" کی تشریح کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:۔

"اللہ"۔ یہ خدا کا وہ نام ہے۔ جو قرآن پاک میں بطور علم ہر جگہ استعمال

ہوا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ اِس لفظ کی معنوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے کسی نے کہا ہے۔ کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کیجائے، بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگردان ہو، دوسروں کی تحقیق ہے کہ اُس کے معنٰی ہیں۔ وہ اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت و محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنٰی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔ (سیرۃ النبیؐ صفحہ ج۴)

اِسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ہر زبان میں اِس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کیلئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تمثیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے۔ تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے گئے تھے۔ ہر قوم نے اس عَلَم اور نام کیلئے اُسی وصف کو پسند کیا ہے۔ جو اس کے نزدیک اس خالقِ ہستی کی سب سے ممتاز صفت ہو سکتی ہے۔

اسلام نے خالق کیلئے جو نام اور عَلَم اختیار کیا ہے۔ وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے۔ اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے۔ مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ "ولاہ" سے نکلا ہے اور" ولاہ" کے اصل معنی عربی میں اس "غم"

محبت' اور 'تعلق خاطر' کے ہیں۔ جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی سے بعد کو مطلق "عشق و محبت" کے معنیٰ پیدا ہو گئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے۔ اس لئے اللہ کے معنیٰ "محبوب اور پیارے" کے ہیں۔ جن کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے۔ اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں 'من موہن' یعنی' دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے (سیرۃ ص۲۲۳)

یہ تو لفظ اللہ کی لغوی تحقیق تھی۔ دوسری جگہ اسی پاک نام کی عظمت و اہمیت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

"... محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربانی تعلیمات سے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا۔ اسکی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اسکی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی اُن کو تعلیم دی، جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے۔ جسکی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے۔ جسکے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ

لے اصل میں 'ان' ہے۔ یعنی عربوں کی

اور ہر لمحہ اسکے روبرو ہیں۔ اسکے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ ہے ۔ اس کے مواخذہ کا خوف اور اسکی رحمت کی امید ہے۔ وہ محبوب ازل ہے۔ اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے۔ اس کے فضل وکرم اور لطف ومحبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں۔اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اسکا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اُس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے اسکی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اسکی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک ومنزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے۔ انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیۂ واصلاح کیلئے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا۔ اور ان سے ہمکلام ہوتا رہا۔ اسکے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں۔ جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے۔ وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بے کسوں کا سہارا ہے۔ وہ ہم سے ہماری رگِ گردن سے بھی قریب تر ہے۔ ہم اسکو جب پکاریں وہ سنتا ہے۔ وہ وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے۔ وہ جب چاہے آسمان وزمین کو فنا کر دے۔ اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے۔ اسکی محبت دنیا کا حاصل اسکی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اسکی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ — ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان

اَلْقُلُوْبُ (رعد-۴)   حاصل ہوتا ہے۔

(سیرت النبیؐ ص۴۸۸ تا ۴۸۹ ج ۴)

علامہ ابن قیم نے 'مدارج السالکین' میں اسم جلالہ' اللہ کی عظمت و اہمیت پر قابلِ دید بحث کی ہے۔ ارقام فرماتے ہیں:

"اسم 'اللہ' باری تعالیٰ کے جملہ اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ عالیہ پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اسم مبارک اس خدائی (الاہیت) کو ثابت کرتا ہے۔ جس میں جملہ صفاتِ الوہیت موجود ہوں اور انکی اضداد کی نفی ہو۔ چونکہ صفات الہیہ ایسی صفات کمال ہیں۔ جو تشبیہ و مثال اور عیوب و نقائص سے منزہ ہیں اور (ان پر دلالت کرنیوالا یہ نام اللہ ہے) اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام اسمائے حسنیٰ کو اس اسم عظیم کی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (۷-۱۸۰)   اور اللہ ہی کیلئے ہیں سارے اچھے نام

اسی بنا پر الرحمٰن، الرحیم، القدوس، السلام، العزیز، الحکیم کو اللہ کے نام کہا جائیگا۔ اور 'اللہ' کو الرحیم یا العزیز وغیرہ کا نام نہیں کہا جائے گا۔ (گویا اسم علَم و ذاتی اللہ ہے)۔

اللہ کا اسم جملہ اسمائے حسنیٰ کے معانی کو مستلزم ہے۔ اور ان تمام اسمائے حسنیٰ پر اجمالاً دلالت کرتا ہے۔ (نیز) جملہ اسمائے حسنیٰ ان صفاتِ الٰہیہ کی تفصیل و وضاحت ہیں۔ جو اسم 'اللہ' سے مشتق ہیں۔ اور اسم اللہ ان جملہ اسماء پر اس وجہ سے دلالت کرتا ہے۔ کہ 'اللہ'

ایسا ملجا، ماویٰ اور محتاج الیہ[1] (محبوب) اور معبود ہے۔ جسکی طرف پوری مخلوق تمام حوائج و مصائب میں محبت و تعظیم، عاجزی و ہیبت کے ساتھ سر افگندہ و متوجہ ہے۔ اور حاجت براری اور معبودیت کی ان صفات کا لازمہ کمال ربوبیت و رحمت ہے۔ اور یہ کمالِ ملک و حمد، الٰہیت و ربوبیت رحمانیت و فرمانروائی کی جملہ صفات کمال کو مستلزم ہیں..... اور جلالی اور جمالی صفات تو اسم 'اللہ' کے ساتھ خصوصاً متعلق ہیں۔

(مدارج السالکین ص ۳۲-۳۳ ج:۱)

ابن قیم کی بحث کا حاصل یہ ہے۔ کہ اسم 'اللہ' جملہ اسمائے حسنیٰ کا جامع اور تمام صفاتِ جمال و کمال و جلال پر حاوی ہے۔ اور یہی اسم علم و ذات ہے۔ جسکی طرف باقی اسماء کی نسبت ہو سکتی ہے۔

علامہ آلوسی بغدادی روح المعانی میں حجۃ الاسلام امام غزالی سے 'اللہ' کے بارے میں نقل کرتے ہیں:

"اللہ" کا نام اللہ تبارک و تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سب سے بڑا ہے کہ یہ اس ذات (عالی) پر دلالت کرتا ہے۔ جو جملہ صفاتِ الٰہیہ کی جامع ہے۔ اور باقی تمام اسماء مفرد مفرد معنیٰ پر دلالت کرتے ہیں مثلاً علم یا قدرت یا فعل وغیرہ پر' اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے۔ جسکا اطلاق کسی غیر پر حقیقتاً یا مجازاً نہیں کیا جا سکتا۔ اور دیگر تمام اسماء

---

[1] اصل لفظ 'مألوہ' ہے۔ جس میں یہ تمام معنیٰ آجاتے ہیں۔

کے ساتھ دوسروں کو بھی موسوم کیا جا سکتا ہے جیسے قادر، علیم، رحیم وغیرہ اور الرحمٰن بھی 'غیر اللہ' نام نہیں رکھا جا سکتا۔ اور اس وجہ سے الرحمٰن کا نام 'اللہ' کے نام کے قریب ہے ...... " (روح المعانی ص۱۱۶ ج ۱۶)

امام نووی حدیث :-

اِنَّ لِلّٰہِ تسعة وتسعین اسما — اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔

کی شرح میں لکھتے ہیں ؛

" امام خطابی وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مشہور ترین نام 'اللہ' ہے کہ باقی اسماء کی اضافت اس کی طرف کی گئی ہے۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ 'اللہ' (خدا تعالیٰ کا) سب سے بڑا نام ہے۔

اور ابوالقاسم الطبری نے کہا ہے کہ اسی نام مبارک کی طرف باری تعالیٰ کے تمام نام منسوب کئے جائیں گے (مثلاً) یوں کہا جائے گا۔ کہ الرؤف والکریم، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہیں، اور یوں نہیں کہا جائے گا کہ 'اللہ' الرؤف یا الکریم کا نام ہے (مراد یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اسم علم ہے باقی اسماء صفاتی ہیں)۔ (النووی بر شرح صحیح مسلم ص۳۴۲ ج ۲)

اِن اقتباسات سے اسم 'اللہ' کی اہمیت و عظمت و جامعیت کا کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اسلئے بعض حضرات کا مجرد ذکر 'اللہ' پر اعتراض ان کا تفرد ہے۔ جو جمہور علماء و صوفیہ کے مسلک کے خلاف ہے۔ گذر چکا۔ کہ نصوصِ قرآنی

قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (بنی اسرائیل ۔۱۲۰)

آپ فرما دیجیے۔ (باری تعالیٰ کو) خواہ اللہ کہہ کر پکارو۔ یا رحمٰن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی اسے پکارو گے۔ اسکے اچھے نام ہیں۔

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا (سورہ اعراف۔۲۲)

اور اللہ ہی کیلئے سب اچھے نام ہیں۔ اسکو ان ناموں سے پکارو

سے ثابت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کے مفرد ناموں سے پکارا اور یاد کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب جملہ ناموں سے اللہ تعالیٰ کو پکارا جاسکتا ہے تو اسکا اسم علم جو (اپنی جامعیت و معنویت میں جملہ صفات عالیہ اور اسمائے حسنیٰ کو اپنے میں لئے ہوئے ہے۔ بطریق اولیٰ پکارے جانے اور یاد کئے جانے کے لائق ہے۔ مزید براں۔

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ (المزمل۔۱) اپنے ربّ کو اسکے نام سے پکارو۔

'اسم' عام ہے۔ جو ذکر 'اسمی' پر وضاحتہً ولالت کرتا ہے۔

اسی طرح وہ احادیث مبارکہ جن میں ذکرِ عمومی کی ترغیب دی گئی ہے ان میں کسی خاص ذکر کو معین نہیں کیا۔ بلکہ صحیح مسلم کی حدیث میں صاف وارد ہے

عن انسؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لاتقوم الساعۃ حتی لا یقال فی الارض اللّٰہ اللّٰہ وفی روایۃ لاتقوم

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ ایسی حالت ہوجاوے کہ دنیا میں اللہ اللہ نہ کہا جائے اور ایک

الساعة علی احد یقول اللّٰہ اللّٰہ۔ روایت میں ہے کہ قیامت کسی ایسے شخص
(مشکوٰۃ ص۴۸ بحوالہ مسلم) پر قائم نہیں ہو گی جو اللّٰہ اللّٰہ کہتا ہو

یہاں اسم مفرد "اللّٰہ" کا ذکر مکرر آیا ہے۔ شیخ الکل حضرت تھانوی رحمہ اللّٰہ تعالیٰ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"بعض کا اس طریق ذکر (یعنی ذکر مجرد باسم اللّٰہ الشریف) پر اعتراض ہے کہ صرف اللّٰہ اللّٰہ مفرد ہے۔ اس لئے نہ کسی معنی جزی کو مفید ہے۔ نہ معنی انشائی کو، پھر اس ذکر بے معنی سے کیا فائدہ، مگر اس حدیث میں خود اسی افراد کو مقول بنایا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ محض اسی کا تکرار بھی مشروع ہے۔ اور معنی کچھ جز اور انشاء میں منحصر نہیں۔ اگر اس سے تبرک و استحضار محض ہی مقصود ہو تو بے معنی اور غیر مفید کیوں ہو گا۔ ارشاد خداوندی وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ ظاہر الفاظ سے محض اسم کے ذکر کو بھی عام ہے (نیز یہ بھی توجیہ ہو سکتی ہے۔ کہ حرف ندا محذوف ہو، اور اسکا حذف نام کے شوق و لذت میں[1] عموماً شائع ہے)۔ (التکشف عن مہمات التصوف ص۲۶۹)

ایک دوسری حدیث سے بھی "مجرد اسم" کے ذکر و تکرار کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے ابن مسعود کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ جس میں حضرت بلالؓ کے متعلق ہے۔

کہ حضرت بلالؓ کو لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اور وہ انہیں مکہ

---

[1] آخری عبارت جو قوسین میں لکھی گئی ہے۔ التکشف کے حاشیہ پر عربی میں ہے فقیر نے اس کا با محاورہ ترجمہ کر دیا ہے۔ (م۔ و)

کی گھاٹیوں میں پھراتے رہتے تھے۔ اس اثنا میں حضرت بلال پیہم ' احد احد ' کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ حدیث کے الفاظ ہیں

وھو یقول اُحد احد ۔ اور حضرت بلال اس اثنا میں احد احد پکارتے رہتے تھے (البدایۃ والنہایۃ ص۵۸ ج ۱)

ابن اسحاق کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب بلال رضی کی چھاتی پر پتھر کی سل رکھ دی جاتی تھی۔ اور انہیں دھمکایا جاتا تھا۔ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر انکار نہیں کرو گے۔ اور لات وعزیٰ کی عبادت نہیں کرو گے تو تمہیں اسی طرح اذیتیں دے کر ختم کر دیا جائے گا۔ اس وقت بھی وہ پیہم ' اُحد احد ' کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ (البدایۃ والنہایۃ ص۵۷، ۵۸ ج ۱ سیرۃ ابن ھشام ص۳۱۸ ج ۱)

اِس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ ' احد احد ' بلال کا دائمی ذکر تھا جسے وہ وظیفہ کے طور پر ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ اس سے ' احد احد ' کے ذکر کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ پس جب ' احد احد ' کا ذکر جائز ہے۔ تو ' اللہ اللہ ' کا ذکر بھی ناجائز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی تحریر فرماتے ہیں۔

" ہشام نے محمد سے اور انہوں نے ابو حنیفہ سے روایت کیا ہے۔ کہ ' اللہ ' اللہ کا سب سے بڑا نام ہے۔ اور یہی امام طحاوی اور علماء اور عارفین کے کثیر طبقہ کا قول ہے۔ یہاں تک کہ انکے نزدیک ' اللہ ' کے ذکر سے بڑھ کر کوئی دوسرا ذکر نہیں۔ جیسا ابن امیر حاج (کی کتاب) " التحریر " میں ہے (رد المحتار علی در المختار ص۶)

علامہ بدر الدین العینی حدیث شریف للّٰہ تسعۃ وتسعون اسماً الخ کی شرح کے ضمن میں لکھتے ہیں :۔

المراد بالحفظ القراءة بظهر القلب فيكون كناية عن التكرار

لأن الحفظ يستلزم التكرار (عمدة القاری ص۲۹ ج ۲۲)

(اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے ننانویں ناموں کے یاد کرنے اور) حفظ سے مراد ان

کا دل (کی یاد داشت) سے پڑھنا ہے۔ پس یہ (حفظ کا لفظ) تکرار سے کنایہ ہے

کہ حفظ کیلئے تکرار لازم ہے

خلاصہ مذکور کی اس تشریح سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث مذکور میں اسمائے الٰہیہ کی تکرار کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اور ذکر اسما یا ذکر اسم ذات کا بھی یہی منشا ہے

غرض "ذکر مجرد اسمی" کی مشروعیت نصوص سے ثابت ہے۔ اور یہی جمہور علماء اور صوفیہ کا مسلک ہے، اسم (پروردگار) کے بابرکت ہونے پر نص صریح وارد ہے

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (الرحمٰن۔۳)	آپکے عظمت واحسان والے پروردگار کا نام بڑا بابرکت ہے۔

جب اِس نام کو بار بار لیا جائیگا۔ تو اسکی برکات سے قلب و روح منوّر ہوجائیگا۔ اور اسکی تکرار اندرون قلب میں متمکن ہوکر اسے بہار بنادیگی اور حقیقت ذکر آجائیگی۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں۔

"اللہ اللہ آپ زبان ہی سے کئے جائیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دل

تک اثر کرے گا۔"

حضرت تھانویؒ قدس سرہٗ کا ملفوظ ہے :

"صاحبو غضب یہ ہے کہ کھٹائی مٹھائی کا نام لینے سے تو اثر ہو۔ کہ نام لینے سے منہ میں پانی بھر آئے۔ اور خدا کے نام میں اثر نہ ہو"

حضرت والاؒ فرماتے ہیں :

تیرے یاد آنے سے ہر غم مٹ گیا
دارُوئے ہر درد تیرا نام ہے
نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیر دورِ جام ہے

ذکرِ حق سے صیقل کامل ہوا
محو دل سے نقش ہر باطل ہوا

حضرت الشیخ کی کیفیت ذکر

حضرت شیخؒ کی صحبت میں جنہیں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ ان پر ذکر کا کس قدر غلبہ تھا۔ اور حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ پر کیفیت ذکر کس طرح چھائی ہوئی تھی۔ ذکر کی تاثیر مجلس میں کھلی محسوس ہوجاتی تھی۔ سیدی قدس سرہٗ کو دیکھتے ہی مجلس کا وہ حال ہوجاتا تھا۔ جیسے مجذوبؒ نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے

یہ کون آیا کہ مدہم پڑگئی لو شمعِ محفل کی
پتنگوں کے عوض اڑنے لگی چنگاریاں دل کی

انوارِ ذکر قلوب کو مائل بذکر کردیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد حضرت والا نوراللہ مرقدہٗ کی زبان اقدس بے ساختہ لا الٰہ الا اللہ یا اللہ اللہ کی صدا نکل جاتی تھی، خود فرماتے ہیں۔

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز — ہر رگِ جاں ساز الا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں — ہر صدا آواز الا اللہ ہے
ہے اسی کی سانس انفاس حیات — جو کوئی دم ساز الا اللہ ہے

دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند　　قلبِ ذاکر ساز الا اللہ ہے
وجد میں جان ہے تو اعضا رقص میں　　جام مے آواز الا اللہ ہے

"ذاکر" کا ذکر جب اس کے قلب و روح میں رچ جاتا ہے۔ اور رسوخ حاصل کر لیتا ہے۔ تو اس کی 'صورت وحال' ہی سالکین کے لئے ازدیادِ ذکر اور تقویتِ نسبت کا سبب بن جاتا ہے۔ جن حضرات نے حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ اور جانا ہے۔ وہ جانتے ہیں: کہ نہ صرف قلبِ سلیمانیؒ بلکہ قالبِ سلیمانیؒ بھی مفتاح الذکر بن چکا تھا۔

ایک مرتبہ ایک طالب سے جس کے قلب سے بے اختیار "اللہ اللہ" کی صدا نکل جاتی تھی۔ ارشاد فرمایا:۔

"گو یہ کیفیت مجھے بھی پیش آتی ہے۔ لیکن اصل ارادہ اور زبان سے ذکر کرنا ہے۔ تاکہ ذاکر اس خیال سے کہ ذکر قلبی جاری ہے ذہول میں مبتلا نہ ہو جائے، اس کے علاوہ نئے ارادہ کے ثواب سے محروم نہ رہے۔"

حضرت شیخ نے تواضعاً اپنی کیفیت کو طالب کی حالت کے مشابہ قرار دے دیا۔ ورنہ جس تاثیر میں ڈوب کر حضرت والاؒ کے اندرون قلب سے یہ آواز نکلتی تھی۔ اسکا اندازہ حضرت والاؒ کی اپنی اس تحریر سے ہو جاتا ہے۔ جو انہوں نے اپنے مرشد حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو ایک خط میں لکھی ہے۔ ارقام فرماتے ہیں:۔

" ذکر میں کبھی کبھی آواز ایسی دردمند ہوکر نکلتی ہے۔ جیسے کسی دُکھے ہوتے دل کے اندر سے نکلتی ہو۔ دو دفعہ تو ایسا نظر آیا کہ میں حالت نزع میں ہوں اور آواز آرہی ہے۔ اور ایک دفعہ دیکھا کہ میں شہید ہوگیا ہوں۔ اور آواز گلے سے نکل رہی ہے۔ اور دونوں میں عجیب لذت روحانی پائی"

ایک دوسرے احوال نامہ میں اپنے شیخ کامل کو لکھتے ہیں:

"...... اس کے بعد ذکر میں ایسی کیفیت ہوئی، کہ اللہ لفظ زبان سے محبت میں ڈوبا ہوا نکلنے لگا اور نکلتا رہا اور جسم میں ایسا رقص پیدا ہوا کہ بیٹھے بیٹھے عندالذکر جھومنے لگا۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ بوٹی بوٹی رقص میں ہے۔ اور اگر خلاف شرع ہونے کا خیال نہ ہوتا تو شاید میں اٹھ کر ناچنے تھرکنے لگتا۔ استغفراللہ"

اِن احوال کا اشارہ حضرت والاؒ نے اپنے اشعار میں بھی فرمایا ہے:

نام اُنکا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا ۔۔۔ تن سے جیسے روح بسمل مائل پرواز ہے

وجد میں جاں ہے تو اعضا رقص میں ۔۔۔ جام مے آواز الا اللہ ہے

گویہ "احوال" حضرتؒ کے ابتدائے سلوک کے ہیں، لیکن "تمکین" و "نہایتِ سلوک (عرفی)" کے بعد بھی 'اللہ' یا لاالہ الا اللہ کی صدا اس سوز و گداز و درد و کرب سے نکلتی تھی۔ کہ صاف "آغشتہ بخون" اور "دل و جگر" کے ٹکڑوں

ا؎ حکیم الامتؒ مرشد تھانویؒ کا عارفانہ جواب سنئے۔ "ذاکرین کو ایسے حالات پیش آتے ہیں جو علامت ہے، تاثیر ذکر کی اور یہ سب محمود ہیں مگر مقصود نہیں مقصود وراء الوراء ہے جس میں لطافت محض ہے۔ جسکا ادراک بھی بعض اوقات نہیں ہوتا۔ الا بعد العلم المستفاد من علوم الانبیاء۔

کی حامل معلوم ہوتی تھی

برادر معظم مولوی غلام محمد صاحب دام فیضہ شہادت دیتے ہیں،

"...... دوران گفتگو میں کبھی کبھی زبان مبارک سے بےساختہ 'اللہ' یا 'لاالہ الا اللہ' یا 'استغفر اللہ' کے کلمات آہستہ مگر اس قدر پُرسوز نکلتے تھے کہ سننے والے کے دل پر بجلی سی گر جاتی تھی۔ بلکہ بعض اہل جذبہ افراد تو بے خود ہو جاتے تھے۔ (تذکرہ سلیمان ص۳۰)

ایک مرتبہ فقیر نے عرض کیا کہ "حضرت ذکر کو کسطرح کرنا چاہیئے" ارشاد ہوا

"نالہ پابند نَے نہیں ہے"

پھر فرمایا۔ ع ___ 'وہ طرزِ نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے'

میرا ایک شعر ہے۔

وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں میرے نالوں کو
وہ طرزِ نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے

ایک مرتبہ سفر میں حضرت قدس سرہٗ اور فقیر کا ایک ہی کمرہ میں قیام تھا، پچھلی رات میں نطقِ سلیمانی نے جب داؤدی لے میں 'الا اللہ' 'الا اللہ' کا نغمہ ملکوتی ساز میں چھیڑا تو در و دیوار پر وجد کی کیفیت تھی۔ اور سننے والا اپنی ہستی نغمات قدس میں گم کر چکا تھا ؎

کیا بھری تاثیر میں مطرب تیری آواز ہے — جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

حضرت والاؒ کے بعض دیگر اشعار سے بھی حضرت کی کیفیت ذکر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

لذتِ خلوت بیان کیا کیجئے ایک میں ہوں اوران کا نام ہے
تیرے یاد آنیسے ہرغم مٹ گیا داروئے ہر درد تیرا نام ہے
نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا ذکر میں تاثیر دورِ جام ہے
دیکھنا ہو تو نگاہ شوق بن اسکی ہرسو بارگاہ عام ہے
بزم میں تنہا نظر آتا ہوں میں ایک میں ہوں اور خدا کا نام ہے

استحضار:-

لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کرسکیں شوقِ بے انداز پیچیدہ وہ میرے دل میں ہے
واکر اے مجنوں تواپنے دیدۂ مشتاق کو لیلیٰ پردہ نشین ہر پردۂ محمل میں ہے
ذکرِ حق سے صیقل کامل ہوا محو دل سے نقش ہر باطل ہوا
چار جانب بارشِ انوار ہے جلوہ فرما وہ مہِ کامل ہے ہوا
رٹتا ہوں تیرا نام کرتا ہوں تیرا کام[1] آتا ہے نظر جب کچھ اپنے میں ذرا ہوش
معلوم نہیں کس دم فرمائیں مجھے وہ یاد نام انکا نہ ہوا اے دل اک لحہ فراموش
سجدہ میں جہاں سر ہے گویا وہ تیرا در ہے کیا کیا نہ کہا تجھ سے پایا جو سراپا گوش
حاصل ہے تصور میں کیفیت معراج کیا کیا نہ مزا پایا، پایا جو ہم آغوش

---

[1] حاصل سلوک ذکرِ دائم اور ہر حال میں طاعت الٰہی ہی ہے - (م-ف)

حصولِ حقیقتِ ذکر کی معالجانہ تدابیر
اُور
اُنکی حیثیت

اللہ تبارک و تعالیٰ کی یاد میں دل کی کامل بیداری اور دھیان کے ساتھ مشغولیت ہی اصلِ ذکر ہے۔ اور "قلب" ہی حقیقتاً ذاکر ہے۔ اس لئے بشرطِ اخلاص تیقظِ قلبی جس قدر کامل ہوگا۔ اور توجہ جتنی تام ہوگی۔ اس قدر ذکر مقبول و مؤثر نورانی اور طمانیت قلبی کا سبب ہوگا۔ دل کی توجہ کو کلیتہً ذکر میں شاغل رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ "دل "غیر اللہ" سے فارغ اور پریشان خیالی سے مامون ہو۔ کہ جب تک فراغتِ قلبی اور یکسوئی خاطر میسر نہ آئے سالک کو انتشار و تشتت پریشان رکھتا ہے۔ اور وہ ذکر کی کما حقہ "یافت" سے محروم رہتا ہے۔ پریشان خیالی، اشتغالِ غیر اور وساوس انتشارِ قلبی کا عموماً سبب ہوتے ہیں۔ اس لئے محقق صوفیہ سالکین کی توجہ افرادِ ذکر (یعنی مذکور، ذاکر یا ذکر) پر مرتکز کرنے اور یکسوئی کیلئے مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ یہ تدابیر محض معالجہ کے طور پر ہوتی ہیں۔ انکی حیثیت محض ذرائع کی ہے۔ اس لئے

یہ کسی درجہ میں مقصود نہیں ہوتی۔ یہ تدابیر نہ تو بذاتہٖ عبادت ہوتی ہے اور نہ موجب ثواب و ترقی، اسلئے ان کا قرب ربانی میں بھی کوئی دخل نہیں ہوتا ان کا بڑا فائدہ صرف اتنا ہے کہ پراگندہ خاطر ذاکر کو ان کے اختیار کرنے سے یکسوئی نصیب ہوجاتی ہے۔ اور اسکی توجہ افراد ذکر پر مرکوز ہوجاتی ہے اور وہ وساوسِ قلبی اور انتشار ذہنی سے بچ جاتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی 'سلیم الطبع' طالب 'حقیقت ذکر' کو ان 'معالجانہ تدابیر' کے بغیر ہی حاصل کرسکے تو اسے ان 'تدابیر' کے اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

بعض سالکین 'ذریعہ' کو 'مقصد' سمجھنے کی غلطی میں ایسے مبتلا ہوجاتے ہیں کہ مقاصد کو گم کرکے ذرائع ہی کے درپے ہوجاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تدابیر و ذرائع کو ان کا اپنا مقام دیا جائے۔ اور مقاصد کو پہچان کر ان کے حصول کی کوشش کی جائے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ:-

"سالکین ذرائع کو مقاصد کا درجہ دے دیتے ہیں۔ اور مصیبت میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔"

اس لئے ضروری ہے۔ کہ سالک 'مقاصد' و 'ذرائع' 'غایات' اور 'تدابیر' میں تمیز و تفریق کرسکے۔ تدابیر و ذرائع میں غلو یا انہیں مقاصد و غایات سمجھ لینا اس راہ کا بڑا پتھر ہے۔ بلکہ بعض اوقات دائمی محرومی اور ناکامی کا سبب بن جاتا ہے۔ کہ سالک غیر مقصود کو مقصد قرار دے کر اس کا ایسے درپے ہوتا ہے۔ کہ منزل ہی کو بھول جاتا ہے۔ شیخ حاذق کا کمال یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ طالب کو اس پرخار وادی سے بچا کر لے جاتا ہے۔ اور اسے راہ کے

کانٹوں سے الجھنے نہیں دیتا۔ اور مقاصد و ذرائع غایات و تدابیر اور حق و باطل میں بے محابا تفریق کی لکیر کھینچتا چلا جاتا ہے۔ اور طالب سلوک کی واضح راہ کو بغیر کسی رکاوٹ علی وجہ البصیرۃ کے طے کرتا چلا جاتا ہے

ہمارے حضرت والا نور اللہ مرقدہٗ اس راہ کی گھاٹیوں کے ماہر راہ بین و رہنما تھے۔ اس لئے سالکین کو ابتدا ہی میں ان مراحل و 'عقبات' سے آگاہ فرما دیتے تھے۔ چنانچہ مختلف طالبین کے نام مکتوبات میں اسکی وضاحت ملتی ہے۔ ایک طالب کو 'ضرب' اور "نور کے تصور" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"...... پھر ڈھائی ہزار دفعہ 'اللہ' ذرا ہلکی آواز سے پڑھیں۔ ضرب کے ساتھ یا بلا ضرب (مگر یہ سمجھیں کہ یہ ضرب کوئی دینی امر نہیں ہے۔ بلکہ محض علاج کے طور پر ہے کہ موثر ہو)

...... ذکر کے وقت یہ تصور کریں کہ عرش سے نور آپ کے قلب پر پڑ رہا ہے۔ (یہ تصور بھی دینی امر نہیں ہے۔ بلکہ بطور معالجہ کے ہے۔ تاکہ یکسوئی ہو)"

انہیں کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"نور کے تصور کا استحضار نہیں ہوتا۔ تو کوئی حرج نہیں۔ یہ مقصود خود نہیں ہے۔ مقصود تو یکسوئی ہے۔ توجہ ذکر کے وقت دراصل مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ ورنہ ذاکر یعنی قلب کیطرف ہو۔ ورنہ ذکر

کی طرف ہو۔"

ایک طالب نے لکھا:

"قلب پر نقش اللہ کا بزنگ نقرہ وسفید تصور کرتا ہوں مگر رنگ کا تصور دیرپا نہیں ہوتا"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواباً ارقام فرمایا:

"زیادہ توجہ کی ضرورت نہیں۔ اور نہ اس کے لئے تشویش خاطر کی ضرورت ہے..... (یہ امور) غیر مقصودہ ہیں۔"

ایک مسترشد خاص نے لکھا:

"دورانِ ذکر لفظ 'اللہ' کا قلب پر تصور قائم نہیں رہتا.....اسکے قیام کی صورت سے ایما فرمائیں۔" حضرت الشیخ قدس سرہٗ نے ارقام فرمایا:

"جتنی دیر ہوتا ہے۔ وہ غنیمت ہے۔ اس پر مزید کاوش کی ضرورت نہیں۔ یہ مقصود بالذات نہیں۔ اور مزید کاوش سے اور پریشانی بڑھے گی۔" (تذکرہ سلیمان ص۲۲۹)

سالک مذکور نے ذکر میں انتشارِ خیالات کی شکایت کی۔ حضرت والاؒ نے علاجاً تحریر فرمایا:

"ذکر میں انتشار خیال سے پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے قلب و دماغ کو ایسا ہی بنایا ہے کہ اس میں حرکت فطری ہوتی رہے۔ یہ شاہی شاہراہ ہے۔ آپ کون اس کا پہرہ بٹھانے والے کہ اس شاہی شاہراہ پر چوہڑے چمار نہ چلنے پائیں۔ آپ اپنی راہ چلئے وہ اپنی راہ چلیں۔ حسب تجویز اعلیٰ حضرت حاجی (امداد اللہ) رحمۃ

آپ یہ خیال کیا کیجئے۔ کہ "اللہ اکبر! اللہ تعالیٰ کی بھی قدرت ہے۔ کہ دل کے ایک قطرہ میں خیالات کا سمندر بھر دیا ہے۔ اللہ رے اس کی عظمت وکبریائی؟" اس تصور سے یہ خیالاتِ پریشان معرفت کے آیات بن جائیں گے۔ ایسے وقت یہ شعر پڑھ لیا کیجئے۔

دور باش افکار باطل دور باش اغیار دل

سج رہا ہے شاہ خوباں کیلئے دربار دل" (تذکرہ صـ۳۴)

خیال رہے۔ یہ تصور بھی تدبیر ومعالجہ کے درجہ میں ہے۔ جسکی حیثیت طالب مذکور کو پہلے بتائی جا چکی ہے۔"

یہاں یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ 'یکسوئی خیال' کی بھی اختیاری حد تک کوشش کرنی چاہیئے۔ اپنی کوشش کے باوجود اگر 'یکسوئی' حاصل نہ ہو تو اسکی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے۔ بعض اذہان فطرتاً اتنے سریع الحرکت ہوتے ہیں۔ کہ ایک بات پر ان کا ارتکاز مشکل ہوتا ہے۔ اسلئے عقیدہ ومقصد کی صحت کا اذعان ویقین کافی ہے۔ اگر یہ حاصل ہے تو پھر انتشار کی فکر کئے بغیر اپنے معمولات ومشاغل اور اذکار میں مشغول ہو جانا چاہیئے۔ یکسوئی کی امکانی واختیاری کوشش کافی ہے۔ 'حصول یکسوئی' کے ہم مکلف نہیں۔ حضرت والا قدس سرہٗ کو ایک سالک نے لکھا،

"بحمد اللہ معمولات پر کاربند ہوں۔ لیکن خیال میں یکسوئی نہیں رہتی۔ بلکہ سخت انتشار رہتا ہے۔"

حضرت الشیخ نور اللہ مرقدہٗ نے جواباً ارقام فرمایا:۔

یہ شکر کا مقام ہے۔ یکسوئی عقیدہ کی مطلوب ہے۔ اور وہ آپ کو حاصل ہے۔ یعنی یہ کہ صرف خدا تعالیٰ کی رضا کیلئے آپ کام کر رہے ہیں یہی مقصود ہے۔ باقی یکسوئی خیال جس کا دوسرا نام محو ہو جانا یا انہماک ہے۔ نہ مقصود ہے۔ اور نہ ہر ایک کیلئے محمود" (تذکرۂ سلیمان ص۲۶۵)

حضرت والاؒ کا حکیمانہ جواب سالکین کیلئے سرمۂ بصیرت ہے۔ اسی سالک کے ایک دوسرے سوال کا جواب بھی عجب پرحکمت اور نافع ہے۔ سالک نے لکھا:

"بعض مرتبہ عجیب حال رہتا ہے۔ کہ نماز میں تو وہ یکسوئی و رجوع کی کیفیت نہیں رہتی لیکن اس کے بعد ذہن و قلب تمام تر متوجہ بحق محسوس ہوتا ہے۔ ... شاید یہ دھوکہ ہے۔ کیونکہ اگر یہ کیفیت واقعتاً رجوع کی ہے۔ تو نماز میں کیوں نہیں رہتی۔ حالانکہ نماز میں تو زیادہ قرب حاصل رہتا ہے۔"

حضرت والاؒ نے تحریر فرمایا:

"نماز میں اعمال مختلف ہوتے ہیں۔ جس سے وہ یکسوئی جس کو آپ یکسوئی سمجھتے ہیں نہیں ہوتی، کیا خدمتگار خدمات کے انجام دینے میں مالک کی محبت کی یکسوئی کا تصور کرتا ہے؟ مگر یہ خدمت خود ہی محبت کی دلیل ہے اور اطاعت کی، فافہم! نماز سے فراغت کی حالت میں یکسوئی مستمر ہو کر محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ کوئی چیز نہیں۔" (تذکرہ ص۲۰)

ایک دوسرے سالک کے اسی قسم کے سوال کے جواب میں تحریر فرمایا:

"زیادہ توجہ کی ضرورت نہیں۔ اور نہ اس کیلئے تشویش خاطر کی ضرورت ہے۔ ہر چیز اپنے وقت پر حسب استعداد اللہ تعالیٰ عطا فرمائینگے

ذکر و وساوس

وساوس ولاطائل خیالات ذکر و نماز و تلاوت وغیرہ کی حالت میں عموماً سالکین کو تنگ کرتے ہیں اور طالب کو اپنے میں پھنسا کر اللہ تعالیٰ کے دھیان اور اسکی مناجات سے غافل کردیتے ہیں۔ ہمارے حضرت والا قدس سرہٗ کے نزدیک وساوس کا علاج عدمِ التفات ہے۔ وساوس کی طرف جتنا دھیان نفیاً یا اثباتاً کیا جائیگا۔ اتنا ہی بڑھیں گے۔ ان کا علاج صرف یہ ہے کہ وساوس وخیالات سے توجہ ہٹا کر ذات باری تعالیٰ کی طرف یا معانی و الفاظ کی طرف کرلیجائے، وساوس آنا بند ہوجائیں گے۔ چونکہ وساوس کا آنا غیر اختیاری امر ہے۔ اس لئے برا نہیں۔ ان کا لانا برا ہے۔ سالک کو چاہیئے کہ ان خیالات سے یکسو ہوکر ایک ذات حق کی طرف متوجہ ہوجائے۔ اور کسی کی طرف عمداً التفات نہ کرے۔ پھر ہزار وسوسے آئیں تو بھی مضر نہیں۔ کہ اپنا کام وساوس سے عدمِ التفات اور افرادِ ذکر میں مشغولیت ہے۔

حضرت سیدّی قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ " مجھے حضرت والاؒ (یعنی مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک ابتدائی خط میں یہ جملہ لکھا تھا کہ " وساوس کا لانا منع ہے. آنا منع نہیں "

حضرت الشیخؒ فرماتے تھے کہ :

" وسوسہ تو شیطان ڈالتا ہے۔ اور اس لئے ڈالتا ہے۔ کہ سالک کو تکلیف ہو، حضرت مولانا تھانویؒ نے لکھا ہے کہ اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے تھے۔ کہ ان وساوس کو مرأۃِ جمال حق بنایا جائے کہ یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان ہے کہ اُس نے قلب کو ایسا بنایا۔ کہ اس میں طرح طرح کی چیزیں اور خیالات آتے جاتے ہیں۔ جب ان وساوس کو ذات حق کے دھیان اور قرب کا ذریعہ بنالیا جائے گا۔ تو شیطان وسوسہ ڈالنا چھوڑ دے گا۔ کہ اسکا مقصود تو ذاتِ حق سے ہٹانا تھا۔ اورجب وساوس خود ذات کی طرف توجہ کا ذریعہ بن گئے۔ تو اس کا مقصد کہاں پورا ہوا۔ قلب پر جب حضرتِ حق کا دھیان چھا جاتا ہے تو وساوس خود بخود کافور ہو جاتے ہیں "

اِسی کے متعلق کہا گیا ہے

کشاکشہائے رنگا رنگ سے چھوٹوں قرار آئے
مقیم اس گھر میں ہو جاتے، اگر یہ میہمان دل

حضرت الشیخ قدس سرہٗ ایک خط میں لکھتے ہیں ،

"وساوس کا واقع ہونا مضر نہیں۔ چور وہاں آتے ہیں جہاں دولت ہوتی ہے۔ شیطانی وساوس کے آنے کو بھی ایسا ہی سمجھا جائے اور انکی طرف سے ذہن کو پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف کر لیا جائے۔ عدم التفات ہی اس کا علاج ہے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں ہے۔

"بیہودہ اور ناپاک خیالات کا پیدا ہونا اگر اپنی طرف سے نہیں تو انشاء اللہ مضر نہیں۔"

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"اگر وسوسہ کفر مضر نہیں تو وسوسہ گناہ کیسے بُرا ہو سکتا ہے"

ایک سالک کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"یہ وساوس کبھی کبھی آتے ہیں۔ اور اسی امر سے کہ آپ اس کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے پیش آنے سے مشوش ہیں، یہ ثابت ہوتا ہے کہ

حاشیہ: صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ سے وسوسہ کے متعلق سوال کیا گیا۔ اور صحابہؓ نے عرض کیا۔ کہ ہم میں سے کوئی اپنے دل میں ایسے (برے) وسوسے پاتا ہے کہ اسکو زبان پر لانے سے جل کر کوئلہ ہو جانا یا آسمان سے زمین پر گر جانا زیادہ پسند کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "یہ عین ایمان کی علامت ہے" ابو داؤد نے ایک دوسری روایت میں ابن مسعودؓ سے ہی نقل کیا ہے۔ کہ آپؐ نے فرمایا، "الحمد للہ الذی ردّ کیدہ الی الوسوسہ"۔ سب تعریف اللہ کیلئے ہے۔ جس نے شیطان کے مکر کو صرف وسوسہ تک ہی رکھا۔ (جمع الفوائد ج ۱ ص ۱۹ بحوالہ مسلم و ابوداؤد) ـــ م۔ و

بحمداللہ ایمان محفوظ ہے۔ ایسے موقع پر استغفار اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ کی کثرت کیجئے۔ اور ادھر سے دل پھیر کر دوسرے کام میں لگ جائیے التفات بھی نہ کیجئے۔ اور دعا کیجئے۔

یامقلّب القلوب ثبت قلبی علی دینک " (تذکرہ صنہ۵۴)

ایک اور مبتدی طالب کو تحریر فرمایا:۔

" شکوک کا علاج توبہ و استغفار ہے۔ اور اپنے کام میں انہماک شکوک بیکاروں کو ہوتے ہیں۔ کام کرنے والوں کو نہیں۔ "۔

بعض اوقات بُرے خیالات دماغی ضعف یا معدہ کی خرابی سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ انکا علاج دوا وغیرہ کا استعمال اور عدم التفات ہے حضرت والاؒ اس عارضہ میں مبتلا ایک سالک کو تحریر فرماتے ہیں ؛

" یا تو آپ کے معدے کا فعل خراب ہے۔ یا دماغی ضعف ہے غور کیجئے۔ کہ کوئی خاص ایسی بے اعتدالی تو نہیں ہو رہی ہے جس سے ضعف پیدا ہو۔ اگر یہ دونوں باتیں نہیں تو محض وہم ہے۔"

بعض اوقات سالک اپنے خیالات و اوہام کی بوقلمونیوں اور حجابات نورانی کی دلفریبیوں میں الجھ کر ذکر سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ۔

" اصل یہ ہے کہ ان سب کو قلب سے خارج کر کے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ سن رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ جواب دے رہے ہیں۔ جیسا کہ خود ارشاد ہے۔ ادعونی

اُستَجِبْ لَکُمْ اُذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ، اس لیئے انسان یقین کے کانوں سے کیوں نہیں سنتا کہ جب وہ اللہ اللہ کہتا ہے۔ تو اسکا جواب 'عبدی عبدی' دیا جاتا ہے۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا۔ کہ تمہارا نام اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ تو فرطِ شوق و محبت میں رو پڑے کہ میرا نام اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ اور ہمیں اللہ تبارک تعالیٰ خود کہتے ہیں کہ۔ "تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کرونگا۔ پھر ہمیں کیوں یقین نہیں آتا کہ جب ہم اللہ اللہ کہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ 'عبدی عبدی' کہہ کر ہمارا جواب دیتے ہیں۔"

اگر سالک رؤیت الٰہی، سماعتِ ربانی، قربت رحمانی کے یقین و اذعان کے ساتھ ان کا حق سمجھ کر ذکر کرے۔ تو اس کے اثرات و برکات سے ضرور سینہ و دل سراپا نور ہو جائے گا۔ اور تمام وساوس و اوہام خود بخود کافور ہو جائیں گے۔ ایسے ہی ذکر کے متعلق حضرت شیخ قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔

اور ہی مٹ جائیگی تاریکی افکارِ دل — خانہ دل میں جو پھیلیں گے کبھی انوارِ دل
جمع وہ سامان ہو جسکی خریداری بھی ہو — سوچ کر اسے دل لگانا چاہیئے بازارِ دل
قلب عاشق بھی ہے پھر ہمسایہ عرشِ بریں — جلوہ فرما مسندِ دل پر اگر ہو یارِ دل

ذکر حق سے صیقل کامل ہوا — محو دل سے نقش ہر باطل ہوا
چار جانب بارشِ انوار ہے — جلوہ فرما وہ مہ کامل ہوا

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا — ذکر میں تاثیر دورِ جام ہے
بزم میں تنہا نظر آتا ہوں میں — ایک میں ہوں اور خدا کا نام ہے

ذکر و طمانیت قلبی و نزول سکینہ

انسانی 'قلوب و ارواح' فطرتاً مستور ازل کے طالب و شیدائی ہیں۔ کہ انسان کا خمیر عشق و محبت کے آب و گل سے ہوا ہے۔ 'یوم الست' کی نفئ در ربوبیت کبریا' کی تجلی نے 'ارواح' کے اندر جذب الی اللہ اور اشتیاق ربانی کی تخم ریزی کر دی تھی۔ اسی طرح ازل میں بنی آدم نے تکلیفات شرعیہ کے بارِ امانت کے اٹھانے اور سنبھالنے پر جو آمادگی ظاہر کی وہ بھی اسی جذبۂ عشق کا نتیجہ تھی۔ جو انسانی قلوب کے اندر فطرتاً ودیعت کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ محققین نے تصریح کی ہے۔ حدیث شریف میں ہے :-

انّ الامانۃ نزلت فی جذر قلوب الرجال ثم علموا من القران ثم علموا من السنۃ	(ازل میں) امانت کا نزول انسانوں کے دلوں کی جڑ میں ہوا تھا۔ پھر اس عالم میں اس نور امانت کی برکت سے بتوفیق الٰہی
(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم صفحہ ۴۶۱ بروایت حذیفہؓ)	انہوں نے قرآن کو جانا پھر سنت کا علم حاصل کیا۔

حافظ نے کیا خوب کہا ہے :-

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
آسمان بارِ امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اِس جذبہ روحانی اور جذبہ عشق نے ارواح و قلوب کے اندر محبوب حقیقی کا اشتیاقِ والہانہ اور اسکی جستجو و طلب، تلاش و یافت کا داعیہ پیدا کر دیا ہے۔ اور ان کا سکون و قرار اسی ذاتِ جلیل و جمیل کا دھیان و اشتغال اور یاد و ذکر کو بنا دیا ہے کہ محبِّ صادق کا سرمایہ تسکین و طمانیت، محبوب و یادِ محبوب ہوتا ہے۔ بقول شخصے

در دو عالم از دو عالم ایں ہمیں خوش آید مرا
روئے تو یا بوئے تو یا خوئے تو یا کوئے تو

خصوصاً عشاق ربانی کیلئے تو چین و سکون کی واحد و تنہا جگہ خلوت گاہ حق ہی ہے۔ بقول عارف رومی

گر گریزی بر امید راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے
ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

حضرت والاؒ فرماتے ہیں:

پناہ اے دل خدنگ ناز قاتل سے نہیں ملتی
جو مل سکتی ہے تو پھر سایۂ دامان قاتل میں
اسے کب غموں سے رہائی ملے جو وابستہ ماسوای اللہ ہے۔

حضرت الشیخ قدس سرہٗ ایک گرامی نامہ میں ارقام فرماتے ہیں:

"اختلاط مع الانام بے شبہ تعلق باللہ میں حارج ہے۔ گو اپنی

نیت صحیح ہو، جس کا ثواب ملے گا۔ مگر نجاستوں کی پلیدی سے تو چارہ نہیں۔ اگر کوئی کوئلہ کے گرد وغبار کو حسنِ نیت سے صاف کرے تو ثواب ملے گا۔ مگر ہاتھوں اور کپڑوں میں سیاہی لگنا ممکن ہے۔ اس دنیا میں سکون صرف تعلق باللہ اور ترک علائق غیر میں ہے۔ ؎

نہیں جمعِ دل جمع اسباب سے رہ جمعِ دل ذکر اللہ ہے:

اِس لئے اہل قلوب وسالکین کی "کہفِ سکون واطمینان" خلوت گاہ حق جل مجدہٗ ہے۔ جو ذکر حقیقی (یعنی ذکر دائم اور طاعات ربانیہ) کا ثمرہ ہے یہی وجہ ہے کہ "خاصان خدا" کا یہ گروہ مجمع و تنہائی خلوت وجلوت ہر حال میں ہر آن قلباً وقالباً اللہ تعالیٰ میں شاغل رہتے ہیں۔ انکی زبانیں ذکر ربانی سے تر، ان کے دل اسکی یاد سے روشن اور اُن کے اعضاء جوارح اس کے احکام و اوامر کی اطاعت و پیروی سے خنک وشاداں رہتے ہیں۔ کہ خلوت گاہ حق، کا حصول مشغولیت بحق اور" فراغت غیر سے ہی ممکن ہے۔ جو ظاہر و باطن قلب و جوارح کے جملہ احکام کے امتثال واشتغال سے میسر آسکتی ہے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (المزمل - ۱) پس جس کا جی چاہے۔ اپنے پروردگار کی طرف کا راستہ اختیار کرے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (النبا - ۲) پس جو چاہے اپنے رب کے پاس اپنا ٹھکانہ بنا رکھے۔

مزید برآں جب بندہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس بندہ کو

ایک خاص ' عنایت و التفات ' محبت و عطا ' کے ساتھ یاد فرماتے ہیں۔
ایک عاشق صادق اور طالبِ مخلص کے لئے اس سے بڑھ کر کیا انعام اور مسرت و چین کا کیا پیغام ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا ' ذکر ' اسے یادِ محبوب جلّ و علیٰ میں لے آئے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی توجہات و رحمت کو اسکی طرف مبذول کرا دے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ارقام فرماتے ہیں :

" ذکر کا خلاصہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق۔

اُذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ   تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کرونگا

اس سے بڑھ کر نعمت کیا ہو سکتی ہے کہ ذاکر کو بوقت ذکر خود حق تعالیٰ یاد کرتے ہیں۔ ذرا اس کا تصوّر تو کیجئے۔ اور جب اللہ کہئے تو تصور کے کان سے سنئے کہ عبدی کی آواز آتی ہے ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا میرے لئے انعام ہے
آپ خود سنتے ہیں آکر جو میرا پیغام ہے (تذکرہ ص ۱۴۳)

حدیث قدسی میں ہے ۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

" جو مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے میں بھی اسے (لطف و محبت ' رضا و عطا کے ساتھ) خود یاد کرتا ہوں ۔ اور جو شخص مجھے مجمع میں یاد کرتا ہے۔ میں اسے اس سے بہتر (ملاءِ اعلیٰ و فرشتوں کے) مجمع میں (فخر و محبت و ستائش کے ساتھ) یاد کرتا ہوں '

(روح المعانی بحوالہ صحیحین ص ۴۲۶ ج ۱)

حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"جب بھی لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے کیلئے بیٹھتے ہیں. تو رحمت کے فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں۔ رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔ اور سکینہ (اطمینان وچین والی رحمت) اُن پر نازل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ (فخر و عنایت سے) ان کا تذکرہ ان (فرشتوں وغیرہ) سے کرتے ہیں۔ جو ان کے پاس ہوتے ہیں۔" (مشکوٰۃ ص۱۹۶ بحوالہ مسلم)

غرض اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ قدس میں ذاکر کا ذکر لطف و رضا کے ساتھ ذاکر کیلئے گنجینہ سعادت بن جاتا ہے۔ فرشتوں میں اسکا تذکرہ 'ملاء اعلیٰ' کی توجہات خاصہ کو ذاکر کی طرف ملتفت کرا دیتا ہے۔ اور فرشتے جب رحمت الٰہیہ سے بھر کر ذاکر کو گھیر لیتے ہیں۔ تو اُنکی 'ملکوتی تاثیر' سے "قلبِ ذاکر" کے 'ملکات قدسیہ' زندہ اور بارآور ہو کر (خصوصی رحمتوں' اور عنایات خاصہ کے سنبھالنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں بارگاہ الٰہی سے ایک خاص اطمینان و چین والی رحمت کا 'القا' ہوتا ہے۔ جس کا پیہم نزول ذاکر کے قلب میں سکون وراحت والی ایک "نسبت راسخہ" اور 'ذاکر و مذکور' کے درمیان ایک 'رابطہ قویہ' کے تحقق وثبات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ گویا ذکر کی مداومت و مواظبت پر ذاکر کے قلب پر 'حسن طمانیت خاصہ' اور پرسکون وپُرنُور نسبت الٰہیہ کا فیضان فرمایا جاتا ہے۔ اس کا ایک عنوان 'سکینہ' ہے۔ جس کا کچھ حصہ ہر ذاکر کو ملتا ہے۔ لیکن "دائمی نسبت راسخہ" کی حیثیت سے اس کا حصول انہیں

"خاصانِ خدا" کا نصیبہ ہے۔ "حقیقتِ ذکر" جن کا مقام ہے۔

طمانیت قلبی و "سکینہ" اہل اللہ کے دلوں کا سرمایہ ہے۔ یہ وہ عطیہ ربانی ہے۔ جسے تمام عالم کی متاع جمع کر لینے یا خرچ کر دینے سے بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا، سچ کہا ہے ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اِس متاعِ عزیز کی تمنا کرتے ہوئے ایک عاشقِ صادق فرماتے ہیں ؎

می برد بے تابی دل کو بجو   بر دوات صبر و سکونم آرزوست

بہرحال ذکر کے آثار میں رضائے حق کے بعد "طمانیت و سکینہ" کی دولت سرفہرست ہے۔ جو سالکین کے سینہ کو رشک بہاراں بنا دیتی ہے ؎

سوئے جہاں بھی آنکھ اٹھانا ہے بار دل
سر کو جھکائے دیکھ رہا ہوں بہار دل

نسبت باطنی یا
نسبت الٰہیّہ ونسبت محمدیّہ

سالک کو جب ' ذکر تام میسّر آجاتا ہے۔ جس میں جملہ افرادِ ذکر، ظاہری و باطنی کامل اطاعتِ شریعت واتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شامل ہے تو اسے عادتاً رضاء وقربِ ربّانی اور عطاؤنوال رحمانی کی ایک ' نسبتِ دائمہ ' سے نواز دیا جاتا ہے۔ اس 'نسبت' کا فیضان سالک کیلئے مزید مہمیزِ عمل، محرکِ ذکر، مُثمرِ یقین و اذعان، مُفید احسان وحضور، سببِ ازدیاد تقویٰ، ذریعہ استقامت و مداومتِ اعمال اور باعث مواظبتِ سنتِ نبوّیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والتحیہ) بن جاتا ہے اور اسکی رضا وقرب حق کی جستجو وکوشش میں اضافہ اور رغبت ورہبت ' و شوق وطلب اور ہدایت وتقوی میں زیادتی ہوجاتی ہے۔

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ	اور جن لوگوں نے راہ پائی۔ اللہ تعالیٰ
هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ	ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے۔ اور
(محمّد - ۳)	انکو تقویٰ کی توفیق دیتا ہے۔

وہ تشریعاً وتکویناً، قلباً وقالباً اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کو اپنی رضا اور اسکی خوشنودی کو ہی

زندگی کا حاصل و مدعا سمجھتا ہے۔ احکام الٰہیہ سے اسے طبعی مناسبت اور کفر و عصیان سے اسے حقیقی نفرت میسّر آجاتی ہے۔ اس عالم میں پیش آنیوالے جملہ حوادث و نوازل کو وہ 'شئون و صفاتِ الٰہیہ' کی پُر حکمت تجلیات سمجھتا ہے۔ اور نتیجۃً تفویضِ تام' صدقِ توکل' اور 'تسلیم و رضا' کے مقام پر فائز ہوجاتا ہے۔

غرض نسبتِ الٰہیہ اس تعلق کا نام ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے محض لطفِ خاص سے بندہ کو نصیب ہوتا ہے۔ اللہ جلّ جلالہ و عمّ نوالہ اپنی رضا و قرب اور ظاہری و باطنی بخششوں سے اسے نوازتے رہتے ہیں اور بندہ ان کی چاہت و قربت، ذکر و فکر، دھیان و دھن، اطاعت و فرمانبرداری کو اپنی مراد قلبی اور مقصودِ زندگی بنالیتا ہے۔ وہ مراد و محبوبِ حق ہوتا ہے۔ اور اسکا وظیفہ عبدیت و عبودیت کے فرائض کی بجاآوری، نعمہائے الٰہیہ کا شکر اور رضائے دوست پر اپنی خواہشات کی قربانی ہوتا ہے۔ وہ بزبان حال پکارتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

گویا اللہ تبارک و تعالیٰ اور سالک میں محبوبِ حفی[1] و وفی (مہربان و وفا شعار) اور عاشقِ صادق و مطیع کی نسبت قائم ہوجاتی ہے۔ حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ مسعود عالم ندوی مرحوم کو لکھتے ہیں:

"......طلب و رضا اور اپنے ہر عمل میں طلب رضا کا شعور پیدا ہونا یہی

---

[1] قرآن کریم نے ابراہیم خلیل علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے:

اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا (مریم-۴۷) بے شک وہ (اللہ) مجھ پر بہت مہربان ہے

اس طریق کا حاصل ہے۔ اور جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اسکو نسبت کہتے ہیں۔ اور قرآن پاک کی زبان میں اسکی تعبیر یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ اور رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کے لفظوں میں کی گئی ہے۔ یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً۔ ان ہی کے لئے نوید بشارت ہے۔" (مکاتیب سلیمان ص۱۷۶)

سالک اس نسبت باطنہ، کو موہبتِ ربانیہ' اور نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہے فریضۂ شکر اور حقوق و واجباتِ نعمت حسب استطاعت بجا لاتا ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کی خشیت و بے نیازی کا خوف اور اپنے اعمال کے نقص و کمی کے اندیشہ سے "زوال نعمت" کا خدشہ اُسے ہمیشہ خائف و ترساں رکھتا ہے اور آخری سانس تک دغدغہ اور قرب و رضائے حق کی فکر و کوشش میں منہمک رہتا ہے۔ کہ "عبدیت" کا مجاہدہ آخری سانس تک ختم نہیں ہوتا ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش تا دم آخر دمے فارغ مباش

یہ نسبت الٰہیہ محض فضلِ صمدانی اور عطیۂ رحمانی ہے۔ عقائد و اعمال کی صحت، ذکرِ کامل کا رسوخ، اور اعمال صالحہ (ظاہری و باطنی) پر استقامت اس کیلئے بمنزلہ شرط کے ہے۔ پس سالک کو چاہیئے کہ وہ عقائد کی درستگی، ذکر کی پختگی، اعمال کی تحسین، اخلاق کی تزئین، معاملات و معاشرت کی صفائی و پاکیزگی اور اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پورے دھن و دھیان اور اخلاص و توجہ سے مصروف رہے۔ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس فضل میں سے اسے حصہ مل سکے۔

بات ہے کہ سالک کمالِ اخلاص وتحسین سے جب احکام الٰہیہ کی کامل (ظاہری وباطنی) پابندی کرتا ہے۔ اور اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا شعار بنالیتا ہے 'ذکر تام' کا رسوخ اس کے دل کو ہر غیر سے فارغ اور ذات جلّ وعلیٰ شانہ' میں شاغل کر دیتا ہے۔ اور اسے ان اعمال پر مداومت و مواظبت نصیب ہوجاتی ہے۔ تو 'رحمت الٰہیہ' کی ایک خاص تجلی اس کے 'دل' پر وارد ہوکر متمکن ہوجاتی ہے۔ جو اسے ہر آن ذات واحد ومتعال میں بطرزِ خاص شاغل کردیتی ہے۔ اور اسے اسکے الطاف وعطایا کا محل بنادیتی ہے

اِس نسبت کا ورود وتحقق اکثر انجذاباً ہوتا ہے۔ بندہ کی طاعات پر استقامت اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر مواظبت 'توجہات الٰہیہ' کو اسکی طرف ملتفت کرادیتی ہے۔ احکام کی اطاعت سے قرب کی منازل طے ہوتی ہیں۔ اتباع نبوتؐ میں جذب کی خاصیت ہے۔ جس سے محبوبیت و مراویتِ ربانی کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ذکر حقیقی کی یافت ودوام بارگاہِ قدس جلّ جلالہ' وعم نوالہ' میں سالک کے رضا ومحبت کے ساتھ ذکر وتذکرہ کا سبب بن جاتا ہے۔

حدیث قدسی میں ہے :۔

"جو مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے۔ میں بھی اسے (لطف و محبت، رضا و عطاء) کیساتھ خود یاد کرتا ہوں۔ اور جو شخص مجھے مجمع میں یاد کرتا ہے۔ میں اسے اس (ملاء اعلیٰ یا فرشتوں کے مجمع) میں (فخر ومحبت وستائش کیساتھ) یاد کرتا ہوں۔ (روح المعانی بحوالہ بخاری ومسلم ص۱۲۱ ج ۱)

اس "نسبت و ارتباط" کی صورت مثالیہ ملاءِ اعلیٰ میں اسطرح ظہور پذیر ہوتی ہے کہ ذاکرِ محب و مطیع کا 'ذکرِ خیر' یادِ الٰہی اور اعمال صالحہ[1] کی وجہ سے بارگاہِ قدس جل مجدہٗ میں 'رضا و محبت و رحمت[2]' کیساتھ متواتر ہوتا رہتا ہے۔ اس کا انعکاس 'ملاءِ اعلیٰ' میں رضامندی و محبت و انس کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور ملاءِ اعلیٰ کی توجہاتِ خاصہ اس عبدِ صالح و ذاکر کی طرف[3] ہوجاتی ہے۔ اور اسکا ترشح 'قلبِ ذاکر' پر ایک خاص قسم کی طمانیت[4] وسکون وسکینہ کی صورت میں موسلا دھار بارش کی طرح ہوتا رہتا ہے۔ جسکی وجہ سے اسکے 'ملکاتِ باطنی' ملاءِ اعلیٰ سے ایک خاص قسم کی انسیت و نورانیت کو اپنے اندر پاکر صفاتِ ملکوتیہ کا تشابہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اب ان 'ملکات

[1] قرآن کریم میں ہے:۔ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرہ۔۱۸) تم میرا ذکر کرو۔ میں تمہارا ذکر کرونگا۔

علامہ آلوسی بغدادیؒ فاذکرونی کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

والقلب فاذکرونی ای بالطاعۃ قلباً وقالباً فیعم الذکر باللسان والقلب والجوارح فالاول کما فی المنتخب الحمد والتسبیح والتحمید وقرأۃ کتاب اللّٰہ والثانی الفکر فی الدلائل الدالۃ علی التکالیف والوعد والوعید وفی الصفات الالٰہیۃ والاسرار الربانیۃ والثالث الاستغراق الجوارح فی الاعمال الامور بما خالیۃ عن الاعمال المنھی عنھا۔۔ (روح المعانی ج۱ ص۳۳۱)	پس میرا ذکر کرو دل وجسم کی طاعت کیساتھ، پس ذکر زبان، دل اور اعضاء سب کیلئے عام ہے۔ پہلے (زبان کے ذکر (جیسا کے المنتخب میں ہے) سے مراد الحمد، تسبیح، تحمید اور تلاوت کتاب اللّٰہ ہے۔ اور دوسرے یعنی دل کے ذکر سے مدعاء ان دلائل میں غور وفکر کرنا ہے۔ جو احکام الٰہی اور اللّٰہ تعالیٰ کے وعدوں اور وعیدوں کے بارے میں ہیں، اسی طرح صفات الٰہی اور رب تعالیٰ کے اسرار کے متعلق سوچنا بھی اسی میں شامل ہے۔ اور تیسری بات اعضاء کا ذکر ہے کہ انہیں ماموراتِ الٰہیہ کے مطابق احکام کا پابند رکھا جائے اور منہیات سے روکا جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

کی غذائے باطنی اوامرِالٰہیہ کی پابندی، سنت نبویہ کا اتباع کامل، فضائل اخلاق سے آراستگی اور توجہ الی اللہ اور کیفیت احسان وحضور وغیرہ ہوجاتی ہے۔ اس کے سفلی تقاضے دب جاتے ہیں۔ اور ملکوتی صفات اور جواہر باطنی متجلّی ہوجاتے ہیں۔ ملاءِ اعلیٰ کی ہر آن کی توجہات اس کے 'باطنی جواہر' کو زندہ' بارآور اور مُثمر کر دیتی ہیں۔ اور وہ الٰہی رنگ میں نکھر کر اخلاق الٰہیہ سے متصف ہوجاتا ہے اور یہ بندہ خلیفۂ الٰہی مظہرِ صفات ربّانی بن کر اور اتباع نبویہؐ سے منور ہوکر کائنات

گویا ذکر انسانی سے مدعا یادِ الٰہیہ کے جملہ اقسام اور اعمال صالحہ کی جملہ انواع ہیں

دوسری آیت ہے

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ	جو شخص عزت حاصل کرنا چاہتا ہے تو تمام تر عزت
جَمِيْعًا اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ	اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے۔ اللہ تعالیٰ تک اچھا کلام بلند
الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر-۲)	ہوتا ہے اور عمل صالح اسکو بلند کرتا ہے

(پس جو شخص جس درجہ کی عزت چاہتا ہے۔ اسے چاہیئے کہ اس درجہ کی ایمان و اعمال صالحہ میں کوشش کرے حسب ظرف وعمل عزت مل جائیگی۔ (دیکھو ابن کثیر ج۳ ص۵۴۹ وتفسیر کبیر زیر آیت مذکورہ)

۲؎ مفسر ابن کثیر نے اذکرکم کی تفسیر میں لکھا ہے "میں تمہارا رحمت ومغفرت کیساتھ ذکر کرونگا" (تفسیر ابن کثیر ص۱۹۶ ج۱)

۳؎ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتۂ خاص جبرئیل سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں۔ تم بھی اسکو پیار کرو، تو جبریل اسکو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اسکو پیار کرتے ہیں۔ اور پھر زمین میں اسکو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔

(سیرۃ النبیؐ ص۵۹۱ ج۱؛ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب)

۴؎ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (الرعد-۴) خوب سمجھ لو کہ ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوجاتا ہے۔

کی زینت بنتا ہے۔ تقدیرِ ربانی اپنی حکمت بالغہ کے مطابق اس پر حقائق واسرار کو منکشف کردیتی ہے۔ اور وہ ایسے مقاماتِ خاصہ اور احوال عجیبہ سے نواز دیا جاتا ہے جس کا وہم وگمان بھی عام اذہان نہیں کرسکتے ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء　　بے کتاب و بے معید و اوستا (رومیؒ)

ہر دمے اور ایکے معراج خاص　　بر سر فرقش نہد حق تاج خاص

صورتش در خاک و جاں در لامکان　　لامکانے فوق وہم سالکان

لامکانے نے کہ در وہم آیدت　　ہر دمے در وے خیالے زایدت

بل مکان و لامکان در حکم او　　ہمچو در حکم بہشتی چار جو

نسبت محمدیہ

یہاں اس نکتہ کو واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت بالغہ نے اس عالم میں اپنے تک رسائی اور اپنی قرب و رضا کو انبیاء علیہم السلام کے طریقوں میں منحصر کردیا ہے۔ اب جبکہ سید الانبیاء خاتم النبین رحمۃ للعٰلمین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں تا قیام قیامت آخری نبی اور رسول بنکر تشریف لائے ہیں۔ اور آپکا دورۂ نبوت قیامت تک ممتد و مستمر کردیا گیا ہے۔ اور آپکے فیوض و برکات کو بھی قیامت تک جاری وساری رکھا گیا ہے۔ اب تمام انسانوں کیلئے آپ کا اسوہ، آپ کے احوال و سنن اور ظاہری و باطنی انفرادی و اجتماعی اعمال ہی قربت حق کا واحد ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ 'نسبت حقہ' کا حصول اتباع نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) میں مندرج کردیا گیا ہے۔ اب 'نسبت الٰہیہ' کا ترتب اور عطائے رب کا ظہور اسی قدر ہوگا جسقدر 'نسبت محمدیہ' کامل ہوگی۔ یا یوں کہیئے۔ کہ رحمت الٰہیہ نے رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رحمتوں کا 'قاسم' بناکر مبعوث فرمایا ہے۔ جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ کی غذا صرف ماں کے واسطے سے مقدر فرمائی گئی ہے۔ یا

جیسے میٹھا پانی جہاں کہیں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کا آخری سرا تقدیر الہٰی نے بادلوں پر منتہی کیا ہے۔ اسی طرح ہدایت یابی اور وصول الی اللہ کے جملہ طرق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور آپکے لائے ہوئے دین کی تابعداری میں منحصر ہیں۔ اور سینہ نبوت کے نورانی سوتے ہدایتِ امت کا واحد ذریعہ ہیں۔ گویا نسبتِ الہٰیہ کا تحقق نسبتِ محمدیّہ کے ساتھ مقرون ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ نسبت الہٰیہ کے حصول کیلئے حقوقِ نبویّہ کی ادائیگی ضروری ہے۔ اور حقوق نبویہ اجمالاً چار عنوانات میں بیان کئے جاسکتے ہیں

۱۔ عظمت نبوی | یعنی آپ کے مقام رسالت کو کما حقہ مانا جائے۔ اس کا فرد اعظم ختم نبوت کا، قلباً، قولاً و عملاً اقرار ہے کہ آپ پر زمانی، مکانی ہر لحاظ سے ظاہراً و باطناً نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ اب جسے بھی ملیگا۔ جہاں بھی ملے گا۔ اور جب بھی ملے گا اور جتنا ملے گا۔ عطاہائے الہٰیہ کا ہر ذرہ اسی شمس النبوۃ والرسالۃ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرہ نبوت میں آکر ملے گا۔ اس 'محیط نبوت' سے باہر ہدایت کی کوئی سبیل نہیں۔ بقول سید الملۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ ؎

لے جائیگا منزل سے پرے دور بشر کو
جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

۲۔ محبت نبوی | یعنی آپ کی عقلی و شرعی و طبعی محبت جو آپ کے احکام کی تابعداری پر منتج ہو۔

۳۔ اتباع نبوت | آپؐ کے ظاہری و باطنی احکام میں آپؐ کے منشاء کے مطابق آپ کی کلی پیروی کا اہتمام، کہ فیضان نبوتؐ اور فیوض و برکاتِ

رسالت کا اتنا ہی حصہ اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جسقدر آپ کے اعمال کو اپنایا جاتا ہے۔ آپکے اتباع' اور آپ والے اعمال میں آپ کی ذات بابرکات سے استفادہ کی قوت اور جلب حبِ رب کی خاصیت ہے۔

۴:۔ نصرت نبویؐ | آپ کے دین کی بقا و حفاظت کیلئے حسب استعداد اور بمطابق احکام شریعت نصرت، یہاں تک کہ اگر جان کی بازی لگانی پڑ جائے۔ تو اس سے بھی دریغ نہ کرے۔

بہرحال مدعا یہ ہے۔ کہ نسبت الٰہیہ کا فیضان حقوق محمدیہ کی ادائیگی کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ نسبت اپنے ساتھ ہے اور یہ نسبت ہے مختلف ازمان اپنا

مختلف افراد کی صلاحیتوں اور استعدادوں کے مطابق ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اور افراد متعلقہ کو نسبت الٰہیہ کے ساتھ نسبت محمدیہ سے بھی نواز دیتی ہے کہ دونوں نسبتیں لازم و ملزوم ہیں۔ (ذالك ماعندی والله اعلم بالصواب)

چھٹا باب

چھٹا باب

نماز

نماز مومن کا معراج اور بقول حضرت مجدد سرہندیؒ اس عالم میں قرب الٰہی کا انتہائی مقام ہے۔ مومن کی زندگی جس قدر نماز سے متاثر ہوتی ہے. کسی دوسرے عمل سے نہیں ہوتی۔ کہ کمال عبدیت اور خصائل عبودیت نماز کی باقاعدہ اور صحیح بجا آوری سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ کہ عبدیت کا حاصل ہے خواہشِ نفس کو دبا کر ہر حال میں احکام الٰہی کی بحسن اخلاص تعمیل و تکمیل ہے۔ نماز میں بندہ اپنی مرضیات و خواہشات کو مٹا کر ظاہراً و باطناً، قولاً و عملاً اوامرِ الٰہیہ کی پابندی کرتا ہے۔ کبھی رضائے الٰہی کے حصول کیلئے اپنے آقا کے سامنے ہاتھ باندھے اسکی پسند کے کلمات پڑھتا ہے۔ اور اسکی کبریائی وصمدیت اور عظمت وجبروت اور اپنی نیستی وپستی، کم مائیگی (ہیچمیرزی) کا اعتراف کرتا ہے۔ کبھی اس حسن ازل کے سامنے جھک کر بندگی کا ثبوت دیتا ہے۔ اور کبھی بارگاہ جلال میں اپنی بلند پیشانی کو نیازمندی کی خاک سے عزت بخشتا ہے۔ جو پروردگار کا حکم ہوتا ہے وہی کرتا ہے۔ جو اس کی مرضی ہوتی ہے وہی کہتا ہے۔ نماز وہ عبادت ہے جس میں انسان کا دل و دماغ

جسد و روح، ظاہر و باطن بیک وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کی بندگی اس کے احکام کی تابعداری، اس کے دھیان اور اسکی رضا کے حصول کی کوشش میں مشغول ہوتا ہے۔ نماز کی اس پابندی و ممارست سے بندہ جب بار بار اپنی خواہشات اور اور مرضیات کو مٹا کر اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو "راہ عبدیت" کا وہ سنگ گراں جسے 'ہویٰ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان پیہم ضربتوں سے چور ہو جاتا ہے۔ اور انسان منتہائے عبدیت یعنی رضائے مولیٰ سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ کسی عارف کا قول ہے:۔

" اللہ اور بندے میں ایک قدم کا بعد ہے۔ اگر ایک پاؤں اپنی خواہش (ہویٰ) پر رکھو گے تو دوسرا قدم منزل پر ہوگا"

قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ	جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے
وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ	سے ڈرا ہوگا۔ اور نفس کو (حرام) خواہشوں
فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰىؕ (النزعت-۲)	سے روکا ہوگا۔ سو جنت اسکا ٹھکانا ہوگا۔

غرض نماز کی صحیح ادائیگی ترکِ ہویٰ کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ جس انسان اپنے نفس پر قابو پا کر احکام الٰہیہ پر آسانی سے گامزن ہو جاتا ہے۔ اور اسکے عبدیت و عبودیت کے کمالات و خصائل سے بہرہ وافر پالیتا ہے۔ بلکہ بعض خاصانِ خدا کا قول ہے کہ" نماز مومن کی زندگی کا آئینہ ہے"۔ جس قدر نماز کامل ہوگی اسی قدر زندگی عبدیت کاملہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوگی۔ نماز کا ظاہر و باطن پوری زندگی کے ظاہر و باطن کی عکاسی کرتا ہے۔ نماز میں

جن پر خشوع طاری ہوتا ہے۔ وہ ہر عمل میں خاشع ہوتے ہیں۔ نماز کی جھکی ہوئی آنکھیں محارم کو بھی دیکھ کر جھک جاتی ہیں۔ لغو باتوں سے بے توجہی ان ہی کانوں کو نصیب ہوگی، جو عالم کے ہنگاموں سے کان بند کر کے مناجات (نماز) میں سراپا گوش ہوتے ہیں۔ جن کے دل ذات حق میں نماز کی حالت میں مشغول ہوتے ہیں۔ وہ مجمع میں بھی اسکی جانب متوجہ رہ کر "با ہمہ بے ہمہ" کا منظر پیش کرتے ہیں۔ نماز کا یہ عظیم عمل مومن کی پوری زندگی پر اثرانداز ہوتا ہے چنانچہ مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کا مقولہ ہے۔

الصلوة مكيالٌ فمن اوفی	نماز ایک پیمانہ ہے۔ جسنے اس سے
اُوفی به ومن طفف فقد	پورا ناپا۔ اسکو پورا ناپ کردیا جائے گا۔
علمتم ما للمطففين ـ	اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم
(کنز العمال صفحہ ۲۳ ج ۴ بحوالہ مصنف عبدالرزاق)	ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے

حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ اس "اثر" کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"اس قول کے جہاں اور مطلب ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے۔ اس سے اسکی ہر چیز ناپی جاسکتی ہے" (سیرت النبی صفحہ ۱ ج ۵)

ہم نے اپنے اکابر سے سنا ہے۔ کہ مومن کی پوری زندگی "صفت صلوۃ" پر گذرتی ہے۔ اور اس میں اسی عبدیت و عبودیت، اسی امتثال اوامر احکام اسی اجتماع اور اتباع امیر، اسی خشوع و خضوع اسی تعلق مع اللہ اور قربت

حق اور اسی احسان وحضور، توبہ وانابت، تبتل ودعاء کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ جو نماز کا خاصہ ہے۔ اس لئے تکمیل صلوۃ تکمیل مومن کا سب سے بڑا زینہ ہے۔ اس لئے نماز کو نماز بنانے کی جتنی سعی کی جائے گی۔ اتنی ہی زندگی ایمان وتقویٰ کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

اِس لئے حضرت سیدی رحمۃ اللہ علیہ نماز کی اہمیت اور اسکی تکمیل[۱] وتحسین کی طرف پیہم متوجہ فرماتے رہتے ہیں۔

سیرۃ النبیؐ میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"اِسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے۔ جو امیر وغریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار وتندرست سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے۔ جو کسی شخص سے کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی۔ اگر اس فرض کو کھڑے ہوکر نہیں ادا کرسکتے تو بیٹھ کر ادا کرو، اگر اسکی بھی قدرت نہیں تو لیٹ کر کرسکتے ہو۔ اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو۔ اگر کسی سخت مجبوری میں رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو۔ سخت خوف کی حالت میں اگر کسی سواری پر ہو تو جسطرف موقع ہو اُسی رخ پڑھو[۲]۔"

۱ے حضرت سید صاحبؒ نے سیرۃ النبی جلد پنجم (ص۵۹ تا ص۱۰۲) میں نماز کے احکام حقائق اسرار ورموز پر سیر حاصل اور قابل دید بحث کی ہے تفصیلاً وہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ (م۔ ا)

۲ے سید صاحبؒ نے مختلف کتب حدیث کے حوالے دیئے ہیں۔ تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے (م۔ ا)

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان ورحیم کی یاد، اور اُسکے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسنِ ازل کی حمد وثنا، اور اسکی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے۔ یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے۔ یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرضِ نیاز ہے۔ یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے۔ یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے۔ یہ بیقرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے۔ یہ فطرت کی آواز ہے۔ یہ حساس واثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے یہ زندگی کا حاصل اور زندگی کا خلاصہ ہے ...."

"...... انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے جسکے سامنے وہ جھکے اندروں دل سے عرض نیاز کرے۔ اور اپنی دلی تمناؤں کو سامنے پیش کرے۔ غرض عبادت روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش جنون کا علاج ممکن نہیں وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہیں۔ پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہیں۔" (سیرۃ ص ۵۹-۶۰ ج ۵)

دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ (نماز) اسلام کا وہ فریضہ ہے۔ جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے۔ کسی حالت میں

بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اسکی تعریف، اسکی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سستی و کاہلی نفاق کی علامت[1] اور اسکا ترک کفر کی نشانی[2] بتائی گئی ہے۔ یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا اور اسکی تکمیل اس شبستان قدس میں ہوئی جس کو معراج[3] کہتے ہیں.....

.....آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اسکے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے۔

آپنے فرمایا: "نماز دین کا ستون ہے" جسطرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے۔ اس طرح نماز کے ترک کر دینے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے...... آپ نے یہ بھی فرمایا: "نماز دل کی روشنی ہے"۔ اپنی نسبت فرمایا ہے: "نماز میری آنکھ کی

---

[1] منافقین کی صفت میں ہے۔ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (نساء - ۲۱) جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اٹھتے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (ماعون - ۱) افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔ (حاشیہ سیرۃ النبی)

[2] کفار کے بارے میں ہے: "لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (مدثر - ۲) ہم نمازیوں میں نہ تھے" یہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائیگا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو (حاشیہ سیرۃ النبی)

[3] کتب صحاح واقعات معراج و اسرار و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ (حاشیہ سیرت النبی)

ٹھنڈک ہے"۔ ایک تمثیل میں آپ نے فرمایا:۔" انسان آگ میں جلتا رہتا ہے۔ اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے۔ یہ محبوب ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے۔ اور نماز آب زلال ہے۔ جو آگ کو سرد کر دیتا ہے"

—— آپ نے فرمایا:۔" کفر و ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی ہے" کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں جسکا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے۔ مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نماز ہی ہے عین اسوقت جب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری لمحے تھے۔ اور فرض نبوی کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہو رہے تھے آپ فرما رہے تھے "نماز اور غلام"[1] (سیرت ۱۷۳ تا ۱۷۴)

حضرت سید الملتہ رحمہ اللہ تعالیٰ نماز کی روحانی غرض و غایت کے متعلق لکھتے ہیں:۔

" نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالق کل، رازق عالم، مالک الملک منعم اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان (اور جوارح) سے ادا کریں (دم ۱۱) تاکہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اُسکی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بےچارگی کا نقش بیٹھ جائے اسکی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے۔ اسکے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ناقابل زوال یقین کی صورت

---

[1] یہ تمام حدیثیں کنز العمال کی کتاب الصلوٰۃ (جلد ۴) میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں۔ (حاشیہ سیرۃ)

میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اُس ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں۔ جس سے اپنے برے ارادوں پر شرمائیں۔ اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں۔ اور بالآخر ان سے بالکل باز آئیں۔

صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے مجمع میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص نے سائل کی صورت میں آکر نماز کی حقیقت پوچھی۔ آپ نے اسکی تشریح فرمائی پھر پوچھا۔ یا رسول اللہؐ احسان کیا ہے؟ فرمایا "یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگر تم اسکو نہیں دیکھ رہے ہو، تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے" اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ "۔ نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کیونکہ اسوقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے (صحیح بخاری باب البزاق فی الصلوٰۃ)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے۔ اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ تو آپ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا۔ "لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے۔ تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔ اسکو جاننا چاہیئے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے۔ نماز میں ایک دوسرے کی آواز مت دباؤ[1]"

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا۔ کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے

[1] مسند احمد ج۲ ص۶۶، ص۱۲۹

دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس لئے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کیگئی۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ	اور نماز کھڑی کیا کرو۔ کہ نماز بے حیائی
تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ	اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے۔ اور
وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (عنکبوت-۵)	البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور اور بے حیائیوں سے روکتی ہے۔ اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے۔ اور خدا کی یاد سے بڑھکر کوئی بات نہیں۔ بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے۔ یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے۔ جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے۔ چنانچہ فرمایا :-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَ	کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے
اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی (اعلیٰ)	پروردگار کا نام لیا۔ پس نماز پڑھی۔

اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے۔ کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے، یعنی نماز پڑھے۔ اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ	تو ان ہی کو ہشیار کر سکتا ہے۔ جو بن دیکھے
رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا	اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور

الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا	نماز کھڑی کیا کرتے ہیں۔ اور جو تزکیہ اور
یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ	دل کی صفائی حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنے ہی
الْمَصِیْرُ (فاطر۔ ۳)	لئے حاصل کرتا ہے۔ اور (آخر) خدا ہی
	کے پاس لوٹ جانا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا۔ کہ نماز انسان کو اسکی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اسکی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ فرمایا۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعاً	بے شک انسان بے صبرا بنا ہے جب
وَّاِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا	اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا، اور جب کوئی
مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ	دولت ملے تو بخیل، لیکن وہ نمازی (ان
الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ	باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ
دَائِمُوْنَ ۝ (معارج ـ ۱)	ادا کرتے ہیں۔

آپنے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کیلئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سناتی ہے ....

...... اس تفصیل سے ظاہر ہوگا۔ کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان کا اصل سرچشمہ یہی نماز ہے جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجالائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے (سیرت النبی ۶۵ تا ۸ ج ۵)

..... نماز سے مقصود دل کے خضوع و خشوع، توبہ و انابت، پشیمانی و شرمندگی

اطاعت و بندگی اور خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار، نیز دل و دماغ اور نفس و روح میں پاکی، صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے۔ اس بنا پر نماز کیلئے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کیئے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشو ونما ہو، مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہ عالم کے دربار میں کھڑا ہے۔ ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچے کیئے رہے، طور وطریق اور حرکات وسکنات میں ادب و احترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اُسکی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے۔ اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے۔ اور اس میں باطنی فیوض وبرکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجئے، کہ ظاہری صفائی اور پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے تو دل کی صفائی اور پاکیزگی کا تصور اس کے اندر مؤثر انداز میں کیونکر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے، جو انسان کے ہر نظام و ارادہ میں جاری وساری ہے اندر کے بنانے کیلئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اِسی اصول کی بنا پر تنہائی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے۔ کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کردے گا۔ اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا پورا خیال رکھا جاتا ہے ...... کہ ان ظاہر محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند شخص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکیف ہوں۔ انکی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں

کو پُر کیف بناتی ہے، اور ان سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم و بیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے، ..... (سیرۃ ص ۸۲/۸۳ ج ۵)

"..... یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے۔ کہ نماز سے مقصود، خضوع و خشوع، ذکر الٰہی، حمد و ثنا اپنے گناہوں پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے۔ یہ تمام باتیں دل سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن کیلئے ظاہری ارکان کی ضرورت نہیں..... (لیکن) انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اسکے جسمانی اعضا ہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اسکے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اسوقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب تک اسکے ہاتھ پاؤں اور زبان سے اُن کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اسکی تکذیب نہیں کر سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی اور اس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں۔ مگر خود بندوں کو ضرورت ہے۔ کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے عرض و التجا اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں۔

انسان اپنے جسم و روح دونوں کے لحاظ سے خدا کی مخلوق ہے اسکی زندگی کے دونوں جزء خدا کے احسانات و انعامات سے یکساں گراں بار ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ خالق و رازق اور اس ارحم الرحمین کے سامنے

---

[1] سیرۃ النبی ص ۸۳ ج ۵

روح وجسم دونوں جھک کر سجدۂ نیاز ادا کریں، غرض یہ وجوہ ہیں جس کی بنا پر شریعت نے جسم وجان دونوں کی رعایت کرتے ہوتے نماز کے ارکان مقرر کئے ہیں۔ (سیرۃ ص۸۳ ج: ۵)

"..... قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کے جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے پھر جھکانے اور سرنگوں کرنے کا حکم ہے۔ مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے خدا کی تسبیح وتحمید کا ارشاد ہے۔ دعا واستغفار کی تعلیم ہے۔ دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجنے کا امر ہے اس لئے نماز کی تشکیل اسطرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہو گئے۔ اس لئے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگوں جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قرأت قرآن، ذکر الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کئے گئے ہیں۔ انکی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے جسمیں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہیں۔ دوسری طرف ان احکام کی بجاآوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے۔ کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے سجدہ کرے جو چاہے صرف قیام کرے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر و قرأت پر اکتفا کرے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جاتے۔ تو ہر فرد سے فرائض الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے

جن پر کبھی عمل نہ ہوتا۔ اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انگاری ان پورے احکام کی تعمیل میں مانع آتی۔ سب سے بڑھکر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی، نہ جماعت ہو سکتی، اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادتِ خاص کہا جا سکتا، اور نہ جماعتی رمز و شعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو واحد امت بناتی اور بتاتی" (سیرۃ ص ۹۶/۹۷ ج ۵)

حضرت سید الملت سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد پنجم میں نماز کے آداب باطنی، کی تحت میں لکھتے ہیں :۔

"قرآن پاک اور احادیثِ نبویہ میں نماز کیلئے متعدد لفظ آئے ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح، اور ذکرالٰہی اور یہ الفاظ خود نماز کی روحانی خصوصیات اور آداب کو ظاہر کرتے ہیں۔ نماز جسم و روح دونوں کی عبادت ہے اگر اسمیں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو، اور روح میں اہتزاز پیدا نہ ہو جائے۔ تو ایسی نماز گلِ بے رنگ اور شرابِ بے کیف سے زیادہ نہ ہو گی

۱:۔ اقامت صلوٰۃ | نماز پڑھنے کیلئے قرآن پاک میں جا بجا اقامت صلوٰۃ (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں۔ بلکہ نماز کو اس کے آداب و ارکان و سنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں ..... اس بنا پر نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہیئے جسکے بغیر نماز ناقص ہو گی۔"

۲:۔ قنوت | نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ (بقرہ۔۳۱)   اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔

صحابہؓ کہتے ہیں۔ کہ ہم لوگ نماز میں پہلے باتیں کرلیا کرتے تھے۔ لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا۔ کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا۔ قرآن پاک میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ عجیب جامع لفظ ہے۔ لغت میں (دیکھو لسان العرب) اسکے حسب ذیل معنیٰ ہیں۔ چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا۔ عبادت کرنا کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا۔ نماز کے جس قنوت کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اُس کے متعدد معنوں میں ہر معنیٰ نماز میں مقصود ہے۔ کیونکہ نماز میں ذکر و قرأت، تسبیح و استغفار، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے۔ وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے۔ عبادت بھی ہے، اس میں دیر تک قیام بھی ہے۔ اور عاجزی کا اظہار بھی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی نماز میں کم ہو تو اسی قدر نماز کے اوصاف میں کمی ہو جائے گی۔

۳:۔ خشوع | تیسری چیز خشوع ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے

اَلَّذِیْنَ فِیْ صَلَاتِهِمْ   (وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں
خَاشِعُوْنَ (مومنون۔۱)   خشوع و خضوع کرتے ہیں۔

خشوع کے لغوی معنیٰ یہ ہیں۔ بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں

نیچے ہونا، یعنی ہر ادا سے مسکنت، عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا (لسان العرب)
اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے
اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہوگئی۔

۴۔ تبتّل | تبتل کے اصلی معنی 'کٹ جانے' کے ہیں، اور اسکے اصطلاحی معنی ہیں۔ خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔ مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے۔ سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت کے متعلق ہے[1]۔ یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اسکی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عنبسہؓ سلمی سے روایت ہے۔ کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا۔ کہ وضو کر کے جب کوئی نماز کیلئے کھڑا ہو، پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی، اور خدا کی بزرگی کا اظہار کیا۔ جیسا کہ وہ سزاوار ہے۔ اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کر لیا (وفرغ قلبہ للہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے۔ جیسے اسکی ماں نے اسکو اسی وقت پیدا کیا (صحیح مسلم اول باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیھا) یہ حدیث گویا اسی آیت۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۔ (اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اسی کا ہو جا) کی تفسیر ہے۔

---

[1] حضرتؒ نے سورہ مزمل کا پہلا رکوع وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا تک نقل کیا ہے۔

۵: تضرّع | تضرّع کے معنٰی زاری اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی و زاری اور عجز والحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہیئے۔ ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ط (اعراف۔۷) — تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کے ساتھ اور دھیمی آواز سے پکارو۔

۶: اخلاص | نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصل جوہر 'اخلاص' ہے یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں بلکہ ریا اور نمائش ہوگی۔ اور بعض اہل حق کے نزدیک شرک لازم آئیگا۔ فرمایا:۔

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (اعراف۔۳) — اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔

۷: ذکر | نماز خدا کی یاد کیلئے ہے۔ اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو۔ تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی۔ اسی لئے فرمایا:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ۔۱) — میری یاد کیلئے نماز کھڑی کرو۔

ظاہر ہے۔ کہ یاد صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے۔ اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہیئے۔ اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

۸: فہم و تدبر | نماز میں جو کچھ پڑھا جائے۔ اسکے سمجھنے کی کوشش کرنی

چاہیئے۔ اگر بے پروائی کیوجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا۔ تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ اسی لئے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں فرمایا

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ (نساء۔۷)

نماز کے قریب نہ جاؤ۔ جب تم نشہ میں ہو۔ یہاں تک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اسکو سمجھو۔

اس آیت پاک نے واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اسکے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم و تدبر سے عاری ہو جاتا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

"نماز میں جب تم پر نیند غالب آجائے تو سو جاؤ کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے۔ تو ممکن ہے کہ دعا کی بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو" (مسلم صفحہ ۲۹۳ ج ۱)

دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

"نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہیئے۔ تاکہ وہ جو کہتا ہے۔ وہ سمجھے۔" (بخاری۔ ابوداؤد، مسند احمد عن انس)

حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

"جو شخص اچھی طرح وضو کرے۔ پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے۔ اسکو سمجھتا بھی ہے۔ یہاں تک کہ نماز ختم ہو جائے

تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا"[۱]

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی. جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا۔ نماز سے غفلت ہے. اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں.

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ — پس پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی
هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ — نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ جو دکھاوے
الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ — کی نماز پڑھتے ہیں (ماعون-۱)

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے۔ "ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو" نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ نماز کیلئے جو ظاہری آداب، مثلاً وقت کا لحاظ اور ادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع و خضوع، تضرّع وزاری اور فہم و تدبر وغیرہ ضروری ہیں۔ ان سے نماز میں تغافل برتا جائے۔

نماز کے گذشتہ آداب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں جن میں آپ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے

---

[۱] ترغیب و ترہیب منذری ص۳۷۔ اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی نہیں جانتے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ اور چاہیئے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں پڑھتے ہیں۔ ان کے معنی ذہن نشین کرلیں۔ اور یہ ہر مسلمان کیلئے بہت آسانی سے ممکن ہے بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے۔ (حاشیہ سیرۃ النبی ص۱۷۶ ج ۵)

ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک شخص نے آکر نہایت عجلت میں نماز پڑھی، آپ نے فرمایا " اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی " اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا ــــــ جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا، تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ! کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا " اس طرح کھڑے ہو۔ اس طرح قرأت کرو۔ اس طرح اطمینان و سکون کیساتھ رکوع و سجدہ کرو۔[1]

نماز میں سر اٹھا کر اوپر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے۔ اس سے انسان کی توجہ ہٹتی ہے اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ــــــ " نماز میں سر اوپر اٹھا کر نہ دیکھا کرو۔ کیا تمہیں یہ ڈر نہیں کہ تمہاری نظر پھر واپس نہ آسکے"[2] ــــــ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ، " جب تک بندہ نماز میں دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا خدا اسکی طرف ملتفت رہتا ہے۔ اور جب وہ خدا سے منہ پھیر لیتا ہے۔ تو خدا بھی اپنا منہ اس سے پھیر لیتا ہے[3]۔ طبرانی میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: " جب تم میں سے کوئی شخص نماز کیلئے کھڑا ہو۔ تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے۔ یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے، اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھو۔ کیونکہ جب تک تم نماز میں ہو خدا سے باتیں کر رہے ہو۔[4] ــــــ مسند بزاز میں ہے

---

[1] صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد کتاب الصلوۃ (حاشیہ سیرۃ)
[2] مسند احمد عن جابر بن سمرہ (حاشیہ سیرۃ)
[3] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۱۷۲ و ابوداؤد باب الالتفات فی الصلوۃ (حاشیہ سیرۃ)
[4] طبرانی فی الاوسط عن ابوہریرہ بحوالہ کنز العمال صفحہ ۱۰۱ ج ۴ (حاشیہ سیرۃ)

کہ: "جب بندہ نماز میں ادھر ادھر دیکھتا ہے تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے، تو میری طرف دیکھ، دوسری دفعہ بھی یہی فرماتا ہے۔ پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اسکی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے[۱] ....

........." نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ:۔

"جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ کر مت آؤ بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون اور وقار طاری ہو۔[۲]

اس سے اول تو یہ مقصود ہے۔ کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے دوسرے یہ کہ اسکی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے۔ اسطرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں۔ تو نماز سے پہلے ان سے بھی فراغت کر لیجائے........"

آغازِ اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اُٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے۔ لیکن مدینہ آکر یہ اجازت منسوخ ہوگئی، ایک صحابی نے جن کو اسکی خبر نہ تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی بار نماز میں سلام کیا۔ اور جب آپ نے جواب نہ دیا، تو نماز کے بعد انہوں نے اسکا ذکر کیا۔ فرمایا

اِنّ فی الصلوٰۃ شغلا — نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے

۱؎ کنز العمال ص۲۰۱ ج: ۴

۲؎ صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار

...... نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے۔ کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم ہو۔ کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے۔ گذر چکا ہے۔ کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا۔ کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ "جب تم عبادت کرو۔ تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے، تو وہ تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے۔"[1] کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی، اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے۔ ایک صحابیؓ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہیں، کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے۔ یا ہانڈی اُبل رہی ہے[2]

رات کی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب ذوق و شوق کا عالم طاری ہوتا تھا۔ قرآن پڑھتے چلے جاتے۔ جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم و کرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے[3] ــــــ آپؐ نے فرمایا کہ "نماز دو دو رکعت کر کے ہے۔ اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے اور تضرع و زاری ہے۔ خشوع و خضوع ہے، عاجزی و مسکنت ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر اے رب اے رب کہنا ہے۔ جس نے ایسا نہ کیا تو اسکی نماز

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان (حاشیہ سیرۃ) [2] ترمذی و ابوداؤد باب البکاء فی الصلوۃ (حاشیہ سیرۃ)

[3] مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۹۲۔

ناقص رہی۔[1]

ایک دفعہ آپؐ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قرأت کررہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا لوگو تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے۔ تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو۔[2]

ایک صحابیؓ نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کچھ ہدایت فرمائیے۔ ارشاد ہوا کہ:۔

"جب تم نماز کیلئے کھڑے ہو، تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہیئے کہ یہ معلوم ہو، کہ تم اسی وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو۔"[3]

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا۔ کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اترا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اسکی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو، تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے۔ اس لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ	اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى	وہ قرآن کو مانتے ہیں۔ اور وہ اپنی نماز
صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (انعام-۱۱)	کی نگہداشت کرتے ہیں۔

---

[1] ابوداؤد باب صلوٰۃ النہار، و ترمذی باب ماجاء فی التخشع فی الصلوٰۃ (حاشیہ سیرۃ)

[2] ابوداؤد صلوٰۃ اللیل (حاشیہ سیرۃ)۔ [3] مسند احمد صفحہ ۴۱۲ ج ۵ عن ابی ایوب (حاشیہ سیرۃ)

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے معنی ہیں، اور دونوں یہاں مقصود ہیں۔ یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔

(ایسی) نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدّنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جو عملی اصلاحیں وجود میں آئیں، انکا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے۔ کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا۔ چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا۔ اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے۔ تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے مہذب و متمدن ہو جاتا ہے اور متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے۔ اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے۔ جس کے سبب انکا وہی کام جو پہلے مٹی تھا۔ اب اکسیر بن جاتا ہے (سیرت پنجم ص ۱۲۲)

حضرت سید الملۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نے نماز کے اخلاقی و تمدنی اور معاشرتی فوائد[۱] پر سیرت پنجم میں سیر حاصل و قابلِ دید بحث کی ہے۔ جس کے آخر میں

---

[۱] حضرت علامہ قدس سرہٗ نے اسکے بعد نماز کے چند اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے تفصیلاً بتائے ہیں صرف عنوان نقل کرتا ہوں۔ ستر پوشی[۱]، طہارت[۲]، صفائی[۳]، پابندی وقت[۴]، صبح خیزی[۵]، ہشیاری[۶]

ارقام فرماتے ہیں :۔

" ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے۔ اسکی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا۔ اور اسکی گرہ کھل جانے سے اسکی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے۔ مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اسی مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی۔ جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعین کیلئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے۔ اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا۔ ان کی ہر چیز اسکے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی۔ ان کے نماز کا گھر ہی ان کا دارالامارۃ تھا۔ وہی دارالشوریٰ تھا۔ وہی بیت المال تھا۔ وہی صیغہ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدہ کیلئے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش و فائدہ کو قربان کردینا۔ اور اختلاف باہمی کو تہ کرکے صرف ایک مرکز پر

---

[6] خدا کا [7] خوف، مسلمانوں کا [8] امتیازی نشان، [9] جنگ کی تصویر، [10] دائمی تنبیہ اور بیداری، [11] الفت و محبت [12] غمخواری، [13] اجتماعیت، [14] کاموں کا تنوع، [15] تربیت، [16] نظم جماعت، [17] مساوات، [18] مرکزی اطاعت [19] معیار فضیلت، [20] روزانہ کی مجلس عمومی (تفصیل کیلئے دیکھئے سیرت پنجم ص ۱۶۲ تا ص ۱۹۲)

جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا اسکے حصول کی لازمی شرط ہے۔ اسکی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سرلشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے۔ اسلام کی نماز انہی رموز و اسرار کا گنجینہ ہے۔ یہ مسلمانوں کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری و فرمانبرداری اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے اسی لئے اسکے بغیر مسلمان مسلمان نہیں، اور نہ اسکی کوئی اجتماعی وحدت ہے۔ نہ انقیاد امامت ہے۔ نہ زندگی ہے۔ اور نہ زندگی کا نصب العین ہے۔ اسی بنا پر داعی اسلام علیہ السلام نے یہ فرمایا:۔

العهد الذی بیننا و بینهم	ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ
الصلوٰة فمن ترکها فقد کفر	ہے نماز ہے۔ تو جس نے اسکو چھوڑا
(احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)	اس نے کفر کا کام کیا۔

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان حرف قالب بے جان، شراب بے نشہ گل بے رنگ و بو ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اسی لئے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔" (سیرت ص ۱۹۱، ۱۹۲ ج ۵)

نماز کی عبادت کی تاثیر و برکت سے عرب کی جس طرح روحانی کایا پلٹ ہوئی۔ اس کا نقشہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کھینچتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بے گانہ تھا۔ وہ جسکی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جسکی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا۔ وہ جسکی روح ربانی تسکین و تسلّی کے احساس سے خالی تھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے دفعتہً کیا ہوگیا؟ اب عبادت الٰہی اُس کے ہر کام کا مقصد بن گئی۔ اب اسکو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی، اسکی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی، اُس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی۔ اسکی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اسکی آنکھیں اس منظر کے سوا کسی اور منظر کی طالب نہ تھیں۔ اسکی روح یاد الٰہی کی تڑپ اور ذکر الٰہی کے بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی ؎

دل راکہ مردہ بود حیاتے زنور سید
تابوئے ازنسیم میش در مشام رفت

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی۔

وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا (نساء-۲۱) اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں

دعوت حق اور فیض نبوت کے اثر و برکت نے انکی یہ شان نمایاں کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی انکو ذکر الٰہی سے غافل نہ کرسکیں

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور-۵)
ایسے لوگ جنکو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔

اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کیلئے بے قراری تھی۔

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران-۲۰)
جو خدا کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر لمحہ یاد کرتے ہیں۔

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی۔ وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سر بسجود اور راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (سجدہ-۲)
جن کے پہلو (رات کو) خوابگاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں۔ وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ (مرسلات-۲)
اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے

اب ان کی یہ صورت ہو گئی کہ

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (فتح-۴)
تم انکو دیکھو گے۔ کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کی تلاش کرتے ہیں

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ:-

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (زمر-۵) اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے مکدّر ہو جاتے ہیں۔

آفتاب نبوّت کے پرتو نے ان مکدّر آئینوں میں خشیت الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا،

اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (انفال-۱) ج-۵) وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے کہ ان کے دل دہل جاتے ہیں۔

یہ خود قرآنِ پاک کی شہادتیں ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے۔ خواہ کھیتی کرتے ہوں یا تجارت یا محنت مزدوری، مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی۔ قتادہؓ کہتے ہیں۔ کہ یہ لوگ (صحابہؓ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے۔ لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا۔ تو یہ شغل و عمل ان کو یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ اسکو پوری طرح ادا کرتے تھے۔

(صحیح بخاری باب التجارۃ فی البر مرسلاً)

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے۔ نماز کی تکبیر ہوئی۔ دیکھا کہ صحابہؓ نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد

میں داخل ہو گئے (فتح الباری ص۲۵۳ ج ۴ بحوالہ عبدالرزاق)

صحابہ تمامتر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ خدا نے گواہی دی۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ط (مزمل-۲)	بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور ایک تہائی رات تک کھڑا رہتا ہے اور تیرے ساتھ کی ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔

اس زمانہ میں صحابہؓ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا۔ جلوۂ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے، ذوق وشوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے۔ قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لا الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ لا وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ (شعراء-۱۱)	اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات کو جب تو نماز کیلئے اٹھتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے

مدینہ منورہ میں آکر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا۔

یاآیّھا النّاس اطعموا الطعام	اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور
وافشوا السلام وصلّوا	سلام کو پھیلاؤ۔ اور نماز پڑھو جب
والنّاس نیام (ترمذی)	لوگ سوتے ہوں۔

بعض صحابہؓ نے اس پر اس شدت سے عمل کیا کہ انہوں نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ بن مظعون رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ "عثمان! تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔ نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔" (ابوداؤد باب قصد الصلوٰۃ)

حضرت ابن عباس کہتے ہیں۔ کہ صحابہؓ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔ اور بہت کم سوتے تھے (ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ)

حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے۔ ایک میں خود نماز پڑھتے تھے۔ دوسرے میں انکی بیوی اور تیسرے میں ان کا غلام، اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی، حضرت ابودرداءؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ رات رات بھر نماز میں گزار دیتے

تھے، حضرت سلمان فارسیؓ ان کے اسلامی بھائی تھے۔ ایک شب وہ انکے ہاں جاکر مہمان ہوئے، جب رات کو ابو درداؓ عبادت کیلئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا۔ پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سلمانؓ نے انکو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الصوم)

کوئی صحابیؓ ایسا نہ تھا، جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی نماز بھی عمداً قضا کی ہو، یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے غافل نہیں رہتے تھے۔ ایک صحابیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پر خطر کام کے لئے کہیں بھیجا تھا، جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا۔ تو وقت نکل جائے گا۔ اور اگر عصر میں تاخیر کیجائے تو حکم الٰہی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی، اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا، کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے (ابوداؤد)

سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی، چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ (نسائی)

پھر وہ جس خضوع وخشوع، محبوبیت اور استغراق کے ساتھ

نماز ادا کرتے تھے۔ اسکا نظارہ بڑا پُر اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو اُن پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک پر بھی اسکا اثر ہوتا تھا (صحیح بخاری)

حضرت عمرؓ نماز میں اس زور سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی۔ (صحیح بخاری)

حضرت تمیم داریؓ ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی، بار بار اسکو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے (اسد الغابہ) ؏

شب شود صبح وہماں محو تماشا باشم

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں (بخاری)

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے۔ اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی ستون کھڑا ہے۔ اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جامد سمجھ کر انکی پیٹھ پر آکر بیٹھ جاتے تھے (ابن ماجہ واسد الغابہ وغیرہ)

ایک رات میدانِ جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابیؓ پہرہ دینے کیلئے متعین ہوتے ہیں۔ ایک صاحب سو جاتے ہیں اور دوسرے نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں، دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے

جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے۔ کپڑے خون سے تربتر ہو جاتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے۔ نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں۔ ساتھی کہتے ہیں۔ کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا، جواب ملتا ہے۔ میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی۔ پسند نہ آیا۔ کہ اس کو ختم کئے بغیر نماز توڑدوں۔

اس سے بھی زیادہ پراثر منظر یہ ہے کہ دشمن کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں۔ تیروں کا مینہہ برس رہا ہے، نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوندرہی ہیں۔ سروگردن، دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعتہً نماز کا وقت آجاتا ہے۔ فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں۔ اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پروا ہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔

نور کا تڑکا ہے۔ اسلام کے دائرہ کا مرکز فاروق اعظم رض امام نماز ہے پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں۔ دفعتہً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے۔ اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں۔ خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ حضرت عبدالرحمن رض ابن عوف نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں، پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے۔ تب خلیفہ وقت کو اٹھایا جاتا ہے (صحیح بخاری)

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا اس کے بعد صبح لوگوں نے ان کو نماز کیلئے جگایا، تو بولے "ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے، اسلام میں اسکا کوئی حصہ نہیں" چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا۔ آپ نے نماز پڑھی (موطا امام مالکؒ)

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کیلئے مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں (الریاض النضرہ) کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کرتی ہے۔ اور کچھ دیر کے بعد وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہیں ــــ

"امام مظلوم حسینؓ بن علیؓ کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدان جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوئی ہیں۔ ہزاروں اشقیاء آپ کو نرغہ میں لئے ہوتے ہیں۔ اتنے میں ظہر کا وقت آجاتا ہے۔ آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں۔ کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کرسکیں" (تاریخ طبری کبیر صفحہ ۳۴۲)

نماز میں جس خضوع و خشوع کا حکم ہے۔ صحابہؓ کرام نے اس کے یہ نمونے پیش کئے ہیں کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے روحانی ذوق و شوق میں خلل انداز ہوئی، تو انہوں نے اسکو اس ذوق پر نثار کردیا۔ حضرت ابوطلحہؓ انصاری اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک خوش نما چڑیا نے سامنے آکر چہچہانا شروع کیا حضرت ابوطلحہؓ دیر تک ادھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی، دل میں کہا، اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا، یہ

"کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، اور کہا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ باغ راہ خدا میں نذر ہے۔

اسی طرح ایک اور صحابیؓ اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے باغ اس وقت نہایت سرسبز و شاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی، جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا یہ حضرت عثمانؓ کا دور خلافت کا زمانہ تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا۔ راہ خدا میں دیتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اسکو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔" (موطا امام مالک)

(سیرت النبی[1] صہ ۱۹۲ تا صہ ۲ ج ۵)

نماز کی کیف انگیزیاں ہی ایسے مافوق العادت واقعات کا سبب بنیں کہ نماز قربتِ حق کے اس مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ جہاں پر تو جمال کے سوا کسی کا دھیان اور کیفِ حضوری کے سوا کوئی خیال گوارا نہیں ہوتا۔ نمازی ذاتِ حق ہی سے سرور پاتا ہے۔ اور اسی کا اشتغال اسے شاداں و فرحاں رکھتا ہے۔ کہ نمازی کو اس عالم میں نماز ہی میں اللہ تعالیٰ کا انتہائی قرب نصیب ہوتا ہے

---

[1] حضرت سیدؒ صاحب نے ہر کتاب (جس کا حوالہ دیا ہے) کے ساتھ اسکے باب یا صفحات کا بھی حوالہ دیا۔ راقم نے اختصار کیلئے صرف کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ اصل حوالہ جات کیلئے سیرت کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے (م-ا)

امام ربانی مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں

" ونیز بدانند کہ رتبہ نماز در دنیا در	اور نیز جان لیں۔ کہ دنیا میں نماز کا رتبہ
رنگ رتبہ رویت است در آخرت،	آخرت میں رویت کے رتبہ کی طرح ہے
نہایت قرب در دنیا در نماز است و	دنیا میں نہایت قرب نماز میں ہے۔ اور
نہایت قرب در آخرت در حین	آخرت میں نہایت قرب رویت کے
رویت است و بدانند کہ سائر عبادات	وقت، اور جان لیں کہ باقی تمام عبادات
وسائل اند از برائے نماز و نماز از	نماز کے لئے وسیلہ ہیں۔ اور نماز
مقاصد است۔"	اصلی مقصد

(مکتوبات امام ربانی دفتر اول مکتوب ۱۳۷)

حقیقت نماز کے ایک رمز آشنا اور کیفیتِ صلوٰۃ سے سرشار عارف (مولانا رومیؒ) اپنی نماز کا کیا نقشہ کھینچتے ہیں۔

چو نمازِ شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے   منم و خیال یارے، غم و نوحہ و فغانے
چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نمازم   در مسجدم بسوزد چو در و رسد اذانے
عجبا نماز مستاں تو بگو درست ہست آں   کہ نداند او زمانے نہ شناسد او مکانے
عجبا دو رکعت ست ایں عجبا چہارم ست ایں   عجبا چہ سورہ خواندم، چو نداشتم زبانے
در حق چگونہ کوبم؟ کہ نہ دست ماند نے دل   دل و دست چوں تو بردی بدہ اے خدا امانے
بخدا خبر ندارم چو نماز می گذارم   کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ و خواصِ امتؒ کا نماز کے ساتھ جو شغف تھا، وہ محتاج بیان نہیں۔ اور حق تو یہ ہے۔ کہ نماز ہی اسلامی زندگی کا وہ

منبع ہے۔ جس سے حیات اسلامی کا ہر دھارا پھوٹ کر نکلتا ہے۔ حیات اسلامی کا دریا اسی کوزے میں بند اور ایمانی زندگی کا صحرا اسی ذرہ میں پنہاں ہے توحید کے شجر کا پہلا ثمر ہی نماز ہے۔ اور اسلامی زندگی کا ہر گوشہ اسی کے پرتو سے روشن اور اسی کے نور سے منور ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی حجۃ البالغہ میں لکھتے ہیں

اعلم ان الصلوٰۃ اعظم	جاننا چاہیئے۔ کہ نماز تمام عبادتوں سے
العبادات شأنا واوضحها	بڑھکر عظیم الشان، ثبوت کے لحاظ سے سب سے زیادہ
برهانا واشهرها فی الناس	یقینی اور سب سے زیادہ مشہور رکن ہے۔ اور نفس
وانفعها فی النفس	انسانی کی اصلاح میں سب عبادتوں سے
(حجۃ اللہ البالغہ من ابواب الصلوٰۃ)	زیادہ نافع اور موثر ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں،

اقول الصلوٰۃ من اعظم شعائر	میں کہتا ہوں کہ نماز اسلام کا سب سے بڑا
الاسلام وعلامته التی اذا	شعار ہے۔ اور اسلام کی ان علامات میں سے
فقدت ینبغی ان یحکم بفقده	ہے۔ جسکے جاتے رہنے کے سبب
بقوۃ الملابسۃ بینها وبینه	اگر اسلام کے فقدان کا حکم کردیا جائے تو
؟	بجا ہوگا کہ اسلام میں اور نماز میں بڑا گہرا اور قوی تعلق ہے
ومن لم یکن له حظ منها فانه	اور جس کو نماز سے کچھ حصہ نہ ملا تو
لم یبوء من الاسلام الا بما	اسلام سے سوا اس چیز کے کچھ پرواہ

لا یعبأ بہ ۔ نہیں کیجاتی ۔ وہ کچھ حاصل نہ کرسکا۔

(حجۃ اللہ البالغۃ جلد اول فصل الصلوٰۃ) (یعنی اسے اسلام کا فائدہ نہ ہوا)

نمازوں کے یہی کمالات ہیں ۔ جن کی وجہ سے شیخ احمد سرہندی نے فرمایا ہے

"اگر نماز کو کامل طور پر ادا کرلیا ۔ تو گویا اسلام کی اصل عظیم حاصل ہوگئی ۔ اور خلاصی کے واسطے حبل متین ہاتھ آگئی ۔

(مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ پنجم مکتوب ۳۰۴)

ف امام ربانی مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں نماز کے بارے میں کئی مقامات پر تابں وبید گفتگو فرمائی ہے ۔ مکتوب ۲۶۱ دو صد شصت ویکم میں تحریر فرماتے ہیں ۔

" جان لیں کہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے نماز دوسرا رکن ہے ۔ نماز تمام عبادات کی جامع ہے ۔ اور ایسا جزو ہے جو جامعیت کی وجہ سے کل کے حکم میں ہے اور (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) تمام مقربہ اعمال سے اونچی ہوگئی ہے ۔ اور وہ دولت رویت جو سرور عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات بہشت میں میسر آئی تھی ۔ اس دنیا میں اتر آنے کے بعد یہاں کے مناسب آپ کو وہ دولت نماز میں حاصل ہوتی ۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

الصلوٰۃ معراج المومنین نماز ایمان والوں کی معراج ہے

نیز آپ نے فرمایا ۔

اقرب ما یکون العبد من الرب سب سے زیادہ اعلیٰ قرب جو بندے کو رب سے

فی الصلوٰۃ ہوتا ہے وہ نماز میں ہوتا ہے ۔

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل تابعداروں کو اس جہاں میں اس دولت کا بہت سا حصہ نماز میں حاصل ہے ۔ اگرچہ رویت میسر نہیں ۔ کیونکہ یہ جہاں اسکی طاقت نہیں رکھتا ۔ اگر نماز کا

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) حکم نہ ہوتا تو چہرہ مقصود سے نقاب کون کھولتا، اور طالب کی مطلوب کی طرف کون رہنمائی کرتا۔ نماز ہی غمزدوں کی غمگسار ہے اور نماز ہی (جب الہی کے) بیماروں کیلئے سامانِ راحت ہے "ارحنی یا بلال" اسی حقیقت (ماجرا) کی خبر و رمز اور قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) اسی مدعا کی طرف اشارہ ہے۔ وہ تمام اذواق و مواجید اور علوم و معارف اور احوال و مقامات و انوار و الوان تلونیات و تمکینات، تجلیات تکییفہ و غیر تکییفہ اور ظہورات متلونہ و غیر متلونہ اور اس قبیل کی ہر چیز جو نماز سے باہر ملے اور نماز کی حقیقت سے بے خبر ہونے کے سبب ظاہر ہو ان کا منشاء ظلال و امثال بلکہ وہم و خیال ہے۔

نمازی جو نماز کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ نماز ادا کرنے کے وقت گویا وہ عالم دنیا سے باہر نکل جاتا ہے اور عالم آخرت میں داخل ہو جاتا ہے۔

۔اس وقت اس دولت سے جو آخرت سے مخصوص ہے حصہ پا لیتا ہے۔

اور اصل سے ظلیت کے شائبہ کے بغیر بہرہ مند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عالم دنیا کمالات ظلی پر منحصر ہے اور وہ معاملہ جو ظلال سے باہر ہے وہ آخرت سے مخصوص ہے۔ پس (اس طرح عالم دینوی سے نکل کر عالم آخروی میں پہنچنے والے کیلئے) معراج سے چارہ نہیں۔ اور یہ (معراج) مومنوں کیلئے نماز ہے۔ اور یہ دولت اس امت کے ساتھ مخصوص ہے جو اپنے اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کے سبب اس کمال کے ساتھ مشرف ہوئی اور اس سعادت سے بہرہ مند ہوئی۔ (جو پیغمبر علیہ السلام) شب معراج میں دنیا سے آخرت میں چلے گئے تھے اور بہشت میں پہنچکر حق تعالیٰ کی رویت سے مشرف ہوئے۔

(مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم مکتوب بنام میر نعمانؒ ۲۶۱ تا ۱۱۹ ص ۱۷۱ ص ۵ ص ۵ مطبوعہ نور کمپنی لاہور)

مکتوب ۲۴۰ بنام مخدوم زادہ شیخ محمد صادقؒ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"فرائض ہمہ ہر چند قرب اصل می بخشند   جملہ فرائض اگرچہ سب ہی قرب اصلی سے نوازتے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

حضرت سیدی الامام نور اللہ مرقدہٗ حقیقت و عظمت کے رازداں اسکے اسرار و رموز و حقائق و معارف کے نکتہ رس آشنا اور جامع تھے۔ قرب ربانی کے حصول اور تربیت سالک میں نماز کی اہمیت اور تاثیر و تاثرات ان پر پوشیدہ نہ تھا۔ حضرت ذالا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اما افضل و اکمل اینہا صلوٰۃ است" الصلوٰۃ معراج المومنین" شنیدہ باشی و" اقرب ما یکون العبد من الرب فی الصلوٰۃ" و وقتِ خاص کہ حضرت پیغمبر را بودہ علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ والسلام کہ تعبیر ازاں بہ" لی مع اللہ وقت" فرمودہ نزد فقیر در نماز است کہ مکفر سئیات است و نماز است کہ نہی از فحشاء و منکر میفرمائد و نماز است کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام راحتِ خود را دراں میجوید آنجا کہ میفرمائد" ارحنی یا بلال" و نماز است کہ ستون دین آمدہ است و نماز است کہ فارق اسلام و کفر گشتہ"

(مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم ص ۱۰۷/۵۶۴)

لیکن ان میں سے افضل و اکمل نماز ہے" نماز مومنین کا معراج ہے" اور" بندے کو زیادہ قرب اپنے پروردگار سے نماز میں ہوتا ہے" آپنے سنا ہوگا۔ وہ وقت خاص جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ جسکی تعبیر" میرے اللہ تعالیٰ کیساتھ ایک مخصوص وقت ہے" سے کی ہے فقیر کے نزدیک نماز ہی میں ہے۔ نماز ہی گناہوں کا کفارہ۔ اور نماز ہی بے حیائی کے کاموں اور گناہوں سے روکتی ہے نماز ہی ہے۔ جس میں پیغمبر علیہ السلام اپنی راحت تلاش فرماتے تھے۔ جیسا کہ آپکا ارشاد ہے۔" اے بلال مجھے نماز کا بندوبست کرکے راحت پہنچاؤ" اور نماز ہی دین کا ستون ہے اور نماز ہی کفر و اسلام کے درمیان فرق ہے

مکتوب دوصد شصت و سوم (بنام میاں تاج شیخ) میں ارقام فرماتے ہیں:

" وہ حالت جو نماز کے ادا کرنے کے وقت میسر ہوتی ہے ان تمام احوال سے جو نماز کے باہر میسر آئیں برتر ہے۔ کیونکہ وہ حالات اگرچہ اعلیٰ سے اعلیٰ ہوں۔ دائرہ ظل سے باہر نہیں ہیں۔ اور یہ حالت اصل سے حصہ رکھتی ہے۔ پس جس قدر اصل اور ظل کے درمیان فرق ہے۔ اسی قدر ان حالات اور اس حالت کے درمیان فرق ہے (مکتوبات دفتر اول جلد چہارم ص ۱۲۱/۵۷۲)

اسی طرح مکتوبات ۲۶۶، ۳۰۱، ۳۰۵ بھی نماز کے متعلق قابل دید فوائد پر مشتمل ہیں (م۔ا)

رحمہ اللہ تعالیٰ کا نماز کے ساتھ جو شغف واشتغال تھا۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ نماز میں خضوع وخشوع انابت وتضرع کی جو کیفیت حضرت الشیخ پر طاری ہوتی تھی دیکھنے والا بھی اس کا اثر محسوس کر لیتا تھا عبدیت وعبودیت کا ایک سراپا عجز مجسمہ اپنے معبود وخالق میں مشغول تمام دنیا سے غافل راز ونیاز میں مصروف دکھائی دیتا تھا۔ ظاہری ارکان کے اعتدال و تحسین کیساتھ باطنی کیفیات کے اثرات کالعین مشاہد ہوتے تھے۔ "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود"

حضرت والا قدس سرہٗ کے کیف نماز اور ذوق سجود کا ایک ہلکا سا اندازہ آپکے بعض اشعار سے کیا جاسکتا ہے۔

سجدہ میں جہاں سر ہے گویا وہ تیرا در ہے ۔۔۔ کیا کیا نہ کہا تجھ سے پایا جو سراپا گوش[1]
حاصل ہے تصور میں کیفیت[2] معراج ۔۔۔ کیا کیا نہ مزہ پایا پایا جو ہم آغوش

سجدے میں رکھ کر سر ترے پائے خیال پر ۔۔۔ تعمیر اک بہشت ارم کر رہا ہوں میں
سر ہے زمین پر تو تصور ہے عرش پر ۔۔۔ تعمیر اور ایک حرم کر رہا ہوں میں

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مسترشد خاص مولوی غلام محمد صاحب مدظلہ نے سچ لکھا ہے

"حضرت والا سلوک نبوت کے راہی اور قرب فرائض سے ممتاز تھے۔ اور فرائض میں ام الفرائض یعنی "نماز" سے خاص شغف تھا۔۔۔۔ حضرت سیدی قدس سرہٗ کو اصل دولت "معراج المومنین" ہی کی رسوخ کی صورت میں حاصل تھی۔ اور اسی میں وہ اپنے دیدہ دل کی ٹھنڈک پاتے تھے (تذکرہ ۲۸۹)

حضرت الشیخ قدس سرہٗ حقیقت نماز کے جس اعلیٰ مقام سے سرفراز تھے، ہیچمیرز اس کا کیا ادراک کر سکتا ہے۔ تاہم ان کی زندگی "فی صلوٰۃ دائمون" کی تصویر تھی۔ حضرت والا کا شعر ہے

قرب بے غیبت نماز عاشقان ۔۔۔ فی صلوٰۃ دائمون آرزوست

---

[1] ایک مرتبہ فقیر سے فرمایا۔ "سجدہ میں ایسا مزہ آتا ہے گویا بچہ نے اماں کے گود میں سر رکھ دیا ہو" او کما قال (م۔ا)
[2] الصلوٰۃ معراج المومنین

ترک نماز کسی حال میں جائز نہیں

گذشتہ مباحث سے نماز کی اہمیت وفضائل کا ایک گونہ اندازہ ہوجاتا ہے ظاہر ہے کہ اتنے مہتم بالشان فریضہ کا ترک کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔ لیکن بعض بدعقیدہ وگمراہ متصوفین نے اس بنیادی اور اہم عبادت سے اپنے خود ساختہ نظریات کی بنا پر اغماض واعراض برتنے کی کوشش کی۔ اس طبقہ کے متعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مستفسر کے جواب میں ارقام فرمایا:۔

"جو لوگ صوفی بن کر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ جن سے نماز، روزہ وغیرہ عبادات کا مقصود نہ ہونا ثابت ہو، وہ گمراہ ہیں۔"

حضرت والا قدس سرہٗ کے پاس ہر طبقہ کے طالبین آتے تھے۔ بعض ایسے حضرات بھی اپنی تربیت کو حضرت والاؒ کے سپرد کردیتے تھے۔ جو اپنی کمزوری کی بنا پر اپنی نمازوں سے غافل رہے تھے۔ ایسے مبتدی طالبین کے تربیتی خطوط میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ گذشتہ نمازوں کی قضا۔ آئندہ نماز کے اہتمام اور اس بارے میں ہر قسم کی سہل انگاری سے بچنے کی فہمائش فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ مختلف مکتوبات میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"نماز پنجگانہ اُن فرائض میں سے ہے۔ جو کسی حال میں معاف نہیں۔ اگر کسی غایتِ مجبوری سے ایسا پیش آوے تو فوراً قضا پڑھی جائے

اور فوراً استغفار کیا جائے۔ ذرا سستی کو راہ نہ دیا جائے۔ اسکے بغیر اس راہ کی ہوس بے کار ہے۔ خواہ دل چاہے نہ چاہے ہر حال میں پڑھی جائے۔ دل چاہنے پر یہ امر موقوف نہیں۔ اگر دل نہ چاہنے پر دل کو مجبور کر کے پڑھا جائے تو مجاہدہ کا ثواب مزید ہوگا۔

...... ایسے نشیب و فراز عمر میں پیش آتے ہیں۔ لیکن بہرحال جادۂ استقامت سے قدم نہ ہٹے۔ کیا دوا مریض کے دل چاہنے پر موقوف ہے۔ پھر تو مرض کا ازالہ ہو چکا۔"

"نماز کسی وقت کسی حال میں سوائے اضطراری مجبوری کے قضا نہیں کیجا سکتی۔ اور قضا نماز تو ایک ساتھ ایک دفعہ یا فرض نمازوں کے پہلے یا پیچھے قضا کی نیت سے ہر وقت کی نماز ادا کر لی جائے

..... صبح تو نماز کیلئے اٹھنا ضروری ہے۔ عادات میں تبدیلی عزیمت سے ہوتی ہے۔ جیسے کہیں سویرے ریل سے جانا ہو تو کیسے اُٹھ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی توفیق کی دعا مانگیئے .... تراویح کی قضا نہیں۔ اگر جماعت کیساتھ نہ ہو سکے، تو گھر پر پڑھ لیں، مگر معمولی عذرات پر جماعت کی تراویح ترک نہ کریں ...."

"نماز کا رہ جانا تو کسی حال میں درست نہیں۔ اس کے لئے بلا اضطرار ترک کی اجازت نہیں۔"

"نماز فجر کیلئے اگر عزم کر لیا جائے تو کچھ مشکل نہیں، اگر صبح کی گاڑی سے کہیں جانا ہو تو کیسے اُٹھ جاتے ہیں۔ اگر اس پر بھی وقت پر آنکھ نہ کھلے تو جس وقت آنکھ کھلے اسی وقت پڑھی جائے بشرطیکہ

عین طلوع کا وقت نہ ہو.....‘‘

’’یہ (سفر میں نماز قضا کرنا) درست نہیں۔ نماز سفر ہو یا حضر ہر وقت وقت کی پابندی سے ادا کرنا ضروری ہے۔ سفر میں دقت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن بندہ اگر عزم مصمم کرے تو وہ ضرور ہی پوری ہو گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ، آپ آزما کر دیکھیں، قصداً بلا معذرتِ حقیقی ترک نماز گناہ ہے اگرچہ بعد کو ادا کر لی جائے۔‘‘

قضا نمازیں: جن حضرات کی ایام بلوغ کے بعد سے نمازیں قضا ہوئی ہوتی تھیں۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو یہ آسان سا طریقہ بتا دیتے تھے۔ کہ ہر نماز کے ساتھ ایک قضا نماز دہرا لیا کریں۔ مثلاً فجر کے ساتھ فجر کے دو فرض، ظہر کے ساتھ ظہر کے چار فرض، عصر کے ساتھ عصر کے فرض، مغرب کیساتھ مغرب کے فرض، اور عشا کے ساتھ فرض اور وتر پڑھ لیا کریں۔ اس طرح آہستہ آہستہ قضا نمازیں آسانی سے ادا ہو جاتی تھیں چنانچہ مختلف طالبین کو تحریر فرماتے ہیں۔

——— ’’ایام بلوغ سے جو نمازیں چھوٹی ہوں۔ ان کو ہر نماز کے ساتھ ادا کرنا شروع کیجئے‘‘

’’بلوغ کی عمر سے پہلے کی نمازیں چھوڑ کر باقی سالوں کی نمازیں ہر نماز کے ساتھ (ایک ایک کر کے) ادا کر لی جائیں ...... عصر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں ہے۔ آپ (قضا) فرض عصر سے پہلے پڑھا کریں‘‘

’’جی ہاں! فجر کی فرض نماز کے بعد تا طلوع آفتاب کسی نماز کا وقت نہیں۔ قضائے فجر، فجر کی سنت سے بھی پہلے پڑھ لیں کسی اور

نماز کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں۔"

" قضا نمازیں اور روزے اگر باقی ہوں تو ادا کیجئے۔ تاکہ آئندہ کی راہ صاف ہو"

نماز باجماعت

اسلام میں نماز باجماعت کی جو اہمیت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا ایک اثر صحیح مسلم ونسائی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ،

" حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ جسکی خواہش ہو کہ کل (قیامت میں) وہ اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے۔ اسے چاہیئے کہ ان نمازوں کو ان مساجد میں پابندی سے ادا کرے۔ جہاں سے ان نمازوں کیلئے اذان دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہدایت کے طریقے مقرر کئے ہیں۔ اور یہ نمازیں ان ہدایت کے طریقوں میں سے ہیں۔ اور اگر تم اس جماعت سے پیچھے رہ جانے والے کی طرح جو گھر میں نماز پڑھتا ہے گھروں میں نمازیں پڑھو گے۔ تو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ دو گے۔ اور اگر تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ دو گے۔ تو گمراہ ہو جاؤ گے جو شخص بھی اچھا وضو کر کے ان مساجد میں سے کسی مسجد کی طرف جاتا ہے اللہ اسکے ہر قدم کے بدلے اسکی ایک نیکی لکھتا ہے۔ ایک درجہ بڑھاتا

ہے۔ اور ایک گناہ معاف کرتا ہے۔ اور ہم صحابہ دیکھتے تھے۔ کہ باجماعت نماز سے صرف ایسے ہی اشخاص غیر حاضر ہوتے تھے جنکا نفاق معلوم اور مسلم ہوتا تھا۔ اور یہ حالت بھی ہم نے دیکھی تھی کہ ایک شخص (بیماری کی وجہ) سے دو آدمیوں کے درمیان میں گھسٹتا ہوا لایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ صف کے درمیان میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

(صحیح مسلم باب فضل صلوۃ الجماعۃ ج۱ ص۲۳۱، سنن نسائی باب محافظ علی الصلوۃ حیث ینادی بہا ج۱ ص۱۲۵)

کتب احادیث جماعت کی نماز کی فضیلت اور ترکِ جماعت پر تشدید وعیدوں سے پر ہیں۔ حضرت والا قدس سرہٗ ہمیشہ جماعت کے اہتمام اور پابندی کی تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ مختلف طالبین کو تحریر فرماتے ہیں:

"جماعت کی پابندی ضروری ہے۔ کہ اسکا اہتمام رہے"

"نماز باجماعت کا حتی الوسع اہتمام رہے"

"نماز باجماعت کی پابندی پر مبارک، اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائیں"

"یہ (جماعت کے فوت ہونے پر) تکلیف کا احساس ایمان کی علامت ہے۔"

ایک صاحب کو جو سستی کی وجہ سے جماعت سے رہ جاتے تھے۔ ارقام فرماتے ہیں:-

"سستی کا علاج تو بقول حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ چستی ہے جب تک دل میں وہ ہمت و عزیمت پیدا نہ کریں گے جو دنیاوی کاموں کے کرنے میں دیکھی جاتی ہے۔ دین کے کام انجام نہیں پا سکتے، بلا وجہ سستی کوئی شرعی عذر نہیں ہے۔ اس محرومی کی اہمیت کو محسوس کیجیے

جو جماعت کی محرومی سے ہوتی ہے ۔ اگر مجبوری سے جماعت نہ مل سکی تو حرج نہیں اپنی کوشش جاری رہنی چاہیئے "

حضرت سید الملت نور اللہ مرقدہٗ 'سیرت النبیؐ' میں لکھتے ہیں

"کسی قوم کی زندگی، اسکی نظمِ جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے انکی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ ملانا، اور یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے ۔ جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے ۔ اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے ۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے ۔ اور فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے ۔ تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے ۔"

غرض نماز باجماعت مسلمانوں کی ملی زندگی کا شعار انکا دینی اجتماع ان کے باہمی نظم و ارتباط کا شیرازہ اور انکی روحانی زندگی کا عملی اور جامع نشان ہے ۔ اس لئے نماز باجماعت کی پابندی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے ۔

جس کے بغیر اسے دین و ایمان کا کمال نصیب نہیں ہو سکتا۔

نوافل

نوافل فرائض کا تکملہ، عبادت کی رونق، عبدیت کی بہار، للّٰہیت کا نشان عبد و معبود کا مکالمہ اور تعلق و معرفت الٰہیہ کا کامیاب ذریعہ و سبب ہے فرائض کا کمال نوافل کے اہتمام سے میسّر آتا ہے، نوافل جس قدر جاندار ہوں گے، ان کا اثر فرائض پر مرتب ہوگا۔ قیامت میں بھی فرائض کی کمی نوافل سے پوری کی جائے گی۔ چنانچہ امام ترمذی ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ :

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا، کہ قیامت میں بندہ کے اعمال میں سب سے پیشتر نماز کا حساب ہوگا۔ اگر نماز صحیح ٹھہری تو فلاح و نجات پا جائے گا۔ اور اگر نماز خراب نکلی، تباہ اور نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائے گا۔ اگر فرض نماز میں کمی ہوئی تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ میرے بندے کی نفلی نمازوں کو دیکھو اور فرائض میں جو کمی رہ گئی ہو۔ وہ نوافل سے پوری کرو۔ پھر اس کے باقی اعمال کا فیصلہ بھی اسی اصول پر کیا جائیگا۔" (جامع ترمذی صہ ۵۵ ج ۱ فی باب ما جاء ان الاوّل ما یحاسب بہ العبد الصلوٰۃ)

نوافل کی اسی اہمیت کے پیش نظر سیّدی الامام قدس سرہٗ طالبین کو ہمیشہ نوافل کے اہتمام و پابندی کا حکم فرماتے تھے۔ سنن مؤکدہ اور مستحبہ کے علاوہ نمازِ تہجد، اشراق، چاشت اور اوّابین کی پیہم تلقین فرماتے تھے چنانچہ مختلف طالبین کو ارقام فرماتے ہیں :۔

۱:۔ "نماز پنجگانہ کے علاوہ حسب ذیل نمازوں پر حتی الامکان مداومت کیجئے۔ نماز تہجد، بعد مغرب چھ رکعات نفل، طلوع آفتاب کے بعد دو یا چار رکعات نفل، چاشت چار رکعت، نماز پنجگانہ کے بعد نوافل مسنونہ، نوافل اگر بعذر کبھی چھوٹ جائیں تو حرج نہیں"

۲:۔ "تہجد کی آٹھ سے بارہ رکعتوں تک پڑھا کریں۔ اشراق کی چار اور اوابین کی چھ (رکعات) پڑھیں۔"

۳:۔ "آپ تہجد اور نوافل اوابین چھ رکعات بعد سنت مغرب اور چار رکعات اشراق جب آفتاب کچھ نکل کر بلند ہو جائے، تہجد میں چھ رکعات سے بارہ رکعات تک نصف شب کے بعد پڑھا کریں۔"

۴:۔ "اشراق ضرور پڑھیں..... چاشت کی نماز (بھی) پڑھا کریں۔ مغرب کے بعد اوابین پر قناعت کیجئے۔ ہو سکے تو تہجد کی مداومت اختیار کیجئے۔"

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"دو باتوں کا خاص لحاظ رکھا جائے۔ اول فرائض کی ادائیگی کا پورا پورا اہتمام، دوم نوافل مسنونہ اور اذکار کی کثرت، انکے علاوہ ہر قسم کے گناہوں سے احتراز کا اہتمام رکھا جائے کہ دل میں تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو۔"

نماز تہجد

بندگی و عبدیت اطاعت و فرمانبرداری کے کمال کے ساتھ ذکر دائم و قیام لیل طریق کا ضروری جزء ہے۔ صلوۃ اللیل و تہجد اور پچھلی رات کی عبادت کے فیوض و برکات انوار و اثرات شب زندہ دار خاصانِ حق ہی جان سکتے ہیں۔ نفس کی اصلاح اور قربتِ رب کے حصول میں شب بیداری اور صلوۃ اللیل کا خاص حصہ ہے۔ جس پر قرآن کریم کی آیات کریمہ

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا (المزمل - ۱)

بیشک رات کا اٹھنا (نفس کے) کچلنے کیلئے بہت سخت ہے۔ اور بات خوب سیدھا کرنے والا ہے

اور تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ

ان کے پہلو خوابگاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس طور پر کہ وہ لوگ اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں خرچ کرتے ہیں

مَا اُخْفِیَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ	سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی
اَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا	ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کیلئے خزانہ غیب
يَعْمَلُوْنَ (سجدہ-۲)	میں موجود ہے۔ یہ انکوان کے اعمال کا صلہ ملا ہے۔

اور احادیث کثیرہ شاہد ہیں۔ بمونتہً چند احادیث نقل کرتا ہوں۔

امام ترمذی نے جامع میں، ابن ابی الدنیا نے کتاب التہجد، ابن خزیمہ نے صحیح اور حاکم نے مستدرک میں ابوامامہ الباھلی رضی کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

عليكم بقيام الليل، فانّه دأب	رات کے قیام کی پابندی کرو کہ یہ تم سے
الصالحين قبلكم وقربة الى ربكم	پہلے صالحین کی عادت وطریقہ ہے۔ اور تمہارے
ومكفرة للسّيّاٰت ومنهاةٌ عن	پروردگار کی طرف قربت کا ذریعہ خطاؤں کا محو
الاثم[۱]	کرنیوالا اور گناہ سے روکنے والا ہے

طبرانی اور ترمذی کی ایک روایت میں یہ الفاظ مزید آتے ہیں:۔

ومطردة للداءِ عن الجسدِ[۲]	اور جسم سے بیماری کو دور کرنے والا ہے

حضرت ابوہریرہ رضی کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

افضل الصلوٰة بعد الفريضة	فرائض کے بعد سب سے افضل نماز رات
صلوٰةُ الليل[۳]	کی نماز (تہجد) ہے

---

[۱] الترغیب والترھیب للمنذری ص۴۲۴ ج۱، الحاکم نے اپنی روایت کو بخاری کی شرط پر صحیح لکھا ہے۔

[۲] الترغیب والترھیب ص۴۲۵ ج۱ بحوالہ کبیر طبرانی و جامع ترمذی

[۳] الترغیب والترھیب ص۴۲۲ ج۱، بحوالہ مسلم، ابوداؤد، نسائی ابن خزیمہ

عبداللہ ابن سلامؓ کہتے ہیں کہ (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے وقت مدینہ پہنچنے پر) جو میں نے آپکی پہلی بات سُنی وہ یہ تھی :-

ایھا الناس افشوا السلام واطعموا — اے لوگو! سلام (السلام علیکم) کو لوگوں میں پھیلاؤ

الطعام وصلوا الارحام وصلّوا باللیل — اور (اللہ کیلئے) کھانا کھلاؤ اور صلہ رحمی کرو۔

والناس نیام تدخلوا الجنۃ — اور جب لوگ سوتے ہوں اسوقت رات میں (تہجد کی)

بسلام[۴] — نماز پڑھو۔ (اوران اعمال کی وجہ سے) جنت میں سلامتی کیساتھ داخل ہو جاؤ۔

اسماء بنت یزیدؓ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں۔ کہ قیامت کے دن لوگ ایک ہموار میدان میں اکھٹے کیئے جائیں گے۔ اور (اللہ کی طرف سے) ایک منادی پکارے گا :-

أین الذین کانو انتجافی — کہاں ہیں وہ لوگ جو (تہجد کیلئے) اپنے پہلوؤں

جنوبھم عن المضاجع — کو اپنے بستروں سے جدا کرتے تھے۔

پس وہ لوگ کھڑے ہو جائیں گے۔ اور وہ تھوڑے ہوں گے۔ پس وہ بغیر حساب جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد باقی سب لوگوں کیلئے حساب کا حکم دیا جائیگا[۵]

امام بخاری ومسلم، مالک، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے ابوہریرہؓ سے

---

[۴] رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح وابن ماجہ والحاکم وقال صحیح علی شرط الشیخین کذا فی الترغیب والترھیب صـ۴۲۳ ج ۱

[۵] الترغیب والترھیب صـ۴۲۵ ج ۱ بحوالہ البیہقی

روایت کیا ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :
" تم میں سے جب کوئی سو جاتا ہے۔ تو شیطان اسکی گردن پر تین گرہیں لگا دیتا ہے۔ اور ہر گرہ لگاتے وقت کہتا ہے۔ " رات کو دیر تک آرام سے سوتا رہ۔ " پس اگر وہ جاگے اور اللہ کا ذکر کرے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ اور پھر اگر وضو بھی کرلے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے۔ اور اگر نماز بھی پڑھ لے تو تمام گرہیں کھل جاتی ہیں۔ (اور شیطانی اثرات زائل ہو جاتے ہیں) اور وہ ترو تازہ پاکیزہ نفسی کی حالت میں سویرا کرتا ہے[۱]، ورنہ خبیث النفس اور سستی کی حالت میں صبح کرتا ہے[۲]

ابن خزیمہ نے صحیح میں اس کے بعد یہ لفظ نقل کئے ہیں :۔

فحلوا عقد الشیطان ولو	پس شیطان کی ان گرہوں کو کھولو۔ اگر دو
برکعتین[۱]	رکعت ہی (تہجد کی) نماز پڑھ سکو

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔
" جو شخص رات کو (نماز تہجد کیلئے) اٹھے اور اپنی بیوی کو جگائے اور اگر اس پر نیند کا غلبہ ہو تو اس کے منہ پر پانی کا چھینٹا دے کر اٹھا دے اور دونوں اپنے گھر میں رات کے کچھ حصہ تک (نماز پڑھ کر) اللہ تعالیٰ کو یاد کریں۔ تو اللہ تعالیٰ دونوں کو بخشش دے گا "

---

[۱] ابن ماجہ نے یہاں یہ الفاظ مزید لکھے ہیں کہ اسے خیر پہنچ چکی ہوتی ہے۔
[۲] اور اسے خیر نہیں پہنچی ہوتی۔

ابوہریرہؓ اور ابو سعیدؓ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"جب کوئی شخص رات کو اُٹھے اور اپنی بیوی کو بھی اٹھائے اور دونوں دو رکعت نماز (تہجد) پڑھیں۔ تو دونوں اللہ تعالیٰ کے کثرت سے ذکر کرنے والوں اور والیوں میں لکھ دیئے جاتے ہیںؔ ۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نوافل میں نماز تہجد کی اس خصوصی اہمیت کے پیش نظر اس کی پابندی اور اہتمام کی سب سے زیادہ تاکید فرماتے تھے۔ ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں :-

"تہجد اور ذکر یہ دونوں اس طریق کی ضروری چیزیں ہیں۔ ان پر مداومت رکھیئے"

ایک سالک کو تحریر فرماتے ہیں :-

"تہجد کا التزام ازبس ضروری ہے۔ یہی مفتاح اسرار ہے۔ اگر رات کو احیاناً ناغہ ہو جائے تو بوقت چاشت بارہ رکعتیں پڑھیں"

ایک اور صاحب کو لکھتے ہیں

"نماز پنجگانہ باجماعت اور تلاوت اور تہجد و ذکر کا اہتمام چاہیئے۔ استقامت اور مداومت حصول مقصد کا سب سے کارگر ذریعہ ہے اگر نیند کا غلبہ ہو تو نوافل تہجد کی جگہ پر دن کو (بارہ رکعات) بعد اشراق پڑھیں۔ یا نماز عشا کے بعد وتر سے پہلے پڑھیں۔"

ایک مکتوب میں ہے :- "تہجد کا اہتمام جاری رکھیں"

۱؎ الترغیب والترھیب ص ۴۲۹ ج ۱ بحوالہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور حاکم میں بھی اس کے ہم لفظ روایات ہیں۔

ان ہی کے ایک اور خط میں تحریر ہے :

"خوشی کی بات ہے، کہ آپ تہجد پڑھتے ہیں۔ پہلے جب کبھی آپ کو تہجد کا موقع ملتا تھا۔ اس وقت دعا کی طرف جو توجہ اور جو گریہ ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی پڑھنے کی وجہ سے تھا۔ اب مداومت سے پڑھنے پر جو وہ کیفیت روزانہ نہیں ہوتی تو اسمیں کوئی حرج نہیں یہ ایسے ہی ہے۔ کہ جسکو کبھی کبھی پلاؤ کھانے کو ملتا ہے۔ تو اس میں اسکو بہت مزہ ملتا ہے۔ لیکن جب وہی غذا کسی کو روزانہ ملنے لگے تو وہ مزا نہیں ملتا، مساوات ہو جاتی ہے۔ پھر گریہ سے تہجد کی مداومت ہزار درجہ بہتر اور شکر کے قابل ہے۔"

لے ایک مولوی صاحب نے (جنہیں حضرت والا قدس سرہٗ سے ارادت کا بھی تعلق تھا) تہجد کے متعلق ایک استفتاء حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت سیدی نور اللہ مرقدہٗ کا جواب چونکہ تہجد کی اہمیت پر برہان ساطع ہے۔ اس لئے استفتاء و جواب دونوں کو نقل کرتا ہوں۔

استفتاء	جوابِ شیخ
"نماز تہجد کا مرتبہ محدثین و فقہا کے نزدیک کیا ہے۔ اسپر دوام اور لزوم کرنے والا مثیب ہوگا یا مسئی۔ اور یہ نماز نوافل سے ہے یا سنن مؤکدات سے ہے اگر نوافل سے ہے تو حدیث صحیح عن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	استفتاء مفتی سے لیں اور تعلیم مرشد سے ہے، دونوں کا ایک سے نہیں ہو سکتے۔ یہ حدیث مؤکدیت کے خلاف تو نہیں "علیکم" تو لزوم پر دال ہے۔ بہرحال تہجد عجیب عبادت ہے۔ جس پر خود

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

علیکم بقیام اللیل فانه داب الصالحین قبلکم وھو قربة لکم الی ربکم ومکفرة للسیات ومنھاة عن الاثم (رواہ الترمذی) کا منشاء صحیح کیا ہوگا اور رسالہ کی اس عبارت کا جواب کیا ہوگا۔

"نماز تہجد سنت مؤکدہ است پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم گاہے ترک نفرمود واگر احیاناً فوت شدہ دوازدہ رکعت در روز قضا فرمود الخ"

کسی مولوی صاحب کا فرمانا کہ یہ نماز امت کے لئے نہیں یہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مخصوص تھی۔ لہذا اگر کوئی شخص اس کو اپنے اوپر لازم کرے گا۔ اور مداومت کے ساتھ ادا کرے گا۔ اور گاہے قصداً ترک نہیں کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

مولوی مذکور کا قول ضلالت پر مبنی ہے یا ہدایت پر۔ محدثین وفقہا کی تصریحات کی روشنی میں اس کا جواب مرحمت فرمائیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً دوام فرمایا ہے۔ اس لئے سنت مؤکدہ کی تعریف اس پر صادق ہے البتہ قولاً تاکید نہیں فرمائی۔ شفقتہً علی الامت، مگر اپنے عمل سے اس کو مؤکد ثابت کردیا، اب اہل محبت کے لئے کیا گنجائش ہے۔ فضائل اعمال کے اکتساب کا سبق محدثین سے نہ لیں، محبین سے لیں۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ عجیب مشفقانہ وحکیمانہ انداز میں تہجد کی تاکید فرماتے تھے اور طالبین کے عذرات کو رفع فرماتے تھے۔ ایک مسترشد کو تحریر فرماتے ہیں:-

"خدا کا شکر ہے۔ کہ رمضان میں (تہجد کی) یہ سعادت نصیب ہوئی، اب شوال، ذیقعدہ، ذوالحجہ کو رمضان بنائیے۔ یعنی وہی تہجد پر مداومت ۲، ۲ رکعت کر کے آٹھ رکعتیں عشا کے بعد سے وقت سحری تک کسی وقت ادا کیجئے۔ اور دل میں تصور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ سے باتیں ہو رہی ہیں۔" (تذکرہ ص ۲۹۷)

ایک سالک کو لکھتے ہیں:-

"(تہجد کے وقت) اگر گرم پانی کے اہتمام سے آپ عاجز ہیں اور ٹھنڈے پانی سے ضرر ہوتا ہے۔ تو خیر تیمم کرلیں، مگر گرم پانی کا اہتمام چنداں مشکل نہیں۔ عشاء کے وقت ایک لوٹا گرم پانی جو خوب گرم ہو۔ اس کو اوپر کٹورے سے چھپا کر کسی روئی یا روئی کے کپڑے میں یا کمبل میں لپیٹ دیجئے۔ انشاء اللہ تعالےٰ وقت پر پورا گرم ملے گا۔"

ایک اور صاحب کو لکھتے ہیں:

"(تہجد کیلئے) صبح صادق سے گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے اٹھنا کافی ہے۔ آپ اپنے یہاں کے اوقات سے اندازہ لگالیں۔ صبح اٹھنے کیلئے رات کو سویرے بعد عشا سونا لازم ہے۔ تاکہ صحت پر اثر نہ پڑے۔"

ایک اور طالب کے خط میں رقم فرمایا :

"اس (تہجد کے فوت ہونے کے) افسوس پر شکر ادا کیجئے۔ کہ یہ بھی نعمت ہے۔ کتنے ہیں کہ فرائض سے محرومی پر ان کو افسوس نہیں ہوتا۔ اگر تہجد قضا ہو جائے تو طلوعِ آفتاب کے بعد سے دوپہر تک بارہ رکعتیں پڑھ لی جائیں ..... انشاءاللہ (تہجد کی) عادت پختہ ہو جائیگی۔ تو پھر آپ اٹھنا نہ بھی چاہیں گے۔ تو بھی انشاءاللہ اُٹھیں گے۔"

تہجد بالجماعۃ

حضرت والا قدس سرہٗ سے کسی مستفسر نے تہجد باجماعت اور تہجد میں قرأت جہری کے متعلق پوچھا۔ حضرت الشیخؒ نے جواباً تحریر فرمایا :

"تہجد کی نماز باجماعت اتفاقاً ہو جائے تو جائز ہے۔ مگر اہتمام و دعوت کیساتھ مناسب نہیں۔" "تہجد کی نماز ذرا جہر سے پڑھنا مستحب ہے"

ایک حافظ صاحب نے تہجد میں قرآن کریم سنانے کے بارے میں استفسار کیا۔ حضرت والاؒ نے ارقام فرمایا :

"تہجد بالجماعۃ اگر اتفاقاً ہو جائے تو جائز ہے۔ ورنہ اہتمام و تداعی کے ساتھ نہیں۔ غور کرنا چاہیئے کہ اس میں ریا اور نمود کی خواہش تو پوشیدہ نہیں۔"

ادعیہ تہجد

تہجد کا وقت اور پچھلی رات عجب برکت و نورانیت، نزول رحمت، اجابتِ دعاء عطائے رب اور قربتِ حق کی ساعت سعید ہوتی ہے حضرت ابوہریرہؓ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ کہ

"ہمارا رب ہر رات کا جب آخر تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ اور ارشاد فرماتا ہے: کون ہے جو مجھے پکارے تاکہ میں اسکی پکار کو سنوں؟ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے پس میں اس کے سوال کو پورا کروں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت چاہے تاکہ میں اسے بخش دوں۔"

دوسری روایت میں ہے کہ :۔

"جب رات کا پہلا تہائی حصہ گذر جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے رہتے ہیں۔" کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے؟ کیا کوئی توبہ کرنے والا ہے؟ کیا کوئی سوال کرنے والا ہے؟ کیا کوئی دعا مانگنے والا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ طلوع فجر تک یوں ہی آواز دیتے رہتے ہیں۔" (جمع الفوائد ص۶۱۶ ج۲ بحوالہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد و ابن ماجہ)

اللہ اکبر کیا نوید جانفزا ہے۔ اور رحمت بیکراں کا کیسا مژدہ عام ہے! خوش نصیب ہیں وہ اشخاص جو ندائے رب پر لبیک کہتے ہیں۔ اور ہر رات اپنی مرادیں اور آرزوئیں کریم و رحیم پروردگار کی بارگاہ قدس میں پیش کر کے عطاء ربانی

اور فضلِ صمدانی سے مالا مال ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کی سب سے زیادہ مناسب دعائیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی امت کو بتا سکتے تھے۔ اس لئے تہجد اور پچھلی رات میں ماثورہ اور مسنون دعائیں پڑھنا خاص برکت وعطا کا سبب ہے۔ ہمارے حضرت والا قدس سرہٗ طالبین کو تہجد کی دعاؤں کے یاد کرنے اور انہیں اسوقت پڑھنے کی خاص تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک مسترشد خاص کو ارقام فرماتے ہیں:

"تہجد میں وہی تسبیحیں بالفعل پڑھئے۔ جو عام نمازوں میں پڑھتے ہیں مگر احادیث و ادعیہ سے وہ تسبیحیں یاد کر لیجئے جو تہجد میں شروع قیام میں رکوع و سجود میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے۔"

ایک سالک کو تہجد کی دعائیں خط میں لکھ کر ارسال فرمائیں اور تحریر فرمایا:

(تکبیر تحریمہ سے پہلے یہ دعائیں پڑھیں)

اللّٰھم ربنا لك الحمد انت قیم السمٰوٰت والارض ومن فیھن، ولك الحمد انت نور السمٰوٰت والارض ومن فیھن، (اللّٰھم لك الحمد انت رب السمٰوٰت والارض ومن فیھن) ولك الحمد انت ملك السمٰوٰت والارض ومن فیھن، ولك الحمد انت الحق ووعدك ولقاؤك حق وقولك حق، والجنة حق والنار حق، والنبیون حق ومحمد (صلی اللّٰه علیه وسلم) حق والساعة حق اللّٰھم لك اسلمت وبك اٰمنت وعلیك توکلت و الیك انبت وبك خاصمت والیك حاکمت فاغفرلی

ما قدمت وما أخرت وما أسررت وما اعلنت وما
أنت اعلم به منّی انت المقدم انت الموخر لا الٰه
الا انت[1] إنّی وجهت وجھی للّذی فطر السمٰوات والارض
حنیفا وما انا من المشرکین

اور یہ دعاء (جو بندہ نے سنائی تھی)۔

اَللّٰھُمَّ ربَّ جِبرَائِیلَ وَمیکَائِیلَ وَ اِسرَافِیلَ فَاطِرَالسَّمٰوٰتِ
وَالاَرضِ عَالِمِ الغَیبِ وَ الشَّھَادَةِ اَنتَ تَحکُمُ بَینَ عِبَادِکَ
فِیمَا کَانُوا فِیہِ یَختَلِفُونَ اِھدِنِی لِمَا اختُلِفَ فِیہِ مِنَ
الحَقِّ بِاِذنِکَ اِنَّکَ تَھدِی مَن تَشَاءُ اِلیٰ صِرَاطٍ مُّستَقِیمٍ[2]۔

تہجد کے لئے اٹھتے ہوئے تکبیر تحریمہ سے پہلے پڑھنے کا ارشاد فرمایا پھر

اَللّٰھُمَّ اِنِّی وَجَّھتُ وَجھِیَ لِلَّذِی فَطَرَ السَّمٰوٰاتِ وَالاَرضَ
حَنِیفاً مُّسلِماً وَّمَا اَنَا مِنَ المُشرِکِینَ۔ اِنَّ صَلاَتِی وَنُسُکِی وَمَحیَایَ
وَمَمَاتِی للّٰہ رَبِّ العٰلَمِینَ لاَ شَرِیکَ لَہُ وَ بِذَالِکَ اُمِرتُ
وَاَنَا مِنَ المُسلِمِینَ[2] کہنے کے بعد تکبیر تحریمہ

تکبیر تحریمہ:۔ اللہ اکبر کبیرا والحمد للہ کثیرا وسبحان اللہ بکرۃ و أصیلا[3]

ثنا کے بعد تعوذ سے پہلے:۔ اَللّٰھُمَّ باعد بینی و بین خطایای
کما باعدت بین المشرق والمغرب اَللّٰھُمَّ نقنی من الخطایای

---

[1] رواہ مسلم واصحاب السنن عن عائشۃ (جمع الفوائد ص۱۲۵ ج۱) وصحیح مسلم ص۲۶۳ ج۱

[2] جمع الفوائد ص۱۲۶ بحوالہ مسلم، ابوداؤد، نسائی، مشکوٰۃ بحوالہ مسلم ص۷۷ ج۱

[3] الوابل الصیب ص۱۳۹ بحوالہ سنن ابوداؤد [4] مشکوٰۃ بحوالہ بخاری ومسلم ص۷۷

كما ينقى الثوب الابيض من الدنس اللّٰهُمَّ اغسل خطاياى
بالماء والثلج والبرد۔

رکوع میں :۔

اللّٰهم لك ركعت ولك اسلمت وبك امنت خشع
لك سمعى وبصرى ومخى وعظمى

سجود میں :۔

اللّٰهم لك سجدت وبك امنت ولك اسلمت سجد
وجهى للذى خلقه وصوره وشق سمعه وبصره "

فقیر سے نماز و وضو اور تہجد کی مختلف دعاؤں کے متعلق ایک مرتبہ استفسار فرمایا۔ اور فقیر سے تہجد میں اٹھتے وقت، رکوع و قومہ اور سجدہ وغیرہ سن کر خوشی کا اظہار اور تحسین فرمائی۔ افادہ عام کیلئے ان کی دعاؤں کو اور حضرت سیدی قدس سرہٗ کی بتائی ہوئی ترتیب کو نقل کرتا ہوں

تکبیر تحریمہ سے پہلے

مذکورۃ الصدر دعاء : اللّٰهم لك الحمد انت قيم السموٰت
والارض ومن فيهن الى آخره[1]

رکوع میں :۔ اللّٰهُمَّ لك ركعت وبك آمنت ولك اسلمت
خشع سمعى وبصرى ومخى وعظمى وما استقلت به قدمى

---

[1] اس دعاء کو بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی ابن ماجہ ونسائی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب آپ تہجد کیلئے رات کو اٹھتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے (جمع الفوائد ص۶۲۴ ج۲) ابن قیم نے صحیحین کے حوالہ سے رب السمٰوٰت والارض الخ کی زیادت نقل کی ہے (زاد المعاد)

لله رب العلمین[1]

قومہ میں :- اللّٰھم ربنا لك الحمد ملأ السمٰوات والارض وما بینھما وملاء ما شئت من شیء بعد[2]

سجدہ میں :- اللّٰھم لك سجدت وبك امنت ولك اسلمتُ سجد وجھی للّذی خلقہ وصورہ و شقّ سمعہ وبصرہ تبارك اللّٰہ احسن الخالقین[3]

تشہد و درود شریف کے بعد :-

اللّٰھم انت الملك لا إلٰہ الا انت انت ربّی و انا عبدك ظلمتُ نفسی و اعترفت بذنبی فاغفرلی ذنوبی جمیعا انہ لا یغفر الذنوب الا انت واھدنی[ع] لاحسن الاخلاق انہ لا یھدی لاحسنھا الا انت واصرف عنّی سیّٔھا لا یصرف عنّی سیّٔھا الا انت لبیك وسعدیك والخیر کلہ فی یدیك والشر لیس الیك انا بك والیك تبارکت وتعالیت و

---

[1] کتاب الاذکار للامام النووی ص۴۸ بحوالہ صحیح مسلم

[2] صحیح المسلم ص۲۶۳ ج ۱ : [3] صحیح مسلم ص۲۶۳ ج ۱

[ع] علامہ الہیثمی نے مجمع الفوائد میں طبرانی کے حوالہ سے ابوایوبؓ، ابن عمرؓ اور ابوامامہؓ سے احادیث نقل کی ہیں جس میں " اللھم اھدنی لصالح الاعمال والاخلاق کے الفاظ آتے ہیں حضرت رحمہ اللہ علیہ نے بندہ کو فرمایا تھا کہ اس دعا میں اھدنی لصالح الاعمال والاخلاق ہی پڑھ لیا کریں (مجمع الزوائد ص۱۱۱ ج ۱۰، ص۱۱۲ ج ۱۰، ص۱۷۳ ج ۱۰)

استغفرك واتوب اليك[1] اللهم اغفر لی ما قدمت

وما اخرت وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت

وما انت اعلم به منی انت المقدم وانت المؤخر

لا اله الا انت[2] اللهم انی ظلمت نفسی ظلماً كثيرا

ولا يغفر الذنوب الا انت فاغفر لی مغفرة من عندك

وارحمنی انك انت الغفور الرحيم[3]

ختم تہجد پر دعا

اللهم انی اسئلك رحمة من عندك تهدی بها قلبی وتجمع بها امری وتلم بها شعثی و
تصلح بها غائبی و ترفع بها شاهدی وتزكی بها عملی وتلهمنی بها رشدی وتعصمنی
بها من كل سوء اللهم اعطنی ايماناً و يقيناً ليس بعده كفر و رحمة انال بها شرف
كرامتك فی الدنيا والاخرة اللهم انی اسئلك الفوز فی القضاء ونزل الشهداء وعيش
السعداء والنصر علی الاعداء اللهم انی انزل بك حاجتی وان قصر رايی وضعف عملی افتقرت الی
رحمتك فاسئلك يا قاضی الامور ويا شافی الصدور كما تجير بين البحور ان تجيرنی من عذاب السعير
ومن دعوة الثبور ومن فتنة القبور اللهم ما قصر عنه رايی ولم تبلغه نيتی ولم تبلغه مسألتی
من خير وعدته احداً من خلقك او خير انت معطيه احداً من عبادك فانی ارغب اليك فيه و اسالكه
برحمتك رب العالمين اللهم ذا الحبل الشديد والامر الرشيد اسئلك الامن يوم الوعيد والجنة يوم الخلود
مع المقربين الشهود الركع السجود الموفين بالعهود انك رحيم ودود وانك تفعل ما تريد اللهم اجعلنا
هادين مهتدين غير ضالين ولا مضلين سلماً لاوليائك وعدواً لاعدائك نحب بحبك من احبك
ونعادی بعداوتك من خالفك اللهم هذا الدعاء وعليك الاجابة وهذا الجهد وعليك التكلان
اللهم اجعل لی نوراً فی قلبی ونوراً فی قبری ونوراً من بين يدی ونوراً من خلفی ونوراً عن يمينی ونوراً
عن شمالی ونوراً من فوقی ونوراً من تحتی ونوراً فی سمعی ونوراً فی بصری ونوراً فی شعری ونوراً فی
بشری ونوراً فی لحمی ونوراً فی دمی ونوراً فی عظامی اللهم اعظم لی نوراً واعطنی نوراً واجعل لی نوراً سبحان
الذی تعطف العز وقال به سبحان الذی لبس المجد وتكرم به سبحان ذی الجلال والاكرام ——— رواه الترمذی

تنبیہ: یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دعائیں پڑھنا مستحب ہے اگر یاد نہ ہوں تو انکی وجہ سے تہجد پڑھنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے مزید برآں نماز کے اندر دعائیں حنفیہ کے نزدیک صرف نوافل و تہجد کے ساتھ مختص ہیں

---

[1] صحیح مسلم ص۲۶۳ ج ۱ [2] صحیح مسلم ص۲۶۲ ج ۱، [3] ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین ص۲۰۷

نماز توبہ

انسان گناہگار ہے۔ خطاونسیان اسکا خمیر ہے۔ حدیث شریف میں ہے؛

کلُّ بنی آدم خطاء وخیر الخطائین التوابونؑ — تمام بنی آدم خطاکار ہیں لیکن بہتر گنہگار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں۔

حضرت سیّدی قدس سرّہ اپنے ایک خادم کو لکھتے ہیں۔

"بندہ ہر حال میں گنہگار ہے۔ اور خدا کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کا اعتراف اور اپنی غلط کاری اور تساہل پر ندامت اور آئندہ گناہوں سے بچنے اور احکام الٰہی پر عمل کرنے پر استقامت اور ساری عمر اسی ریاضت میں گذار دینا یہی اپنی بندگی ہے" ؑ

ؑ جمع الفوائد بحوالہ ترمذی ص۲۰۶ ج۲ و رواہ ایضاً احمد وابن ماجہ والحاکم (اعزاب للوارد)

ؑ۲. کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

انا المذنب الخطاء والعفو واسع ۔ ولو لم یکن ذنب لما وقع العفو (الاذکار للنووی ص۳۵۵)

(میں انتہائی خطاکار وگناہگار ہوں۔ اور اللہ کی مغفرت وسیع ہے) اگر گناہ نہ ہوتے تو عفو ومعافی کیسے ہوتی۔

ؑ عصیان ما ورحمت پروردگار ما — ایں را نہایتے نہ آں را نہایتے

حضرت والاؒ طالبین کو عموماً اور بیعت ہونے والوں کو خصوصاً گناہوں کی بخشش کیلئے توبہ و استغفار کی کثرت کے ساتھ "صلوٰۃ التوبہ" کی تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ مختلف حضرات کے نام متعدد مکتوبات میں اس قسم کے ارشادات ملتے ہیں:-

۱:- "خوب سوچ سمجھ کر جس وقت اس راہ پر قدم رکھنے کی عزیمت ہو جائے۔ وضو کر کے خضوع و خشوع سے دو رکعت نفل (توبہ) ادا کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگیئے اور استغفار کیجئے اور دل میں اللہ تعالیٰ سے عہد کیجئے۔ کہ اب خدا کے احکام سے حتی الامکان سرتابی نہ ہو گی۔ اور جھوٹ، غیبت، بدنظری اور تمام لغویات سے پرہیز کروں گا۔"

انہیں کو دوسرے خط میں لکھا:-

آپ کا خط پڑھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مزید توفیقات سے آپ کو بہرہ ور فرمائیں۔ آپ نے دو رکعت نماز (توبہ) پڑھ کر جو دعاء مانگی یہ گذشتہ سے توبہ اور آئندہ کیلئے صحیح راستہ پر چلنے کا ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دعاء قبول فرمائیں اور آئندہ کی توفیق عنایت فرمائیں ...... تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام رکھیئے اگر غلطی سے کبھی ہو جائے تو یاد آنے پر فوراً استغفار کیجئے اور نیا عہد کیجئے۔ کہ انشاء اللہ اب اپنے قصد سے اس کا ارتکاب نہیں ہو گا۔"

ایک خادم کو غائبانہ بیعت کرنے پر آمادگی کا اظہار فرماتے ہوئے تحریر فرمایا:

"میں بیعت میں آپ کو لینے کو تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے اور آپ کو فائدہ پہنچائے۔ آپ کو جب یہ خط ملے تو بعد نماز مغرب یا جس وقت آپ کو طمانیت ہو اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز تنہائی میں نماز توبہ کی نیت سے پڑھیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں ......"

ایک صاحب نے گذشتہ معاصی پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے تدارک کی صورت پوچھی اور لکھا کہ:

"طبیعت چاہتی ہے۔ کہ کسی صورت زندگی کا گناہوں والا حصہ الگ ہو کر باقی زندگی بے داغ اور عین اسلامی گذاری جائے۔ بہر حال اب اس کے تدارک کی کیا صورت ہے۔"

حضرت والاؒ نے جواباً تحریر فرمایا:

"یہ کیفیت حظ زدہ بہت اچھی ہے۔ اب آپ ایک روز تہیہ اور عزم کر کے وضو اچھی طرح کیجئے اور خلوص سے نماز توبہ ادا کیجئے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی پورے خضوع اور خشوع سے مانگیں اور عزیمت کریں۔ اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں۔ کہ اب کوئی عصیان کا کام نہ ہونے پائے۔"

ایک دوسرے طالب کو ارقام فرمایا:

"آپ کسی وقت دو رکعت نفل (توبہ) باخلاص پڑھ کر استغفار

کیجئے۔ اور اسی وقت سے کام شروع کر دیجئے۔ اور پوری توبہ گذشتہ تقصیروں پر کر کے آگے کیلئے اطاعت کامل کا عزم کیجئے اللہ تعالیٰ پورا فرمائیں گے۔ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔

ایک مسترشد کو لکھا:۔

"کسی جمعیت خاطر کے وقت اچھی طرح وضو نیت کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہکر کریں۔ اور دو رکعت نماز کمال خشوع و خضوع کے ساتھ نماز توبہ کی نیت سے پڑھیں۔ پہلی رکعت میں "قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ" اور دوسری رکعت میں "قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" پڑھا جائے۔ اور اسکے بعد کمال استقامت کے ساتھ گذشتہ معاصی سے بدرگاہ الٰہی پوری انابت، عاجزی و مسکینی سے توبہ کی جائے۔ اور آئندہ ان معاصی سے بچنے کا عزم صمیم کیا جائے"

غرض حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نماز توبہ کی گناہوں کے معافی کیلئے بہت تاکید فرماتے تھے۔ حدیث میں بھی صلوٰۃ التوبہ کی بہت فضیلت آئی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے

مامن رجلٍ یذنبُ ذنبا ثم	جس شخص سے گناہ صادر ہو جائے پھر
یقوم فیتطھّرُ ثم یصلّی ثم	وہ اٹھے۔ اچھی طرح وضو کرے پھر
یستغفر اللہ اِلّا غفر اللہ لہٗ	نماز پڑھے پھر استغفار پڑھے تو
ثم قرأ ھٰذہِ الاٰیۃ وَالّذین	اللہ تعالیٰ (اس عمل کی برکت) اسے

إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا	گناہ بخش دیگا۔ پھر آپ نے تائید میں یہ آیت
اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللهَ۔ الی آخر الاٰیة	پڑھی (جس کا ترجمہ یہ ہے)
(رواہ الترمذی وقال حدیث حسن)	اور ایسے لوگ جب کوئی ایسا کام کر

گذرتے ہیں۔ جس میں زیادتی ہو۔ یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں۔ پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو۔ اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے اور وہ جانتے ہیں۔"

ابوداؤد و نسائی، ابن ماجہ صحیح ابن حبان اور بیہقی میں بھی یہ روایت ہے ابن حبان اور بیہقی نے "ثم یصلی رکعتین" پھر دو رکعت نماز پڑھے کے لفظ روایت کئے ہیں۔ ابن خزیمہ نے بھی اسی طرح سے روایت بغیر سند کے نقل کی ہے[1]

---

[1] الترغیب والترھیب منذری ص ۱۶۲/۱۶۰

تکمیل وتحسین صلوٰۃ

نماز بقول قاضی بیضاویؒ "ام العبادات، مومنین کا معراج اور رب العلمین سے سرگوشی (مناجات) ہے[۱]

امام غزالیؒ لکھتے ہیں

فان الصلوۃ عماد الدین وعصام	نماز دین کا ستون، یقین (و ایمان)
الیقین ورأس القربات وغرة	کا گلو بند (زیور) قربت والے اعمال
الطاعات[۲]	کی سردار اور طاعات میں سب سے پسندیدہ ہے

نماز روحِ دین، نورِ ایمان، جانِ عبادت اور بہارِ طاعت ہے۔ تکمیل صلوٰۃ مومن کا سب سے بڑا زینہ ہے۔ سیرت سازی اور تربیت نفس، تعمیر اخلاق، اصلاح باطنی، صفائی قلب اور حصول عبدیت میں نماز کا عظیم حصہ ہے نماز ایک ایسی قوتِ متحرکہ ہے جو نمازی کو احکام الٰہی کا پابند اور معاصی سے مجتنب ونفور بنادیتی ہے۔ ایمان و تقویٰ کا کمال نماز کے کمال پر منحصر ہے گذشتہ اوراق میں اس مہتم بالشان عبادت کے متعلق جو مباحث گذرے ہیں۔ اس سے بھی نماز کے ظاہری و باطنی آداب کی رعایت اس کے

۱۔ التفسیر البیضاوی

۲۔ احیاء العلوم الدین صفحہ ۱۴۵ ج ۱

احکام کی حفاظت اور تحسین و تکمیل کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت سیدی قدس سرہٗ نماز کی درستگی و کمال، آراستگی و جمال اور اس کی روح وحقیقت کے حصول و بقا اور اسکی ظاہری و باطنی تزئین و آرائش کے لئے طالبین کو ہمیشہ تلقین و فہمائش فرماتے رہتے تھے۔

ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ آپ کی باطنی حالت کو آراستہ کرے اور باطنی احوال میں ترقی عنایت فرمائے۔ ہر بات میں اور ہر حال میں رضائے مولیٰ پر نظر رہے۔ اور نماز کی تحسین اور آراستگی کا پورا خیال رہے ..... نماز کی تحسین کے معنیٰ یہ ہیں کہ نماز کے سارے آداب مستحسن (طریقے سے ادا کئے جائیں) اور سنن کا لحاظ رکھا جائے ارکان کے ادا کرنے میں تعدیل ہو، رکوع وسجود کی تسبیحات تین تین سے زیادہ پڑھائی جائیں، مسنون وقت کا خیال رکھا جائے"

ایک دوسرے طالب کو تحریر فرمایا:۔

"نماز کو اپنی طرف سے پورے ظاہری و باطنی آداب اور خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کیجئے۔ جس قدر حاصل ہو

۱ے حضرت ابوہریرہؓ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: "اے فلاں تو نماز کو اچھا کیوں نہیں پڑھتا کیا نمازی جب نماز پڑھتا ہے۔ تو وہ یہ نہیں جانتا کہ نماز کیسے پڑھ رہا ہے (اسے خیال ہونا چاہیئے کہ) وہ اپنے نفس کے لئے نماز پڑھ رہا ہے (پس اسے تحسین نماز کا اہتمام کرنا چاہیئے) — کنز الاعمال بحوالہ مسلم ونسائی ص۱۱۲ ج ۴

اس پر شکر کیجئے۔ اور آئندہ کیلئے ہمت کیجئے اور دعا کیجئے اس کے حصول کا طریقہ جب آپ پوچھیں گے عرض کیا جائیگا ..... (نماز باجماعت کی پابندی پر) مبارک، اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائیں" .....

"قلب کی مشغولی (نماز میں) یہ سہواً واقع ہوتی ہے۔ نماز میں صرف نماز کے ارکان اور قرأت اور ادعیہ کی طرف توجہ رکھی جائے اور قرآن پاک کی تلاوت روزانہ کا معمول کیجئے تاکہ قرأت صحیح ہو"....

ایک خادم سے استفسار فرماتے ہیں:۔

"نماز کا کیا حال ہے۔ اسمیں یکسوئی اور خضوع وخشوع اور نماز میں جماعت کی پابندی اوقات مسنونہ کی پابندی اور اتباع سنت کا شوق کہاں تک ہے۔"

ایک سالک کو لکھتے ہیں:

"نماز میں اعتدالِ ارکان اور حضور قلب کی کوشش ہو۔۔۔ (اور نماز میں) یہ تصور (ہو) کہ بندہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے کھڑا ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے[1]۔ اس کا اثر یہ ہو کہ قلب میں سکون اور جسم میں پستی، اور تواضع کی شان پیدا ہو۔"

---

[1] کسی کا شعر ہے۔

نگاہ نیچی کئے کھڑا ہوں وہ سامنے میرے جلوہ گر ہیں
زبان میری کلام انکا، میں پڑھ رہا ہوں وہ سن رہے ہیں

نماز کے باطنی آداب
یا
حقیقت نماز

نماز کا ظاہر اپنی حقیقتِ باطنی سے جاندار، باوقار اور پر انوار بنتا ہے اس لئے نماز کے ظاہری جمال و تحسین کیلئے بھی اس کے باطنی کمال و تزئین کی ضرورت ہے۔ نماز کی باطنی حقیقت (روح) خضوع و خشوع، تبتل و تذلل، حضور و احسان، عبدیت و عبودیت، انکسار و افتقار، فروتنی و تواضع، مسکنت و الحاح، عاجزی و زاری وغیرہ احوال و کوائف جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات کے استحضار اور اسکی عظمت و جبروت، جلالت و کبریائی کے دھیان سے ناشی اور اس کی بارگاہ عالی میں حاضری کی ہیبت سے پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت والا اقدس روحہ ایک خادم (جس نے لکھا تھا کہ نماز میں احیاناً اسرار منکشف ہوجاتے ہیں۔ اور واردات صحیحہ کا نزول ہوتا ہے) کو تحریر فرماتے ہیں،

"نماز کشف اسرار اور واردات صحیحہ کا محل نہیں۔ یہ صرف عبودیت و عبدیت اور تواضع اور کیفیت کا محل ہے۔"

ایک اور مکتوب میں ہے :-

"اصل شئ نماز میں حضور اور خشوع ظاہری و باطنی ہے۔"

ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں :

"نماز کو اپنی طرف سے پورے ظاہری و باطنی آداب اور خضوع وخشوع کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کیجئے۔ جس قدر حاصل ہو اس پر شکر کیجئے اور آئندہ کیلئے ہمت کیجئے"

قرآن و حدیث کی نصوص نماز کی اس حقیقتِ (مذکورہ) کے حصول کی ترغیب سے مملو ہیں۔ (جیسا جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں اور گذشتہ اوراق میں کچھ نصوص گذر بھی چکے ہیں) تبرکاً چند احادیث نقل کرتا ہوں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

"نماز دو دو رکعت کر کے ہے۔ اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے تضرّع و زاری ہے، خشوع و خضوع ہے۔ اور عاجزی و مسکنت ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر اے رب اے رب کہنا ہے۔ جس نے ایسا نہ کیا اسکی نماز ناقص رہی۔"[1]

مسند احمد اور سنن بیہقی میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے :-

---

[1] کنز العمال ص۱۱۳ ج ۴ - عن فضل ابن عباس حاشیہ بحوالہ احمد، حکیم ترمذی، ابن جریر، کبیر طبرانی و نیز مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی ابن جریر سنن بیہقی عن المطلب ابن ابی وداعہ۔

ان المصلی یناجی ربہ — نمازی اپنے پروردگار سے راز و نیاز کی باتیں
فلینظر ما یناجیہ بہ[1] — کرتا ہے۔ پس اسے دیکھنا چاہیئے کہ وہ
کیا مناجات کرتا ہے۔ یعنی غفلت سے نماز نہیں پڑھنا چاہیئے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

"جس نے کامل وضو کیا پھر کھڑے ہو کر ایسی نماز پڑھی کہ وہ اس میں جو کہتا تھا۔ اسے جانتا (اور سمجھتا) بھی تھا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں اس نے نماز ختم کر لی۔ تو وہ ایسا پاک ہو جاتا ہے۔ جیسا اسکی ماں نے اسے جنا (کنز العمال ص ۱۱۲ ج ۴ بحوالہ عبد الرزاق عن عقبۃ بن عامر)

احمد، ابوداؤد، نسائی اور ابن حبان نے صحیح میں ابی ذرؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

"جب بندہ نماز میں ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک اسکی طرف متوجہ رہتا ہے۔ جب تک بندہ دوسری طرف التفات نہیں کرتا جب بندہ دوسری طرف دھیان کر لیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے اپنی توجہ کو ہٹا لیتے ہیں[2]۔"

امام بیہقی نے شعب الایمان میں ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے

"جب کبھی بندہ نماز میں ادھر ادھر دھیان کرتا ہے تو اسکا پروردگار اس سے کہتا ہے تو کدھر توجہ کر رہا ہے۔ اے

[1] کنز العمال ص ۱۱۳ ج ۴ [2] کنز العمال ص ۱۰۸ ج ۴

ابن آدم میں اس سے تیرے لئے بہتر ہوں جسکی طرف تو دھیان کر رہا ہے[1]

ایک حدیث میں ہے :-

لا صلوٰۃ للملتفت[2] :- نماز میں جو ادھر ادھر دھیان کرتا ہے۔ اس کی نماز کامل ہوتی ہی نہیں۔

دوسری حدیث میں ہے :

لا صلوٰۃ لمن لا یتخشع فی صلوٰتہ[3] — اس شخص کی نماز (کامل) نہیں ہوتی جو نماز میں خشوع نہیں کرتا۔

غرض نماز اپنے باطنی آداب و ارکان کے اہتمام و رعایت کے ساتھ کامل ہوتی ہے۔ ان باطنی اعمال کے بغیر نماز قالب بے روح اور گل بے رنگ و بو ہے کہ بقول حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ "حقیقتِ نماز مراقبہ حق است بوجہ تعظیم بدل و درکار برداشتن جمیع حواس و قویٰ و جوارح و اعضا"[4]

(نماز کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی تعظیم و عظمت سے دل کے ساتھ دھیان و مراقبہ اور تمام حواس و قویٰ اور جوارح و اعضا کا نماز میں ہمہ تن مشغول کرنا ہے

---

[1] کنز العمال ص۱۰۱ ج۴

[2،3] کنز العمال ص۱۰۸ ج۴ بحوالہ طبرانی معجم کبیر عن عبداللہ ابن سلام

[4] تفسیر فتح العزیز ص۲۷۸

نماز میں خشوع | ارشاد باری ہے :-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (المومنون-۱)

تحقیق فلاح پائی ان ایمان والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع (زاری وعاجزی) کرنے والے ہیں۔

علامہ الالوسی بغدادیؒ نے "الخشوع" کے معنٰی لکھے ہیں۔

التذلل مع خوف وسکون للجوارح (روح المعانی صفحہ ۲۰۸ ج: ۵)

خشوع (اللہ کے) خوف کیساتھ پستی و عاجزی اور جوارح کے سکون کو کہتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

"لغوی حقیقت خشوع کی سکون ہے۔ اور شرعی حقیقت، قلب و جوارح کا ارادی سکون، اور سکون مقابل ہوتا ہے۔ حرکت کے، تو جوارح کی حرکت کے مقابل میں ان کا سکون یہی ہے کہ جس حرکت کا شرعاً حکم نہیں وہ حرکت نہ کرے۔ یعنی ارادہ کرکے بیکار ہاتھ پاؤں نہ ہلائے، ادھر ادھر گردن یا نظر کو نہ پھیرے سر اوپر کو نہ اٹھاوے

۱ے حضرت علامہ تھانوی قدس سرہٗ بیان القرآن میں تحریر فرماتے ہیں :-

"خشوع کی حقیقت ہے سکون، یعنی قلب کا بھی کہ خیالات غیر کو قلب میں بالقصد حاضر نہ کرے۔ اور جوارح کا بھی کہ عبث حرکتیں نہ کرے اسکی فرضیت میں کلام ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ صحت صلاۃ کا موقوف علیہ نہیں اور اس مرتبہ میں فرض نہیں اور قبول صلوٰۃ کا موقوف علیہ ہے اور اس مرتبہ میں فرض ہے۔ مسائل سلوک میں لکھتے ہیں۔ یہ آیت صراحۃً دال ہے خشوع کے مطلوب ہونے پر اور روح میں ہے کہ حق یہ ہے کہ یہ صحتِ صلوٰۃ کی شرط نہیں مگر قبول کی شرط ہے۔

بدوں ضرورت نہ کھجلاوے نہ کھنکارے وغیرہ اور قلب کی حرکت فکر ہے۔ اس کا سکون عدم فکر ہے۔ یعنی اپنے ارادے سے کسی بات کو نہ سوچے، سو جیسے جوارح کی حرکت اگر بلا قصد مثلاً رعشہ سے کسی کی گردن ہلتی ہو تو وہ خشوع کے منافی نہیں پس غلطی لوگوں کی یہ ہے، کہ خشوع کے معنٰی یہ سمجھتے ہیں۔

اس بنا کا فاسد ہونا تقریر بالا سے معلوم ہوگیا۔ جس سے متعین ہوگیا کہ خشوع اختیاری فعل ہے۔ اور ہر شخص اس پر قادر ہے اور بہت آسان ہے۔ البتہ ارادہ و توجہ کی ضرورت ہے۔ جیسے سب ارادی افعال کی شان ہے۔ کہ ارادہ کرو تو آسان نہ کرو تو دشوار، حتّٰی کہ اگر منہ میں لقمہ لیکر بیٹھ جاؤ اور نگلنے کا ارادہ نہ کرو تو وہ بھی آسان نہیں۔ پس اگر لقمہ نگلنا آسان ہے تو خشوع بھی اتنا آسان ہے۔ اور سہل طریقہ یہ ہے کہ نماز میں جو کچھ منہ سے نکلے محض یاد سے نہ پڑھے بلکہ ہر ہر لفظ پر مستقل ارادہ کرکے اس کو منہ سے نکالے ..... اس مراقبہ کا اول سے آخر تک التزام رکھے۔ انشاء اللہ اول تو بلا قصد بھی کوئی خیال نہیں آوے گا۔ اور اگر فرضاً آجائے تو پھر سوچ میں نہ پڑے کہ ارے یہ تو پھر خطرات آنے لگے۔ یہ سوچ بھی غیر کا خیال ہے بلکہ رہی مذکورہ بالا طریقہ سے توجہ کی پھر تجدید کرلے تو یہ خطرات رفع ہوجائیں گے۔" (جامع المجددین صـ ۳۲۹ بحوالہ اصلاح القلوب صـ ۲۶)

حضرت تھانوی قدس روحہ کے اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوگئی کہ 'مطلوب خشوع' وہ ہے جس میں اعضاء وجوارح سے نماز کی مشروع حرکات کے علاوہ عملاً وارادۃً کوئی حرکت سرزد نہ ہو۔ اور نہ ہی ارادے سے قلب کوئی ایسی حرکتِ فکری کرے۔ جو 'نماز' کے ماموربہا اعمالِ قلبی و ظاہری کے خلاف ہو۔ گویا 'خشوع شرعی' اور 'سکون مطلوب' ارادی طور پر دل وجوارح کو نماز کے مشروع اعمال ہی میں مشغول رکھنا ہے۔

نماز میں وساوس | اس سے یہ بات بھی ضمناً ثابت ہوگئی کہ غیر ارادی وساوس وخیالات کا آنا نماز میں حارج نہیں نہ 'خشوع شرعی' کے خلاف ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک مبتدی طالب کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"وسوسے اگر بکثرت آتے ہیں اور عادت ہوگئی ہے۔ تو آپ وسوسوں کا خیال نہ کیجئے اور ادھر دھیان نہ کیجئے . . . نماز میں وسوسے دور کرنے کیلئے یہ کیجئے کہ نماز کے الفاظ ٹھہر ٹھہر کر ارادہ کے ساتھ پڑھیئے۔"

ایک خادم کو تحریر فرماتے ہیں:

"وساوس کا واقع ہونا مضر نہیں۔ چور وہیں آتے ہیں۔ جہاں دولت ہوتی ہے۔ شیطانی وساوس آنے کو بھی ایسا ہی سمجھا جاوے اور ان کی طرف سے ذہن کو پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف کرلیا جائے۔ عدم التفات ہی اس کا علاج ہے۔"

ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

"بیہودہ اور ناپاک خیالات کا پیدا ہونا اگر اپنی طرف سے نہیں تو انشاء اللہ مضر نہیں۔"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک سالک کو ارشاد فرمایا تھا:۔

"اللہ تعالیٰ نے قلب و دماغ کو ایسا ہی بنایا ہے کہ اس میں حرکت فطری ہوتی رہے۔ یہ شاہی شاہراہ ہے۔ آپ کون اس کا پہرہ بٹھانے والے کہ اس شاہی شاہراہ پر چوہڑے چمار نہ چلنے پائیں آپ اپنی راہ چلئے وہ اپنی راہ چلیں۔"

مراد یہ ہے کہ وساوس خود بخود آتے رہیں تو حرج نہیں۔ ان سے عدم التفات برتتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہنا چاہیئے وسوسے کے آنے کی قطعاً پرواہ نہ کیجائے کہ انکی طرف دھیان بھی غیر میں مشغولیت ہے اور یکسو ہو کر ہمت و ارادہ سے اللہ تعالیٰ اور نماز کی طرف دھیان جمانے کی کوشش کیجاوے۔ ہم کوشش کے مکلف ہیں۔ اگر کوشش کے باوجود وسوسے آئیں تو کوئی حرج نہیں تاہم یہ بات ذہن نشین رہے کہ وساوس کا آنا برا نہیں ارادے سے ان کا لانا اور جمانا برا ہے۔ فافہم

نماز میں یکسوئی

نماز میں چونکہ اعمال مختلف ہیں۔ اس لئے حضور و خشوع کی ایک عمومی کیفیت کے باوجود نماز میں یکساں 'یکسوئی' اور 'استغراق' کی کیفیت عموماً میسر نہیں آسکتی۔ اور نہ یہ مقصود محمود ہے۔ ہر رکن کی ایک خاص کیفیت 'تجلی' ہوتی ہے۔ جو اپنے 'خصوصی لون' سے قلب کو متاثر کرتی ہے اور

دل گوناگوں الٰہی تجلیات و الوان کا مورد بنا رہتا ہے۔ نماز کے علاوہ ذکر و مراقبہ وغیرہ کے اوقات میں طالب ایک ہی عمل میں مصروف ہوتا ہے۔ اس لئے دھیان و توجہ کی یکسوئی بعض حضرات کو ان اوقات میں نماز سے زیادہ محسوس ہوتی ہے اس قسم کے ایک استفسار کے جواب میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:-

"نماز میں اعمال مختلف ہوتے ہیں۔ جس سے وہ یکسوئی جس کو آپ یکسوئی سمجھتے ہیں نہیں ہوتی۔ کیا خدمتگار خدمات کے انجام دینے میں مالک کی محبت کی یکسوئی کا تصور کرتا ہے؟ مگر یہ خدمت خود ہی محبت کی دلیل ہے اور اطاعت کی فافہم
نماز سے فراغت کی حالت میں یکسوئی مستمر ہوکر محسوس ہوتی ہے مگر یہ کوئی چیز نہیں"

ایسے نماز کی یکسوئی کا حصول بھی ضروری نہیں۔ صرف اس کے حاصل کرنے کی کوشش لازمی ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:-

"یکسوئی ہونا ضروری نہیں۔ آپ کی طرف سے حصول میں کمی نہ ہو، پھر بھی اگر حاصل نہ ہو، تو انسان مکلف نہیں"

ایک سالک صادق نے نماز میں گاہے انتشار واقع ہونے کا گلہ کیا۔
حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے حکیمانہ و مشفقانہ انداز میں تحریر فرمایا

"ایسا بے شک ہوتا رہتا ہے۔ اگر ایسا پیش نہ آیا کرے تو خضوع و خشوع کی حقیقت کیوں کر ظاہر ہو اور اسکی قدر کیوں کر

ہو، ولضدہا تبین الاشیاء، صحت کی قدر علیل کو علالت ہی سے ہوسکتی ہے۔ شکم سیری کی قدر بھوک ہی سے ہوسکتی ہے حالت کی یکسانی میں شے کی قدر چلی جاتی ہے۔ اس لئے یہ تغیر احوال بھی اللہ کی نعمت ہے۔ اس پر شکر کیجئے۔ اور سمجھیئے۔ کہ یہ امور غیر اختیاریہ میں سے ہے۔ اللہ جل شانہٗ کی عطا ہے۔ جب وہ دے قبول کیجئے۔ نہ دے تو گلہ نہ کیجئے۔ اس پر جو غم ہوتا ہے وہ بھی ثواب کا موجب ہے ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود　　گرز باغِ دل خلالے کم بود

اس احساس کمی اور غم پر مبارک باد قبول کیجئے۔"

غرض مستمر اور یک کیف ولون، یکسوئی نماز میں حاصل نہیں ہوتی کہ نماز مختلف تجلیات کا محل ہے۔ اور ہر تجلی ہر رکن وفعل کے مناسب کیف وحضور کو پیدا کرتی ہے۔ گو اس گوناگوں کیفیت پر بھی ایک خاص لون کا کیف سرمدی چھایا رہتا ہے۔ جو عظمت وجلالتِ حق سے ناشی ہوتا ہے۔

نماز میں کیفیت حضوری اور اسکے اثرات

حقیقتِ نماز کی یافت اور اس کے جملہ باطنی آداب کا حصول اللہ جل جلالہ کی عظمت وجلالت کے تصور، کمال وجمال ربانی وصفات الٰہیہ کے دھیان اور اپنی محتاجی وافتقار بے کسی وبے چارگی کے استحضار ویقین سے نصیب ہوتا ہے۔ جب بندے پر کیفِ حضوری، چھاتا ہے اور اللہ تبارک تعالیٰ کی کبریائی وہیبت وجلال کی تجلی اس کے قلب پر ہوتی ہے۔ تو

وہ منقاد و پست ہو جاتا ہے اور اس پر خشوع و خضوع کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس میں تذلّل و مسکنت، عاجزی و فروتنی پیدا ہو جاتی ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفاتِ جمال و نوال اس میں تبتل و الحاح، ذوق و اشتیاق پیدا کر دیتی ہے۔ وہ جب اپنے پروردگار کو سراپا حمد و عطا، جود و سخا، ہمہ خوبی و محبوبی پاتا ہے تو 'اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ' اس کے دل کی صدا اور اسکی روح کی پکار بن جاتی ہے۔ 'عبدیت و عبودیت' کے جذبات زندہ ہو جاتے ہیں۔ غنی مطلق کے سامنے سرافگندگی اپنے عجز و فقر کا اعتراف اس کا حال ہو جاتا ہے۔ اور ہر ایک سے کٹ کر اسی ذات بے ہمتا میں مشغول ہو جاتا ہے۔ جس سے مناجات بے تاب روح کا قرار اور جس میں اشتغال بے چین دل کا سکون ہے۔ غرض کیفیتِ حضوری' یا 'حضورِ قلب' کی نعمت نماز کے جملہ باطنی فضائل و مزایا کی کلید ہے۔ جس پر کیفیت احسانی کا دروازہ کھل گیا۔ وہ احسان ربانی کے حصہ وافر سے بہرہ مند ہو گیا۔ نماز عبدیت کی جان کیفیتِ احسان ہے۔ حدیث جبرئیل میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل کے استفسار پر کہ احسان کیا ہے۔ ارشاد فرمایا تھا۔

اَن تعبد اللّٰہ کاَنّکَ تراہ	اللہ کی عبادت ایسی کرو کہ گویا تم اسے
فان لم تکن تراہ فانہ	دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگر تم اس کو
یراک (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم کتاب الایمان)	نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اس حدیث کو نقل فرما کر ایک سالک کو

ارقام فرماتے ہیں :

اب خواہ ہم بادشاہ کو دیکھ رہے ہیں۔ یا وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔ دونوں کا حاصل ایک ہے کہ ہم اپنی نماز کو پورے خضوع، آداب اور انہماک کے ساتھ ادا کریں۔ نماز کے الفاظ یا معنٰی پر نظر رہنے سے حضور ہو جاتا ہے۔ اور یوں سمجھئے کہ لفظ اللہ آپ کے قلب پر لکھا ہے۔ ادھر خیال جمائے رکھیئے" (تذکرہ صفحہ ۱۴۱)

'کیفیت احسانی' کا حصول حقیقتِ صلوٰۃ کی یافت کا مؤثر ذریعہ ہے اس لئے جس قدر رویتِ حق، سماعتِ حق، معیتِ حق، اطلاعِ حق کا یقین و استحضار ہوگا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ پر میرا ظاہر و باطن، جسم و روح، قلب و جوارح کلیتہً عیاں اور میرے دل کی نیتیں اور کیفیات اور اعضا کے اعمال و افعال کھُلے ہوئے اور نمایاں ہیں۔ حضور و احسان کی کیفیت میسر آکر نماز جاندار اور حقیقت والی بنے گی۔ اس لئے طالبین کو اپنی نماز کی تکمیل و تحسین کے لئے اولاً حضور اور دھیان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور یہ حضور و دھیان سالکین کے مدارج باطنی کے بقدر متفاوت ہوگی۔ اور اس کے حصول کیلئے اندرونِ صلوٰۃ و بیرونِ نماز میں مراقبۂ ربانی کی مشق کی ضرورت ہوگی۔

نماز میں حضور و احسان کے حصول کی ترکیب

اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت اس مشق و کوشش کے نتیجے پر عادتاً ہر شخص کو اس کے ظرف و استعداد و صلاحیت کے مناسب حضور عطا فرمادیتی ہے۔ حضرت والا قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں :۔

"نماز میں استحضار اور خشوع وخضوع کے حصول کیلئے کوشش چاہیئے۔ اور اُس کیلئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ معانی ادعیہ و سورۂ قرآنی جو پڑھے اُن پر نظر رہے۔ اور ہر لفظ ارادہ سے نکلے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بتوجہ کثرت ذکر کا اہتمام رہے اس سے انشاء اللہ تعالیٰ مطلوب حاصل ہوگا" (تذکرہ صـ ۲۹۴)

ایک سالک کو ارقام فرماتے ہیں؛

"ہر بات میں اور ہر حال میں رضائے مولا پر نظر رہے۔ اور نماز کی تحسین اور آراستگی کا پورا خیال رہے...... نماز کی تحسین کے معنیٰ یہ ہیں۔ کہ نماز کے سارے آداب مستحسن طریقے سے ادا ہوں۔ اور سنن کا لحاظ رکھا جائے۔ ارکان کے ادا کرنے میں تعدیل ہو۔ رکوع و سجود کی تسبیحات تین سے زیادہ بڑھائی جائیں۔ مسنون وقت کا خیال رکھا جائے۔ نماز میں اعتدال اور حضور قلب کی کوشش ہو۔

ہمارے حضرت (مولانا تھانویؒ) کی تحقیق یہ ہے کہ مبتدی نماز میں یکسوئی کیلئے لفظ کی طرف اور متوسط معنیٰ کی طرف اور منتہی ذات بحت کی طرف توجہ کرے"

ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں؛

"(بندہ کا نماز میں) یہ تصور (ہونا چاہیئے) کہ بندہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے کھڑا ہے۔ اور وہ اسکو دیکھ رہا ہے۔ اس

کا اثر یہ ہو۔ کہ قلب میں سکون اور جسم میں پستی اور تواضع کی شان پیدا ہو۔"

ایک طالب کو لکھتے ہیں:۔

"قلب کی (غیر میں) مشغولی کے سبب (نماز میں) یہ سہو واقع ہوتا ہے۔ نماز میں صرف نماز کے ارکان اور قرأت اور ادعیہ کی طرف توجہ رکھی جائے۔ اور قرآن پاک کی تلاوت روزانہ کا معمول کیجئے۔ تاکہ قرأت صحیح ہو۔"

ایک سالک کو تحریر فرمایا:۔

"حضور قلب کا حصول ذکر و شغل کی ترقی کے ساتھ ہوتا جائیگا۔ انشاء اللہ، قلب کو افکار سے خالی رکھنا چاہیئے۔ تاکہ اس میں نور الٰہی بھرے۔ (تذکرہ ص۱۶۳)

ایک مسترشد خاص نے استفسار فرمایا:۔

"اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ و رسولؐ کی باتیں کرنے اور سننے میں جو لطف آتا ہے۔ وہ نماز اور دیگر اعمال میں باقی نہیں رہتا"

حضرت الشیخ نور اللہ مرقدہ نے کیا حکیمانہ جواب مرحمت فرمایا:

"جی ہاں! اس گفتگو میں تھوڑا سا حظ نفس بھی شامل ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے دوسرا سنتا ہے۔ اور نماز و عبادت میں یہ صورت نہیں ہوتی مگر اہل دل جن کو نماز گویا عبد و معبود میں مکالمہ محسوس ہوتا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

"وجعلت قرة عینی فی الصلوٰۃ" میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز ہے (تذکرہ ۲۳۳)

انہیں کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"(تہجد کی نماز میں) دل میں تصور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ سے باتیں ہو رہی ہیں" (تذکرہ ۳۹)

ایک خادم کو ارقام فرماتے ہیں:

"اس (اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جاننے کے) مراقبہ سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا جو ایمان ہے وہ عملاً نمایاں ہو۔ اب آپ آگے بڑھیں۔ اب یہ کوشش کیجئے۔ کہ نمازوں میں یہ خیال قائم ہو کہ آپ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ اور وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ نیت کرتے وقت دل میں یہ توجہ کیجئے کہ بندہ اب بارگاہ الٰہی میں حاضر ہے۔ قرأت قرآن اور تسبیح رکوع و سجود میں ایک ایک لفظ پر ارادہ ہو اور سمجھ کر لفظ ادا ہو۔"

طلب حضوری[1] اور تحسین صلوٰۃ کی ان ہدایات پر جب طالب کاربند ہوتا ہے۔ تو بتوفیقہ تعالیٰ ہر ایک اپنی استعداد و محنت کے بقدر حقیقت صلوٰۃ اور اسکے آداب باطنی سے نواز دیا جاتا ہے۔ جب بندہ پر اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا حال چھاتا ہے تو نماز کی ہر حرکت کیفیت احسانی سے پر نور ہو جاتی ہے۔ اعمال صلوٰۃ اعتدال پر آجاتے ہیں خشوع و خضوع تذلل و ابتہال کی کیفیت خود بخود پیدا ہونے لگتی ہے۔ تکمیل نماز کا داعیہ پیدا ہو جاتا ہے اور نمازی ایک ایک رکن توجہ و دھیان سے سنوار سنوار کر ادا کرتا ہے۔ الفاظ کی ادائیگی عادۃً نہیں ہوتی بلکہ ہر لفظ معنی کو سمجھ کر ارادہ سے کرنے کا اہتمام ہونے لگتا ہے۔

---

[1] حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا شعر ہے۔ حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی
آ دل میں میرے چھپ جا، اے صورت جانانہ

رغبت و رہبت تبتّل و مناجاتِ رب کی کیفیت نصیب ہوجاتی ہے اور نمازی 'فراغِ قلبی' کے اس مقام پر فائز ہوجاتا ہے۔ جہاں 'مستورِ ازل' کی جلوہ سامانیوں میں کوئی حائل نہیں ہو پاتا۔ عبدیت و عبودیت 'مکالمہ و مناجاتِ' ربّانی کے اس مقام کو پالیتی ہے۔ جو 'مومن کا معراج' اور اس عالم میں قربِ حق کی غایت قصوئی ہے نماز کی حلاوت راحتِ جان اور سکونِ دل اور آنکھ کی ٹھنڈک بن جاتی ہے۔ سیّدی قدس سرہٗ فرماتے تھے:

"سجدہ میں ایسا لطف و مزا آتا ہے۔ گویا اماں کی گود میں سر رکھ دیا ہے۔"

حضرتؒ ارشاد فرماتے ہیں:

سجدہ میں جہاں سر ہے گویا وہ ترا در ہے کیا کیا نہ کہا تجھ سے پایا جو سراپا گوش
حاصل ہے تصور میں کیفیت معراج کیا کیا نہ مزہ پایا، پایا جو ہم آغوش
خوش نمی آید سجودِ بے حضور فی صلوٰۃٍ خاشعونم آرزوست

نماز میں تفاوتِ حضور

اقامتِ نماز کا موضوع یادِ الٰہی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ-۱)   اور قائم رکھ نماز کو واسطے میری یاد کے

اِسلیئے نماز کے جزو کل صورت و حقیقت میں اشتغال ' ذکر ' ہی ہوگا۔ اس لئے جو شخص متعلقات نماز اور اس کے مالہ وماعلیہ کی طرف متوجہ رہے گا۔ یہی سمجھا جائیگا۔ کہ اسے نماز میں حضور حاصل ہے۔ مثلاً مبتدی اگر الفاظ و ارکان کی طرف متوجہ رہتا ہے اور ان کے سنوارنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اسے نماز میں شاغل سمجھا جاتے گا اور کہا جائیگا کہ اسے اپنی استعداد کے بقدر نماز میں حضور میسر ہے۔ اسی طرح متوسط کا حضورِ صلوۃ ' ارکان کے اعتدال کے ساتھ معنیٰ کا دھیان ہے۔ اور منتہی کیلئے حضور ذات بحت اور صفات باری تعالیٰ کے استحضار قوی کے ساتھ ارکان کی تعدیل و تحسین ہے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ارقام فرماتے ہیں :

"ہمارے حضرت (مولانا تھانویؒ) کی تحقیق یہ ہے کہ مبتدی نماز میں یکسوئی کے لئے لفظ کی طرف متوسط معنی کیطرف اور منتہی ذات بحت کی طرف توجہ کرے"

احادیث سے بھی یہ متبادر ہوتا ہے کہ نماز کی طرف توجہ بھی کفایت کرتی ہے۔ چنانچہ حدیث کے لفظ ہیں :

ما من مسلم یتوضاء فیحسن	جو مسلمان اچھا وضو کرے پھر
وضوءہ ثم یقوم فیصلی	اٹھے اور دو رکعت نماز اسطرح
رکعتین یقبل علیھا بقلبہ	پڑھے کہ ان (دو رکعتوں یعنی نماز

و وجهه الا وجبت له الجنة کی طرف اپنے دل و دھیان سے متوجہ ہو تو (کنز العمال بحوالہ مسلم و ابوداؤد ج ۴ ص ۶۶ بروایت عقبہ ابن عامر) اسکے لئے جنت واجب ہوجاتی ہے۔

یقبل علیہما سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کے مالہ وماعلیہ میں مشغول ومتوجہ ہوگا۔ تو یہ بھی اس کے لئے کافی ہوگا کہ یہ حضور حق کا ہی بدل سمجھا جائے گا۔ گو جیسا کہ دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجہ نماز میں دھیان رب ہی ہے۔

نماز میں استحضار عطیہ الٰہی ہے جسکی طلب و کوشش ضروری ہے حصول و یافت لازم نہیں

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ "کیفیتِ حضوری، دیگر احوال و کیفیات کی طرح غیر اختیاری اور محض عطیہ الٰہی ہے۔ اسکی طلب و کوشش کا تو انسان مکلف ہے۔ لیکن اسکے حصول و یافت کا انسان مکلف نہیں۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کیا پر حکمت الفاظ میں اسکی تشریح فرماتے ہیں:-

نماز میں دل لگنا یا نہ لگنا اپنے اختیار کی بات نہیں۔ اور جو چیز بندہ کی اختیاری نہیں۔ وہ اس کا مامور بھی نہیں۔ بندہ پر اپنی طرف سے دل لگانے کی کوشش ہے، جو اختیاری ہے۔ جس طرح مریض کا کام دوا کا پینا ہے۔ جو اس کے اختیار میں ہے شفا کا حصول نہیں جو اس کے اختیار سے باہر ہے۔ نماز میں استحضار اور خشوع و خضوع کے حصول کیلئے کوشش چاہیئے۔ اور اس

کیلئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ معانیِ ادعیہ و سُوَرِ قرآنی جو پڑھے۔ ان پر نظر رہے۔ اور ہر لفظ ارادہ سے نکلے دوسری بات یہ ہے کہ بتوجہ کثرتِ ذکر کا اہتمام رہے۔ اس سے انشاء اللہ مطلوب حاصل ہوگا۔ یعنی یہ نسخہ ہے۔ جس سے شفا کی امید ہے مگر شفا کا ہوجانا یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار اور بخشش کی بات ہے۔ مگر جس طرح عادت الٰہی یہ جاری ہے۔ کہ عموماً صحیح نسخہ کے استعمال کے بعد شفا عنایت فرماتے ہیں ایسے ہی اس طریقہ سے نماز میں استحضار و خضوع بفضلہ حاصل ہوجاتا ہے، اور اگر کوشش کے بعد بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ محرومی انشاءاللہ مضر نہیں طمانیت رکھیں۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا " (تذکرہ ص۲۹۴)

بہرحال عادت الٰہی یہی ہے کہ طالب کو محروم نہیں فرماتے اور کوشش کرنے والے کو نواز ہی دیا کرتے ہیں ؎

تو مگر مارا بآں شاہ بار نیست　　با کریماں کارہا دشوار نیست
گر نشینی بر سر کوئے کسے　　عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

طلب و کوشش شرط ہے۔ عطائے رب بہانہ چاہتی ہے۔ جو سعی و اہتمام کرے گا پا ہی لے گا۔ تاہم اگر حکمتِ رحمانی میں یہ بات مقدر نہ ہو۔ تو طالب کو دلگیر نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ایسی حالت میں مجاہدہ کا مزید ثواب ہے۔

نماز میں لذت و سرور

نماز میں لذت و سرور مکالمۂ حق اور 'تصورِ حضوری' اور 'فرائض عبودیت' کی بجا آوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک حقیر و بے نوا انسان کی اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ قدس و جلال میں حاضری اور عرض نیاز کیف و سرور کا جو عالم اپنے میں رکھتا ہے۔ وہ 'عبدیت'[۱] کے امام سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ظاہر ہے

جعلت قرة عینی فی الصلوٰة — میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

(کنز العمال بحوالہ طبرانی فی معجم الکبیر ص۶۳ ج۴، کنز العمال بحوالہ ابوداؤد و سنن بیہقی ص۶۶ ج۴)

یا بلال اقم الصلوٰة ارحنا بہ — اے بلال نماز کو (اذان دیکر) قائم کرو اور اس سے مجھے راحت پہنچاؤ۔

(کنز العمال ص۶۴ ج۴ مسند احمد، ابوداؤد)

تاہم لذت و سرور مقصود بالذات نہیں، عطیہ الٰہی ہے جملہ غیر اختیاری امور کی طرح اگر حاصل ہو باعثِ تسلی و برکت اور محمود ہے۔ اور اگر

---

[۱] خاصانِ خدا کے ایک فرد فرید عثمان ہارون اپنی کیفیتِ عبدیت کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

بہر قتلم چو کشد تیغ نہم سر بسجود — او بنازے عجبے من بنیازے عجبے

حاصل نہ ہو۔ تو اس کے درپے نہیں ہونا چاہیئے کہ ثواب وقرب میں اصلاً اسے کوئی دخل نہیں۔

ایک سالک نے لکھا:۔

"تقریباً پندرہ روز سے نماز میں وہ سرور اور کیف نہیں جو اس سے پیشتر تھی (ملخصاً)

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواباً ارقام فرمایا:۔

"اس راہ میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اسکی کچھ فکر نہ کیجئے۔ یہ سرور ولذت ہمارے آپ کے اختیار کی چیز نہیں۔ اور جو امور اختیاری نہیں۔ ان کے درپے نہ ہویئے۔ ارتکاب معصیت، صحبت ناجنس اور غفلت نہ ہو۔ اس کا علاج استغفار کی کثرت ہے اور بہت نافع ہے۔

ایک طالب نے لکھا:۔

"تہجد میں پہلا سا مزا، گریہ اور دعا کی کیفیت نہیں۔ ایسے بحمداللہ پڑھ لیتا ہوں۔"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا:۔

"خوشی کی بات ہے کہ آپ تہجد پڑھتے ہیں۔ پہلے جو کبھی تہجد کا موقع ملتا تھا۔ اس وقت دعاء وگریہ جو ہوتا تھا وہ کبھی کبھی پڑھنے کی وجہ سے تھا۔ اب ملاومت سے پڑھنے پر جو وہ کیفیت روزانہ نہیں ہوتی تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

یہ ایسی ہی (بات) ہے کہ جس کو کبھی کبھی پلاؤ کھانے کو ملتا ہے۔ تو اس کو اس میں بہت مزہ ملتا ہے۔ لیکن جب وہی غذا کسی کو روزانہ ملنے لگے تو وہ مزا اس کو نہیں ملتا۔ مساوات ہوجاتی ہے۔ پھر گریہ سے تہجد کی مداومت ہزار درجہ بہتر ہے اور شکر کے قابل ہے۔

ایک سالک کو لکھتے ہیں:۔

"حصول لذت محمود ہے مگر مقصود نہیں۔ اس کے درپے نہ ہونا چاہیئے۔ وہ خود سے آئے گی...... سالک کو بڑا دھوکا ذوق وشوق ولذت کا ہوتا ہے۔ سو اس کو پوری طرح سمجھ لیجئے کہ یہ چیزیں آثار محمودہ ضرور ہیں مگر مقصود نہیں۔ ان کا منشاء اسی قدر ہے کہ کام میں جی لگتا ہے۔ اور آسانی ہوجاتی ہے۔ مگر اسکو قرب ورضا اور حصول ثواب میں کوئی دخل نہیں۔ کیونکہ یہ امور غیر اختیاریہ میں ہیں اور امورِ غیر اختیاریہ نہ مطلوب ہیں اور نہ مقصود، دوا کا اعلیٰ مقصود صحت بخشی ہے۔ خوش ذائقگی اور لذت نہیں۔ جب انسان کے بدن میں صحت آتی ہے تو طاقت اور کھانے کی لذت خود آجاتی ہے۔ اس کے لئے الگ دوا کی حاجت نہیں۔ نماز کو اپنی طرف سے پورے ظاہری و باطنی آداب اور خضوع وخشوع کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کیجئے۔ جس قدر حاصل ہے اس پر شکر کیجئے۔ اور آئندہ کیلئے

ہمت کیجئے اور دعا کیجئے۔"

ایک مسترشد کو جس نے لکھا تھا کہ:

"گاہے گاہے (نماز، عبادت وغیرہ میں) لذت محسوس ہونے پر فرحت ہوتی ہے"

حضرت والا رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا:۔

"یہ لذت و فرحت مبارک جو گو بالذات مقصود نہیں۔ لیکن محمود ہے۔ فالحمد للہ"

مولانا رومیؒ اور اسرارِ نماز

حضرت مولانا رومیؒ کی مثنوی، اسرار و رموز، معارف و حکم اسلامیہ کا سدا بہار اور عظیم الشان خزینہ ہے۔ نماز اور ارکان نماز کے بارے میں اپنے خاص رنگ میں دقوقی کے قصہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

پیش در شد آں دقوقی در نماز — قوم ہمچوں اطلس آمد او طراز
چونکہ با تکبیرہا مقرن شدند — ہمچو قرباں از جہاں بیروں شدند
معنی تکبیر انیست ای امیم — کہ خدا ایسے پیش تو ما قرباں شدیم
وقتِ ذبح اللہ اکبر می کنی — ہمچنیں در ذبح نفس کشتنی
تن چو اسماعیل و جاں ہمچوں خلیل — کرد جاں تکبیر بر جسم نبیل
گشت کشتہ تن ز شہوت ما و آز — شد بسم اللہ بسمل در نماز
چوں قیامت پیش حق صفہا زدہ — در حساب و در مناجات آمدہ
ایستادہ پیشِ یزداں اشک ریز — بر مثال راست خیزِ رستخیز

حق ہمیگوید چہ آوردی مرا — اندریں مہلت کہ دادم من ترا
عمر خود را چہ پایاں بردۂ — قوت و قوت درچہ فانی کردۂ
گوہر دیدہ کجا فرسودۂ — پنج حس را درکجا پالودۂ
چشم و گوش و ہوش و گوہر ہائے عرش — خرج کردی چہ خریدی تو ز فرش
ہمچنیں پیغام ہائے دردناک — صد ہزاراں آید از یزدانِ پاک
در قیام ایں گفتہا دارد رجوع — وز خجالت شد دوتا او در رکوع
قوت استادن از خجلت نماند — در رکوع از شرم تسبیحی بخواند
باز فرماں می رسد بردار سر — از رکوع و پاسخ حق بر شمر
سر برآرد از رکوع آں شرمسار — باز اندر او فتد آں خامکار
باز فرماں آیدش بردار سر — از سجود و دادہ از کردہ خبر
سر برآرد او دگر رد شرمسار — اندر افتد باز در رو ہمچو مار
باز گوید، سر برآرد بازگو — کہ بخواہم جست از تو مو بمو
قوتِ پا ایستادن نبودش — کہ خطاب ہیبتے بر جان زدش
پس نشیند قعدہ زاں بار گراں — حضرتش گوید، سخن گو با بیان
نعمتت دادم، بگو شکرت چہ بود — دادمت سرمایہ، ہیں بنمائے سود
چوں نہ سرمایہ بود او را نہ سود — شافعے خواہد کہ آرد عذر زود
رو بدستِ راست آرد در سلام — سوئے جانِ انبیاء و آں کرام
یعنی اے شاہاں شفاعت کایں لئیم — سخت در گل ماندش پا و گلیم
انبیاء گویند روزِ چارہ رفت — چارہ آنجا بود و دست افزار رفت
رو بگرداند بسوئے دستِ چپ — در تبار و خویش گویندش کہ خب

ہیں جوابِ خویش گریا کردگار ماکہ ایم اے خواجہ دست از مابدار

از ہمہ نومید شد مسکین کیا پس برآرد ہر دو دست اندر دعا

کز ہمہ نومید گشتیم اے خدا اول او آخر توئی د منتہا

درنماز ایں خوش اشارتہا بہ بیں

تا بدانی کایں بخواہد شد یقیں (مثنوی معنوی دفتر سوم ص۴۸۹، ۴۹۰ مطبوعہ ایران)

غرض نماز کو جب اس کے آداب کی رعایت سے ادا کیا جائے گا تو انشاء اللہ اس کے ثمرات عاجلہ و آجلہ مل کر رہیں گے۔ حدیث شریف ہے:-

الصلوٰۃ میزان فمن اوفی استوفی۔ نماز ترازو ہے جس نے پورا تولا اس کیلئے پورا تولا جائیگا

(کنز العمال ص۶۲ جلد۴ بحوالہ شعب الایمان للبیہقی)

نماز پر ان طویل مباحث سے نماز کی اہمیت وحکمت وحقیقت واضح ہے۔ حاصل صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حقیقت نماز سے حصہ عطا فرمائے اور وہ نماز میسر آئے جو معراج المومنین ہے۔ اور جس کے متعلق آتا ہے۔

ان فی الصلوٰۃ شغلا نمازیں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے

(کنز العمال ص۶۲ ج۴ بحوالہ سنن بیہقی، ابو داؤد، ابن ماجہ)

تلاوت قرآن

قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام، ہدایت ربانی کا آخری پیام الٰہی نوامیس و قوانین، اوامر و احکام کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب مبین حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ، خزینۂ معارف و حقائق، گنجینہ علوم و دقائق، سراپا ہدایت و رحمت، نور و برکت ہے۔ دلوں کی شفا و جلا، روحوں کی روشنی و پاکی، ذہنوں کی صفائی و تابناکی، عقلوں کی ہشیاری و تابندگی انسانوں کی رہنمائی و ترقی اسی ایک کتاب سے وابستہ اور قائم ہے یہی صحیفہ آسمانی تا قیام قیامت بنی آدم کے جملہ معاش و معاد کے مسائل و مہمات، مصالح و مفادات کا حامل وکفیل قیم و نگراں ہے۔ جملہ صحفِ الہیہ اور علوم انبیائی کا موجز و معجز، نگہبان، و مجموعہ یہی نوشتہ ہے

اسکی تلاوت مفتاحِ قلوب، سببِ انشراحِ صدور، باعثِ نزولِ برکات و ہدایت اور افزائشِ نور و سرور و تقویتِ ایمان و یقین ہے اس میں غور و تدبر معرفت ربانی کا ذریعہ، رضا و قرب حقانی کا وسیلہ

اور کاشف اسرار و حکم اور رموز و معارف ہے۔ اس پر عمل وصول الی اللہ کا واحد و اقرب طریقہ، انسانیت کی فوز و فلاح، نجات و کامیابی کا تنہا راستہ اور تہذیبِ قلوب و تطہیر نفوس کی کامل راہ ہے۔ حق یہ ہے کہ قرآن د قرآن، ہے۔ اور انسانی تعریف و ثنا سے بالا، اپنے حسن و جمال، کمال و یکتائی میں اپنی نظیر آپ ؎

خود ثنا گفتن زمن ترکِ ثنا است

زیں دلیل ہستی و ہستی خطا است[1]

قرآن کریم اپنی علوشان، گوناگوں فضائل و کمالات، جلالت و عظمت کی بنا پر اپنے سے کامل استفادہ اور ہدایت یابی کے لئے شرائط کو چاہتا ہے۔ خود قرآن کریم ان شرائط و آداب کا مختلف مقامات پر بیان فرما دیتا ہے۔ استقصا مقصود نہیں۔ تبرکاً و مثالاً چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱:۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۔ (ق۔ ۳)	اس میں اس شخص کیلئے بڑی عبرت ہے۔ جس کے پاس فہیم، دل ہو یا وہ کم از کم، دل سے متوجہ ہو کر بات کی طرف کان ہی لگا دیتا ہو۔

---

[1] عارف آلہ آبادی نے کہا ہے ؎

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اسپر کرد

پیش خدا داد کی حاجت کیا ہے

۱۲۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (اعراف۔ ۲۴)	اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو۔ اور چپکے رہو تاکہ تم رحم کئے جاؤ۔
۱۳۔ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف۔ ۲۴)	یہ دلیلیں ہیں۔ تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ان لوگوں کیلئے جو ایمان رکھتے ہیں۔
۱۴۔ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (ق۔۱)	جو ذریعہ ہے بینائی اور دانائی کا ہر رجوع ہونیوالے بندے کیلئے۔
۱۵۔ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ (المومن۔۲)	اور نہیں نصیحت پکڑتا مگر جو رجوع کرتا ہے۔
۱۶۔ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ .... وَلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ابراہیم۔۷)	یہ (قرآن) لوگوں کیلئے احکام کا پہنچانا ہے .... اور تاکہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کریں۔
۱۷۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران۔ ۱۴)	یہ بیان کافی ہے تمام لوگوں کے لئے اور ہدایت اور نصیحت ہے خاص خدا سے ڈرنیوالوں کیلئے۔
۱۸۔ هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یونس۔ ۶)	اور رہنمائی کرنے والی ہے۔ اور رحمت ہے (اور ذریعہ ثواب ہے) ایمان والوں کیلئے۔

۹۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ — یہ آیتیں ایک پر حکمت کتاب کی ہیں جو کہ ہدایت اور رحمت ہے نیک کاروں کے لئے

۱۰۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (زمر۔ ۳) — اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام نازل فرمایا ہے۔ جو ایسی کتاب ہے کہ باہم ملتی جلتی ہے۔ بار بار دہرائی گئی ہے۔ جس سے ان لوگوں کے جو کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں بدن کانپ اٹھتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور دل نرم (اور منقاد) ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

(یعنی ڈر کر اعمال جوارح و اعمال قلب کو انقیاد و توجہ سے بجا لاتے ہیں۔ تھانوی)

۱۱۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (انفال۔ ۱) — بس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں۔ اور جب اللہ کی آتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کر دیتی ہیں۔ اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں

۱۲۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد۔ ۳) — تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔

ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن فہمی اور اس سے اثر پذیری کے مختلف مدارج کے لئے کم از کم مندرجہ ذیل شرائط و اوصاف ضروری ہیں[1]

(۱)۔ ایمان و یقین ۲۔ کامل توجہ سے استماع قرآنی (۳) دل کا تیقظ و بیداری

۴۔ انابت ۵۔ حواس کی موجودگی اور حضور کی کیفیت ۶۔ عقل و فہم

۷۔ تقویٰ ۸۔ خشیت ۹۔ نیکوکاری ۱۰۔ تاثر و اثر پذیری ۱۱۔ تدبر و غور

قرآن کریم کی تلاوت و استماع میں جس قدر یہ صفات موجود ہوں گی۔ دل متاثر ہوگا۔ ہدایت کی راہیں کھلیں گی۔ احکام پر چلنا آسان ہوگا۔ قرآن کے انوار و برکات سے سینہ روشن ہوگا۔ حقائق و معارف قرآنیہ کا فیضان ہوگا قرآن کی تاثیر رگ و پے میں سرایت کرتی جائیگی اور ظاہر و باطن قرآنی اثرات کو قبول کر کے منقاد، اور اوامر قرآنی کا تابع ہو جائے گا۔ رفتہ رفتہ قرآن ہی ہمارے قلب کا نور، ہماری روح کی قوتِ متحرکہ، ہمارے اعمال کا کا اساسی نکتہ، ہمارے اخلاق کا مرکز اور ہماری زندگی کا محور بن جائیگا۔

قرأت و تلاوت اور استماع قرآنی کے حقوق کی ادائیگی ہیں

---

[1] یہاں قرآن کریم کے فہم کیلئے ان ظاہری شرائط سے بحث نہیں جن کا بدیہی ہونا ہر فہیم شخص کیلئے مسلمات میں ہے مثلاً (۱) عربی زبان و لغت اور اس کے متعلقہ جملہ علوم کا احتواء۔

(۲) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآنی مطالب و تفاسیر کا علم۔

۳۔ صحابہ و تابعین اور آئمہ تفسیر کے آراء علم وغیرہ

اصول تفسیر کی کتابوں میں ان کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ (اشرف)

قرآن کریم سے متخلق اور اعمال قرآنیہ سے منور بنا دے گی۔ کہ یہ نور مبین، جتنا سرایت کرتا جائیگا، ہمیں سراپا 'انوار' حق و باطل کے لئے امتیاز و 'فرقان' اور اپنی استعداد کے بقدر مجموعہ اعمال و اخلاقِ 'قرآن' بناتا چلا جائیگا بقول العارف الرومی

ہر چہ کاہ و جو خورد قربان شود — ہر کہ نور حق خورد فرقان شود (رومی)

اقبال نے 'مومن' کے متعلق اچھا کہا ہے

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا۔ کہ وہ کیسا تھا۔ آپ نے فرمایا:۔

کان خلقہ القرآن[1] — آپ کا اخلاق قرآن تھا۔

قرآن کریم کی فہم اور اس سے اثر پذیری کیلئے جن شرائط و اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر ایمان کے بعد دو صفات سے ناشی ہیں۔

(۱) اخلاص (۲) احسان

اخلاص تو جان عمل ہے۔ اور صفتِ احسان کا کمال انسان میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور دگر صفاتِ حسنہ کا دھیان و استحضار پیدا کرتا ہے۔ اس استحضارِ صفاتِ الٰہی سے انسان پر اللہ تعالیٰ کی ہیبت و کبریائی' محبت و خشیت چھا جاتی ہے۔ اور معرفت و عرفان رب کے دروازے

---

[1] الدر المنثور ص۲ ج ۵ بحوالہ البخاری فی الادب المفرد والنسائی وابن المنذر والحاکم وصحہ وابن مردویہ والبیہقی فی الدلائل

کشادہ ہوجاتے ہیں۔ جس کا منطقی لازمہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی عظمت و محبت ہے کہ نفسیات کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ متکلم کی عظمت کے بقدر اسکے کلام کی بڑائی و تاثیر ہوا کرتی ہے۔ پس متکلم ازل جلّ جلالہ وعمّ نوالہ کے کلام کی وقعت و قیمت بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی معرفت و عظمت اور اسکی صفات کی یافت و استحضار کے بقدر و مطابق ہوگی۔ غرض "صفت احسان" کی حقیقت جب سالک کا حال بن جاتی ہے۔ تو محبوب ازل کا کلام سرمدی اسکی روح کی غذا، اسکے دل کا چین، اسکی آنکھ کا نور بن جاتا ہے۔ اور یہ نور الٰہی بندہ کے رگ و پے کو اپنی تاثیر سے روشن و جاندار کر دیتا ہے۔ قلب و روح کو کلام الٰہی کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہوجاتی ہے۔ اسکی تلاوت و فہم اس میں تدبّر و غور، دل و دماغ کا وظیفہ بن جاتا ہے۔ اور اعضاء و جوارح اس پر عمل کیلئے منقاد و تابع ہوجاتے ہیں۔ تلاوت و استماع قرآنی میں کامل توجہ، دل کا تیقظ و بیداری حواس کا اجتماع، تدبر و تفکیر، انابت و خشیت اور دگر صفات مطلوبہ لازماً وجود میں آنے لگتی ہیں۔ اور صفت احسان اور استحضار صفات ربّانی کے گہراؤ اور گیراؤ کے مطابق ان صفات میں عمق و وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے[۱]

---

[۱] قرآن کریم کی متعدد سورتوں کی ابتدا اللہ تبارک و تعالیٰ کی مختلف صفات کے تذکرہ سے ہوتی ہے۔ شاید صفات کا تذکرہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور منزلِ قرآن کی استحضار صفات کی تازگی و قوت کیلئے ہو دیکھئے سورہ الزمر، المومن، حٰمٓ السجدہ الشوریٰ۔ الجاثیہ، الاحقاف وغیرہ۔

غرض جس طرح ہر عمل میں جان اخلاص و احسان، سے پڑتی ہے اسی طرح قرآن کریم کے برکات و انوار، تاثیر و ہدایت کا کمال بھی اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب اخلاص و احسان کی کیفیت کے ساتھ تلاوت کی جائے۔ تلاوت کے وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کے قرب و حضور کا دھیان اس طرح چھایا ہو کہ انہیں انکی جملہ صفات کے استحضار کے ساتھ حاضر و ناظر سمجھا جا رہا ہو اور ان کا کلام ان ہی کو سنایا جا رہا ہو۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:۔

"قرآن شریف کی تلاوت اس سکون[1] اور استحضار سے کی جائے (کہ) اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں۔ اور آپ ان کو سنا رہے ہیں۔"

ایک صاحب کو تحریر فرماتے ہیں؛

"قرآن پاک اس تصور سے پڑھیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہماری تلاوت کو سن رہے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اسکو سماعت فرما رہے ہیں تو ہم کو کس ذوق و شوق سے پڑھنا چاہیئے۔ اگر یہ تصور ہو کہ ہمارا محبوب ہماری فریاد کو پاس کھڑا اپنے کانوں سے سن رہا ہے تو اس فریاد کی لے کیسی پر لذت ہوگی ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا میرے لئے انعام ہے
آپ خود سنتے ہیں آکر جو میرا پیغام ہے

---

[1] یہ بات ذہن میں رہے کہ "سکون" قلب و جوارح ہی خشوع کی شرعی حقیقت ہے جس پر نماز کے سلسلے میں گفتگو ہو چکی ہے۔

کلام اللہ اپنی تاثیر میں خارجی عوامل کا محتاج نہیں۔ محض اسکی تلاوت کا بھی حق اگر ادا کردیا جائے تو دلوں کی زندگی بدل جاتی ہے۔ اس لئے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ سالکین کے لئے روزانہ کی تلاوت (جس قدر ہوسکے) ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ مختلف طالبین کے مکتوبات میں اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں:۔

"حصول ثواب کیلئے تلاوت روزانہ کی عادت الگ ڈالیئے اور یہ (باترجمہ قرآن کا) مطالعہ بھی جاری رکھیں۔"

"یہ (تلاوت قرآن کا مشغلہ) بھی ضروری ہے۔ جو مقدار طے کرلی جائے"

"ان (مختلف) سورتوں کی اس طرح تلاوت سے بہتر یہ ہے۔ کہ روزانہ نماز صبح کے بعد ایک پارہ قرآن پاک بہ ترتیب پڑھیں۔"

"قرآن پاک کی تلاوت روزانہ کا معمول کیجئے۔"

"قرآن پاک روزانہ پڑھیں.... یہ بھی ضروری ہے مقدار جو طے کرلی جائے[1]

باترجمہ و باتفسیر قرآن کی غور و فکر کے ساتھ تلاوت کی بھی تلقین فرماتے

---

[1] حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سیر افغانستان میں علامہ اقبالؒ کا تلاوت کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ تلاوت کی مناسبت سے اسے نقل کرتا ہوں۔ تحریر فرماتے ہیں:

"اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی طالب علمی کے عہد کے ایک قصہ کے اثنا میں اپنے والد مرحوم کا ایک ایسا فقرہ سنایا جس نے میرے دل پر بجید اثر کیا، فرمایا کہ اپنے وطن سیالکوٹ میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ ایک صبح کہ نماز کے بعد حسب دستور میں تلاوت میں مصروف تھا۔ کہ والد مرحوم ادھر آئے اور

تھے۔ اکثر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر بیان القرآن اور بدید طبقہ کو حضرت مولانا عثمانیؒ کے حواشی پڑھنے کیلئے ارشاد فرماتے تھے۔

ایک طالب کو لکھتے ہیں:۔

(تلاوت مع ترجمہ) بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائیں۔ نیت عمل کی ہو۔

ایک دوسرے صاحب کو ارقام فرمایا:

"کیا باترجمہ تلاوت آپ نہیں کر سکتے۔ یہ موثر ہوگا"

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

دریافت کیا کہ کیا کرتے ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کرتا ہوں۔ فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح اترا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اقدس پر نازل ہوا تھا تلاوت کا مزہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ جب بی۔اے پاس کرلو گے تو بتاؤں گا۔ کچھ دنوں کے بعد جب انہوں نے بی۔اے پاس کرلیا تو اس خوشخبری کے معاوضہ میں اس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر اس مقام کے حصول کی تدبیر پوچھی۔ مرحوم نے ان کو کچھ طریقے اور دعائیں تلقین کیں اور نوجوان بیٹے سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان وقلم سے ملت محمدی کی خدمت بجالاتا رہیگا۔" (سیر افغانستان ص۱۷۹)

اقبال کا ایک شعر بھی اس مضمون کا ہے۔

تیرے ضمیر پہ جبتک نہ ہو نزولِ کتاب　　گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

دُعاء

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے جن انعامات خاصہ سے انسان کو نوازا ہے۔ ان میں ایک دعاء بھی ہے۔ دعاء ایمان کا نشان، تعلق الٰہی کی دلیل، مغزِ عبادت، حقیقت عبودیت، جانِ بندگی، روحِ فقر اور رونقِ درویشی ہے۔ دعاء بندہ و ربّ کا رابطہ قویہ، مومن کا اسلحہ، بے تاب روح کی غذا، جانِ حزیں کا اقرار، زخمی دل کا مرہم، اور سوختہ سامان عشاق کی نامرادیوں کا مداوا ہے۔ دعاء فقراء کا خزانہ، مسکینوں کا توشہ، ناداروں کی ڈھارس، لاچاروں کی تسکین، بے نواؤں کی تسلی، ضعیفوں کی قوت، راہ حق کے طلب گاروں کی ڈھال اور سالکین طریق کا زاد راہ ہے۔ دعاء کا تشغف واشتغال، اس میں الحاح وزاری، تضرع وخشوع اور ابتہال وتبتل، توحید وللہیت اور صفات الٰہیہ پر ایمان کامل اور یقین راسخ کا نتیجہ ہے۔ دعاء جامع الاسباب، ام الذرائع، کلید خیر اور مطلب براری کی احسن واکمل تدبیر ہے۔ دعاء دارین کی حاجات و ضروریات کے انجاح وحصول کا اقویٰ واجمل سبب ہے۔ دعاء درماندہ

بندہ کی اپنے رحیم وکریم آقا کے دربار میں مناجات، پکار و عرضداشت ہے۔ جس کا ہر بول بندہ اور آقا کے تعلق کو قوی سے قوی تر کرتا ہے ایک فقیر بے نوا کا سرمایہ ہی دعاء اور قوتِ دعاء ہے کہ فقراء[1] کی حقیقت ہی 'الحمید' میں سب کچھ دیکھ کر اپنی بے مائیگی، ہیچ در ہیچ ہونے کا یقین رکھتے ہوئے دعاء و رضا، تفویض و تسلیم، عبدیت و عبودیت کے وظیفہ میں اپنی زندگی گذار دیتا ہے۔ محبوب ازل کا محبِ صادق اور حمید مطلق کا طالبِ حقیقی ہر آن قلباً و حالاً اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز اس کے ساتھ مناجات و دعاء میں مشغول رہتا ہے۔ اس لئے فخر الفقراء و سید الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جزو کل دعاء و مناجات سے مملو ملتا ہے، کہ جس قدر حقیقتِ فقر و عبدیت میسر آئے گی۔ انسان میں تبتل اور التجاء الی اللہ اور احتیاج کی کیفیت بڑھتی جائیگی۔ صحیفہ اسلامی دعاء کی عظمت و برکت پر دال اور قصصِ انبیاء اجابتِ دعاء پر ناطق اور اسوۂ نبویہ اور احادیثِ مبارکہ دعاء کے فضائل و اہمیت پر شاہد ہیں

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[1] دیکھو آیت کریمہ:- يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (فاطر-۳)

(اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تعالیٰ ہی اکیلا بے نیاز اور سراپا ستائش ہے)

١١۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ
اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ
یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ
سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ
(المومن۔ ٦)

[illegible] پروردگار نے دعا کرو مجھ سے
قبول کروں گا۔ واسطے تمہارے تحقیق
وہ لوگ کہ تکبر کرتے ہیں عبادت
میری سے شتاب داخل ہوں گے
دوزخ میں ذلیل ہو کر۔

دوسری آیت ہے

١٢۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ
فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ
وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْ
شُدُوْنَ
(البقرہ۔ ٢)

اور جب آپ سے میرے بندے
میرے متعلق دریافت کریں تو آپ
میری طرف سے فرما دیجئے میں قریب ہوں
اور پکارنے والے کی پکار (دعا) کو قبول
کر لیتا ہوں جب وہ مجھ کو پکارتا ہے
پس ان کو چاہیئے کہ میرے احکام کو قبول
کیا کریں۔ اور مجھ پر یقین رکھیں۔ امید ہے کہ
وہ لوگ رشد (فلاح) حاصل کر سکیں گے۔

حضرت صالح علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

١٣۔ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ
(ہود۔ ٦)

تحقیق میرا پروردگار نزدیک ہے
دعا قبول کرنے والا۔

١٤۔ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ
بیشک میرا رب سنتا ہے دعا (کو)

پہلی آیت مبارکہ میں دُعا کو عبادت کے مرادف قرار دیا ہے

حدیث شریف میں بھی ارشادِ نبوی ہے۔

الدعاء هو العبادة　　دعا ہی عبادت ہے

پھر آپ نے تائید میں محولہ بالا آیت پڑھی (جمع الفوائد ص ۶۱۵ ج ۲، بحوالہ ابوداؤد والترمذی)

دوسری روایت میں ہے

الدعاء مخ العبادة　　دعاء عبادت کا مغز ہے۔

(جمع الفوائد ص ۶۱۵ ج ۲، بحوالہ ترمذی)

دوسری مرفوع روایات میں ہے:۔

"اللہ کے نزدیک دعاء سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز معزز نہیں"۔ جس کے لئے دعاء کے دروازے کھل گئے۔ اس کیلئے رحمت کے دروازے کھل گئے ...... دعاء نازل شدہ (مصائب) میں اور جو ابھی نازل نہ ہوتے ہوں سب میں فائدہ دیتی ہے۔ قضا کو صرف دعاء ہٹا دیتی ہے۔ پس دعاء کو لازم پکڑو" (جمع الفوائد ص ۶۱۵ ج ۲، بحوالہ ترمذی)

شیخ الکل حضرت تھانوی قدس سرہ دعاء کے بارے میں "مناجات مقبول[1]" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کو ہر قسم کے صلاح و فلاح کی

---

[1] مسنون دعاؤں کے بے شمار مجموعے قدیم زمانے سے مرتب ہوتے رہے ہیں جن میں اب تک کئی مروج ہیں۔ اور برصغیر ہند و پاک میں الحصن الحصین الجزری اور حزب الاعظم ملا علی قاریؒ کو مقبولیت عام نصیب رہی ہے۔ حضرت تھانویؒ کا یہ مجموعہ متداول کتابوں میں سب سے مؤخر ہے لیکن حسن ترتیب و جامعیت و ایجاز میں اپنی نظیر آپ ہے ۱۲

ضرورت نہ ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دارین کے صلاح و فلاح کے واسطے اسباب متکثرہ و ابواب متعددہ موضوع فرما دیئے کہ اہلِ حاجت ان سے مدد لیں۔ اور عقبات و مہالک سے نجات پائیں۔ ان اسباب مذکورہ میں بجز دعاء کے جتنے اسباب ہیں۔ ان کے مسببات خاص خاص امور ہیں۔ چنانچہ اسباب طبیعہ کا (مثل زراعت و تجارت و طبابت کے) اصلی مقصود فلاح دنیوی بنایا گیا ہے۔ گو بواسطہ معین دین بھی ہو۔ اور اسباب شرعیہ کا (مثل صوم و صلوٰۃ و حج کے) مقصود بالذات فلاح دینی ٹھہرایا گیا ہے۔ گو بالعرض نافع دنیا بھی ہو۔ مگر صرف دعاء ایک ایسی چیز ہے۔ کہ فلاح دین و فلاح دنیا دونوں کے لئے بالمساواۃ ایک مرتبہ میں مشروع و موضوع ہے۔ جس سے بوجہ اس جامعیت کے اسکی وقعت و عظمت ظاہر و باہر ہے اس لئے قرآن مجید و حدیث شریف میں نہایت درجہ اسکی ترغیب و فضیلت اور تاکید جا بجا وارد ہے ۔۔۔۔ (ان احادیث) سے معلوم ہوا کہ دعاء تمام تر تدبیروں اور احتیاطوں سے بڑھ کر مفید ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قبل مصیبت بھی دعاء کرتا رہے۔ اسکی برکت سے مصیبت نہیں آتی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی قبولیت کی یہ بھی شکل ہوتی ہے کہ اسکی وجہ سے کوئی

بقیہ حاشیہ:۔ وللناس فیما یعشقون مذاہب
اس کا مقدمہ فوائد متعددہ پر مشتمل ہے۔ اس لئے نقل کرتا ہوں

بلاٹل جاتی ہے۔ پس دعاء کر کے خواہ قبول ہونا معلوم ہو یا نہ ہو بدگمان نہ ہونا چاہیئے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

" اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعاء سے زیادہ کوئی چیز قدر و منزلت کی نہیں۔" ___ اور ارشاد فرمایا:

" جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ سختیوں کے وقت اسکی دعاء قبول فرمالیا کریں۔ اس کو چاہیئے کہ خوش عیشی کے وقت کثرت سے دعاء مانگا کرے۔"

اس سے معلوم ہُوا کہ بلا مصیبت کے دعاء مانگنے کا اثر مصیبت کے وقت مانگنے میں ہوتا ہے۔ اور ارشاد فرمایا کہ:۔

" دعاء میں ہمت نہ ہارو۔ کیونکہ دعا کرتے ہوئے کوئی ضائع نہیں ہوتا" ___ اور ارشاد فرمایا:

" کہ دعاء مسلمان کا ہتھیار ہے۔ اور دین کا ستون ہے۔ اور آسمان اور زمین کا نور ہے۔"

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بلا زدہ قوم پر گذر ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

" یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے عافیت کیوں نہیں مانگتے۔"

اور فرمایا: ___ " کہ کوئی ایسا مسلمان نہیں جو دعاء میں اڑ جائے اور پھر اس کو عطا نہ ہو۔ خواہ سر دست اس کو دے دیں یا آئندہ کے لیئے جمع کر دیں۔"

اس سے معلوم ہوا۔ کہ دعاء قبول تو ضرور ہوتی ہے۔ مگر صورتیں اسکی مختلف ہیں۔ کبھی وہی چیز مل جاتی ہے۔ اور کبھی اس کے لئے جمع ہو جاتا ہے۔ اور اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ کہ کبھی اسکی برکت سے بلاٹل جاتی ہے۔ غرض اس دربار میں ہاتھ پسارنے سے کچھ نہ کچھ مل کر رہتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے دیکھا جاتا ہے کہ اکثر لوگوں کو عوام تو کیا بہت سے خواص کو بھی اس سے محض بے رغبتی و بے توجہی ہے۔ حتیٰ کہ جو معمولی اوقات دعاء کے ہیں۔ جیسے نماز پنجگانہ ان میں بجز آموختہ سا پڑھ لینے کے اصلا الحاح یا دلچسپی کا اثر تک نہیں پایا جاتا۔ اور یہ سمجھ کر دعا کرنے کا تو ذکر ہی کیا، کہ یہ عرضداشت اللہ تعالیٰ کی جناب پاک میں پیش کر دینا اور بار بار التجا کرنا اپنی مطلب برآری کا قوی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اور تکرار عرض و معروض سے روزانہ امیدیں ابھرتی اور تازہ ہوتی ہیں۔ اگر کوئی بڑی ہی مصیبت پڑتی ہے اور ہاتھ پاؤں مارنے سے کام نہیں چلتا تب بمجبوری کسی ایک آدھ کو شاذ و نادر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے وہ بھی دعاء کے ساتھ نہیں بلکہ بڑی دوڑ یہ ہوتی ہے، کہ کوئی وظیفہ، عمل عزیمت شروع کر دیا۔ خواہ شرع کے موافق ہو یا مخالف اور اگر کسی نے بڑی احتیاط کی اور موافقت شرع کا بھی لحاظ کر لیا تب بھی ان اعمال میں وہ برکت کہاں جو اللہ و

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمودہ دعاؤں میں ہے۔ غرض متقدمہ دعاء میں چند کوتاہیاں واقع ہو رہی ہیں۔

اول :۔ "بدون آڑے وقت کی دعاء کی طرف توجہ نہ ہونا"۔

دوم :۔ "ایسے وقت میں بھی اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی ہوئی دعائیں چھوڑ کر نئے نئے وظائف پڑھنا"

سوم :۔ "بدشوقی و بے رغبتی سے دعا کرنا اور جی نہ لگانا۔"

چہارم :۔ "قبولیت کا یقین اور امنگ نہ ہونا۔"

پنجم :۔ "جلدی اور تقاضا مچانا اور ذرا توقف ہو جائے تو تنگ ہو کر چھوڑ دینا"۔۔۔۔

ان کوتاہیوں کے تدارک کرنے کیلئے بمقتضائے مصلحت و ضرورتِ وقت مناسب معلوم ہوا۔ کہ جو جامع دعائیں قرآن و حدیث میں وارد ہیں ان کو جمع کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کو دوسری دعاؤں پر بچند وجوہ ترجیح ہے۔

اوّل یہ کہ جب خود حاکم مضمون عرضی کا بتلا دیتا ہے۔ تو اسکی منظوری میں پھر کوئی تردد نہیں رہتا۔ اس طرح جو دعائیں اللہ تعالیٰ نے بواسطہ وحی جلی یا خفی خود تعلیم فرمائیں تو بلاشک اقرب الی الاجابتہ ہیں۔

دوسرے ان میں جس قدر دینی و دنیوی ضرورتوں کی رعایت کی گئی ہے۔ اگر ہم لوگ قیامت تک بھی سوچیں تو ممکن نہیں کہ ایسے جامع مضامین تجویز کر سکیں۔

تیسرے بعض اوقات مضمون دعاء میں سوءِ ادب ہوجاتا ہے جس سے وہ اُلٹی وبالِ جان ہوجاتی ہے......

غرض اپنی رائے اور قیاس سے مضمون معین کرنے سے اس قسم کا احتمال اس میں رہتا ہے۔ اور جو دعائیں منصوص ہیں وہ ان خدشات سے منزّہ ومبرّا ہیں اور..... افضل واکمل طریقہ یہی ہے کہ وہ دعائیں بعینہٖ انہی الفاظ سے پڑھی جائیں جس طرح منقول ہیں۔"

ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے شیخ عالی مقام حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مرتب کردہ مجموعۂ ادعیہ "مناجات مقبول کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اور طالبین کو تلاوت کے بعد اس کے پڑھنے کی پیہم تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ مختلف طالبین کو مکتوبات میں اس قسم کی عبارات ارقام فرمائی ہیں۔

"تلاوت کریں، اور مناجات مقبول کا ایک حزب روزانہ پڑھیں"

"مناجات مقبول کی ایک منزل پڑھ لینا مناسب ہے بالکل اسی طرح (یعنی جیسے کتاب میں ہے) پڑھیں۔ ساتھ ہی ساتھ ترجمہ بھی پڑھ لیں"

"قرآن پاک کی تلاوت کے بعد مناجات مقبول روزانہ پڑھیں۔"

"دن میں کسی وقت ہوسکے تو قرآن پاک کی تلاوت اور دعاء مناجات مقبول پڑھا کریں"....

"بہت مبارک مناجات مقبول پڑھتے رہیں۔"

"معمولات نماز وتلاوت و دعاء (مناجات مقبول) میں سستی نہ کریں۔"

حضرت سیّدی قدس سرہٗ دعاء کے آداب، الحاح وزاری، تضرع و ابتہال، خضوع وخشوع کی رعایت اور اجابت کے یقین کے ساتھ دعاء مانگنے کی تاکید فرماتے تھے۔ ایک طالب کو لکھتے ہیں۔

"گو ایک مسلمان بھائی کی دعاء دوسرے مسلمان بھائی کے حق میں مستجاب ہے۔ مگر مناسب یہ ہے کہ ضرورتمند خود پورے خضوع وخشوع سے درگاہ الٰہی میں متوجہ ہوکر دعا مانگیں۔ ہوسکے تو تہجد کے بعد دعاء مانگی جاتے۔ آپ ملازمت کے امتحان کیلئے جو دعاء کرانا چاہتے ہیں۔ اس کے متعلق دل میں یہ نیت کیجئے کہ طلب رزق کا جو حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اس کی تعمیل میں یہ کوشش کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ دعاء کامیاب ہوگی۔ خواہ بعینہٖ ہو یا بمثلہٖ ہو، اور ہر ایک پر بخوشی رضامند رہنا چاہیئے"

انہی کو دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:۔

اچھی کامیابی کیلئے بدل بدرگاہ الٰہی میں دعاء ہے۔ اگر قبول ہو تو شکر کیجئے اپنے پروردگار کا۔ اور اگر خدانخواستہ نہ ہو، تو ہمت نہ ہاریئے صبر کیجئے۔ غرض دونوں حالتوں میں بندہ خدا تعالیٰ ہی سے لگا رہے۔ ماں مارتی بھی ہے تو بچہ ماں ہی کی گود سے چمٹا رہتا ہے۔"

"آپ کی کامیابی کی بدل دعاء ہے۔ لیکن دعاء کی مقبولیت کے یہ معنٰی نہیں کہ مطلوبہ چیز بعینہٖ مل جاتے۔ کیا عجب کہ جس

کو ہم خیر سمجھ کر مانگتے ہوں۔ عالم الغیب کی نگاہ پاک میں وہ ہمارے لئے خیر نہو۔ اس لئے دلگیر نہوں، اور ہر حال میں امیدوار رہیں۔ بندہ کو یہی سمجھنا چاہیئے کہ اس کے ہاتھ میں صرف کوشش ہے نتیجہ اس کے ہاتھ میں نہیں۔ تیمار دار اور طبیب دوا تجویز کرنے اور پلانے کے ذمہ دار ہیں دواؤں کا مؤثر ہونا یا بنا دینا نہ طبیب کے اختیار امکان میں ہے اور نہ تیمار دار کے۔ یہ صرف قادرِ مطلق اور شافی حقیقی کے ہاتھ میں ہے۔ جبر و اختیار کے مسئلہ کیلئے آپ سیرت جلد چہارم میں اس مسئلہ کا باب پڑھیں۔"

ایک سالک کو تحریر فرماتے ہیں:

"اَللّٰھُمَّ اغننی عمن سِواکَ و ارزقنی عندک" نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر خضوع و خشوع کے ساتھ دعاء میں کہا کریں۔ اور بار بار کہا کریں۔" ایک مسترشد کو لکھا:

"تہجد کی نماز کے بعد درد کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں ہر شب بالحاح تام اپنے لئے دعا کیجئے۔ دعاء میں خضوع ہونا چاہیئے عصر اور صبح کی نمازوں کے بعد بھی دعاء خوب کیجئے اور مانگئے۔ جو آپکے مناسب ہوگا۔ انشاء اللہ ملے گا۔ اس در سے کوئی محروم نہیں ہوا ہے۔ "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ" اس کا اعلان عام ہے۔

انہیں دوسرے مکتوبات میں ارشاد فرماتے ہیں:

"جو کچھ ملتا ہے اس کو لیجئے۔ اور اس پر منعم حقیقی کا شکر ادا کیجئے۔ اور جو نہیں ملا ہے۔ اسکی طلب دعاء سے کیجے یہ

دعاء بھی خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی کڑی ہے ۔"

"...... طمانیت قلب اور دماغی سکون کے عدم حصول کا باعث تو کوئی دینی یا دنیاوی فکر ہو گی۔ اگر دینی فکر ہے تو مبارک اور اگر دنیاوی فکر ہے تو اس فکر کا حاصل کیا ہے۔

کار ساز ما بساز کار ما   فکر ما در کار ما آزار ما

جو حاصل ہے۔ اس پر شکر کیجئے۔ تاکہ بموجب "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ" اور زیادہ عطا ہو۔"

"...... طبعی پریشانی بجا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اضطرار کیساتھ دعا کریں ...... میں بھی دعا کرتا ہوں۔

ایک طالب کو تحریر فرمایا؛

"جو حاجت اور ضرورت پیش آئے اس کیلئے آپ اللہ پاک سے دعاء مانگا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام بے شبہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن بندہ کی سمجھ میں اس حکمت کا آجانا ضروری نہیں۔ مگر یقین رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ کام بندہ ہی کے فائدہ کیلئے ہے"

ایک دوسرے طالب کو تحریر فرمایا؛

"دعاء کیجئے اور قوت بھر تدبیر میں لگے رہیئے۔ آخر وقت تک نا امیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ہمیشہ بھروسہ رکھیئے اس کے در سے کوئی نا امید نہیں ہوتا۔"

اسمائے حسنیٰ کے ذریعے دعا

حضرت والا رحمہ اللہ تعالےٰ اسمائے الٰہیہ سے بھی حاجت براری کیلئے

دعا کی بعض اوقات تلقین فرمایا کرتے تھے۔ایک صاحب کو لکھا۔

"آپ قرض کی ادائی اور وسعتِ رزق کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا کریں۔ اور ہو سکے تو نماز عشاء کے بعد سَو سَو دفعہ یا مغنی اور یا باسطُ کی تسبیح پڑھ کر ادائے قرض اور وسعتِ رزق کی دعاء اللہ تعالیٰ سے گڑ گڑا کر مانگا کریں۔"

ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں؛

"پانچوں نمازوں کے بعد اپنی پریشانی کے دور ہونے اور وسعت رزق کیلئے خود دعاء کیا کریں۔ اور کوئی خاص وقت مقرر کر کے یا 'رزاق' یا 'وھاب' پانچ سو بار اول و آخر درود کے ساتھ پڑھا کریں۔ اور یقین رکھیں۔ کہ اللہ تعالیٰ موعودہ رزق ضرور عنایت فرمائیں گے۔"

ایک مسترشد خاص نے استفسار کیا کہ؛

"احقر کو کشادگی رزق یا دفع بلا وغیرہ کے اوراد و وظائف سے کچھ لگاؤ نہیں۔ البتہ دعاء میں کم و بیش دل لگ جاتا ہے۔ یہ حالت خدانخواستہ محرومی کی تو نہیں۔"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے عجب حکیمانہ جواب مرحمت فرماتے ہوئے لکھا؛

"ان امور کے لئے عمل یعنی اوراد و وظائف سے دلچسپی نہ ہونا دل کی سلامتی اور فہم کی استقامت کی دلیل ہے مگر دراصل ان کو عمل سمجھ کر کرنے سے یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اگر ان کو

بھی دعاء ہی سمجھا جائے تو یہ کیفیت جاتی رہے گی، مثلاً کوئی کشائش رزق کے لئے یہ بتائے کہ 'یا رزاقُ' 'یا وھابُ' 'یا باسطُ' پڑھا کرو۔ تو یہ تینوں اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ ان ناموں کی نسبت رزق اور وسعت و کشائش سے ہے۔ تو گویا یہ اپنے رزق کی وسعت کی دعاء ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس نام سے پکار کر جس نام کو ہماری دعاء سے مناسبت ہے۔ جیسے کوئی فقیر کسی دروازہ پر کھڑا ہو کر یہ کہے۔ کہ اے سخی داتا، اے سخی داتا، تو یہ بھی درخواست ہے۔ اور اس خاص نام سے پکارنا اس لئے ہے۔ کہ اس نام کے آثار کا اس کے فعل سے ظہور ہے۔"

ایسے اسمائے ربانی کے وسیلے سے دعاؤں کا مانگنا احادیث سے ثابت اور معروف ہے۔ امام ابن تیمیہ تک نے اسے جائز سمجھا ہے۔ (منہاج السنۃ صفحہ ۲۹۲ ج: ۱)

دوسروں کیلئے دعاء

ایک مسلمان کی اپنے دوسرے مسلمان کے حق میں غائبانہ دعاء مقبول و مستجاب ہے۔ اس لئے ایک دوسرے کیلئے دعاء کرنی چاہیئے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک طالب کو جس نے دعاء کی درخواست کی تھی تحریر فرمایا:

فقیر نے دعاء کی اللہ تعالیٰ قبول فرمادیں۔ گو خود جیسا ہوں ظاہر ہے۔ مگر دوسرے مسلمان بھائی کے حق میں اللہ تعالیٰ قبول فرمایا کرتے ہیں۔ یا اس سے بہتر چیز عطا کرتے ہیں۔"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ہے:

"جی ہاں! ہر بھائی کی دعاء دوسرے بھائی کے حق میں غائبانہ قبول ہوتی ہے .... الحمدللہ بخیریت ہوں۔ شفا دواؤں سے زیادہ بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی برکتوں سے اللہ تعالیٰ کے محض فضل وکرم کا نتیجہ ہے۔"

ایک مسترشد خاص کو لکھتے ہیں،

"(اہل تقویٰ سے) ضرور دعاء کرائیں، حاجت اور تکلیف کا ذکر نہ کریں۔ بلکہ صرف یہ کہیں کہ میری فلاح دین و دنیا کے لئے دعاء کریں۔" (تذکرہ ص۵۶)

مسترشد موصوف نے ایک خط میں اپنی اس کیفیت کا اظہار کیا کہ تواضع دوسرے کیلئے دعاء کرنے میں حائل ہوجاتی ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواباً ارقام فرمایا:

"جی ہاں یہ کیفیت ہے۔ بات تو یہی ہے (کہ ہم دوسرے کیلئے دعاء کرنے کے قابل نہیں۔ م-ا) مگر ہم اس پر مامور ہیں۔ کہ اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں دعائے خیر کریں۔ ہیں تو ہم ایسے ہی ناقابل مگر رب العلمین نے اپنی غایت کرم سے ہم کو

یہی حکم دیا ہے۔ کہ تم ہر حال میں جیسے بھی ہو دعاء کرو اور مانگو
اس لئے یہ حکم بجالانا ہے۔ وہ اپنی ربوبیت اور رحمت
سے قبول فرمائیں گے" (تذکرہ ص۹۶)

مضطر کی دعاء

قرآن مجید میں ہے؛

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوٓءَ	آیا کون ہے کہ قبول کرتا ہے دعاء مضطر (بے قرار آدمی) کی جب وہ اسکو پکارتا ہے اور اسکی مصیبت کو دور کر دیتا ہے (سوا اللہ کے)
(النمل - ۵)	

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے؛
"گو دوسرے سے دعاء کرانا بھی اچھا ہے۔ لیکن سب سے بہتر اضطرار کی حالت میں خود دعاء کرنا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مضطر کی دعاء کو رد نہیں فرماتے (اوکمال قال)"

دعاء میں توسّل بالذوات

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ توسّل اور واسطہ سے دعاء مانگنے کو جائز سمجھتے تھے۔ لیکن اسے بے توسل کی دعاء سے زیادہ مؤثر نہیں سمجھتے تھے۔

ایک مسترشد خاص نے استفسار کیا کہ "کیا دعاء واسطہ سے

کی جائے تو زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔" حضرت والا قدس سرہ نے جواباً ارقام فرمایا :۔

"جی نہیں ! ادعیہ ماثورہ بکثرت مروی ہیں۔ مگر ان میں کہیں واسطہ اور توسل ہے ؟ شاید ایک آدھ مقام پر ہو۔ اسلئے اگر توسل بالعمل ہو تو جائز ہے۔ اور اشخاص سے توسل بھی ان کے اعمال سے ہوتا ہے ۔۔ جب حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔ 'ادعونی استجب لکم' مجھ سے مانگو میں دوں گا، مجھے پکارو میں جواب دوں گا۔ تو پھر واسطہ کی کیا ضرورت ہے۔" (تذکرہ ص ۳۲۶)

اس مسئلہ میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے نام آپ کی تحریر قولِ فیصل اور بصیرت انگیز ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں :

" توسل بالذوات بے شبہہ جائز ہے۔ احیاء میں تو کلام کسی کو نہیں جس طرح حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کے توسل سے استسقاء کیا۔ رہ گیا اموات کے ساتھ توسل کے معنی ہیں کہ ان کے اعمالِ خیر و مقبولہ سے توسل کیا جائے۔ جس طرح اپنے اعمالِ خیر سے توسل جائز ہے۔ جیسا کہ حدیث الغار سے ثابت ہے (کما رواہ البخاری) اسی طرح دوسرے احیاء و اموات کے اعمالِ خیر سے بھی۔ وَابْتَغُوا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ الآیۃ کی تفسیر بھی توسل بالاعمال سے کی گئی۔ البتہ اموات سے خطاب کر کے اگر مستقلاً ان سے مانگا جائے تو یہ شرک ہے

اور ان سے کہا جائے کہ میرے لئے خدا سے دعا کریں۔ تو اہلِ دیوبند جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن میں اس کو بدعت سمجھتا ہوں۔ کہ یہ طریق دعاء منقول و ثابت نہیں۔ علامہ آلوسی نے (روح المعانی) آیت کریمہ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ کی تفسیر میں اس کو بدعت کہا ہے۔ بعد کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتاویٰ میں بھی یہ ملا۔ مولانا تھانویؒ بھی یہی فرماتے ہیں۔ اور بعد کو ان راویوں کے توافق سے مجھے تسکین ہوئی۔

شرک یہ ہے کہ خدا کی ذات وصفات وعباوات میں کسی کو شریک بنایا جائے۔ توسّل بالذوات الی اللہ تعالیٰ شرک فی الذات ہے نہ فی الصفات نہ فی العبادات۔ اصحابہ نجدیہ کہتے ہیں تو یہ ان کا غلو ہے۔

ہاں اگر ذوات سے کوئی یہ سمجھ کر توسل کرے کہ اللہ تعالیٰ ان کی درخواست کے سامنے مجبور و مضطر ہے تو بے شبہ یہ شرک ہوگا۔ اور اگر کوئی یہ سمجھ کر کرے۔ کہ جامع اعمال خیر ہیں اور ان کے اعمال بظاہر مقبول ہیں۔ تو ان کی ذات سے خدا کی طرف بہ سبب ان کے اعمال کے توسّل کیا جائے۔ کہ شاید ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ میری دعاء قبول فرمالیں۔ تو یہ جائز ہے۔ مگر حضرت عمرؓ کے فعل سے کہ انہوں نے توسل بالنبیؐ کی بجائے توسّل بعم النبیؐ فرمایا۔ یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ عمل

قابلِ اعتراض ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انہوں نے عم النبیؐ سے کیوں توسل کیا۔ کسی اور صحابی سے کیوں نہیں کیا۔ بالآخر عم النبیؐ کی مقبولیت عند اللہ میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت تھی ملحوظ رہی اور بالآخر بواسطہ توسّل بالنبی ہی ہوا۔ فافہم۔ (مکاتیب سلیمان صـ۱۳۲ بنام مسعود عالم ندوی)

دعاء اور ہمت و توجہ

اہل اللہ کے قلوب مناجاتِ الٰہیہ، توجہ الی اللہ، اور دھیان رب کا مرکز ہوتے ہیں۔ حقیقتِ دعاء جب ان قلوب میں رسوخ پاتی ہے۔ اور وہ کیفیتِ دعاء میں ڈوب جاتے ہیں۔ تو ان کے اندر اللہ تعالیٰ سے طلبِ دعاء، افتقار و التجاء کا ایک اندرونی جذبہ کارفرما ہوجاتا ہے؛ ان کے دل ہر وقت الحاح و ابتہال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز اور طلبِ خیر کے داعی رہتے ہیں۔

"رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ" (القصص۳)

(اے میرے پروردگار (اسوقت) جو نعمت آپ مجھ کو بھیج دیں میں اسکا (سخت) حاجتمند ہوں)

ان کے دلوں کا حال بن جاتا ہے۔ التجاء و افتقار، الحاح و توجہ کی یہ کیفیت ان کے اندر قوتِ دعاء کا ایک ملکہ راسخہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت و عطا اور صفتِ جود و سخا انہیں مستجاب الدعوات بنا دیتی ہے۔ اور انکی قلبی توجہ و ہمت کو انجاح حاجات کا عادۃً سبب قرار دے دیتی ہے۔ اور بقول عارف رومی

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں　　　　می دہد مولا مراد متقین

ان کا مقام بن جاتا ہے۔

حضرت والا قدس روحہ ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:

"غوث صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے۔ حق تعالیٰ جب اپنے مقبول بندہ کو اپنے عام بندوں کے مقاصد کے پورا کرنے کا بذریعہ دعاء وہمت ذریعہ بنالیں۔ وہ غوث کہلاتا ہے۔ اور اس کا دوسرا نام قطب تکوین ہے۔ جیسے قرآن پاک میں حضرت خضرؑ کا قصہ ہے اس اصطلاح کے مطابق جائز ہے۔"

قوتِ دعاء کے حامل یہ نفوس قدسیہ اور قلوب مطہرہ جب اپنی اس قوت قلبی کا استعمال کسی کی خیر کیلئے کرتے ہیں۔ تو اسے اصطلاحاً توجہ وہمت کہتے ہیں۔ گویا توجہ حقیقتاً عارف کی اس التجاء الی اللہ کا نام ہے جو وہ اپنے رب میں مشغول اور ملتجی ہو کر کسی شخص کی قلبی حالت کو خیر کی طرف پلٹا دینے کیلئے کرتا ہے۔ چونکہ اس حالت میں عارف کسی خاص شخص یا طبقہ کی طرف اپنی اس قوت کو متوجہ کرتا ہے۔ اس لئے اس توجہ کو اسکی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ حقیقتاً توجہ کا اثر اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ جو اس مقبول بندہ کو ذریعہ بنا کر ظاہر کیا جاتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ توجہ بھی اصلاً قلبی دعاء کی ایک قسم ہے۔ جس میں عارف کی دعاء وہمت توجہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ورنہ کوئی عارف بھی اپنے قلب کو مستقلاً سبب ہدایت یا مؤثر سمجھ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہونے

کا گمان بھی نہیں کر سکتا۔

بلکہ بعض ہمارے اکابر تو معروف توجہ کو جائز سمجھنے کے باوجود اس لئے پسند و مستحسن نہیں فرماتے کہ غیر کی طرف دھیان و توجہ بھی غیرتِ عشق الٰہی کے خلاف ہے۔ بہر حال جس شخص کی ہمت و دعاء کو اللہ تعالیٰ عادتاً خلق کی ہدایت کا سبب قرار دے دیتے ہیں۔ اسے قطب الارشاد کہتے ہیں۔ دیگر خاصان خدا اپنے درجہ کے مطابق اس شرف کو پاتے ہیں

زکوٰۃ و صدقات

سلوک اصلاح نفس، تزکیہ قلب، حصول فضائل اور ازالہ رذائل کا دوسرا نام ہے۔ نفس کے امراض خبثیہ وقبیحہ میں بخل وامساک اور حرص و آز نہایت مہلک مرض اور بے شمار باطنی بیماریوں کی جڑ اور بنیاد ہے بخل وحرص اصلاً ایک ہی حقیقت کے دو مظہر اور ایک ہی بیماری کی دو صورتیں ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے بخل وحرص کو ایک جامع لفظ 'الشح' سے تعبیر کیا اور انسانی نفوس سے اس کا گہرا تعلق ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ   اور نفوس کو حرص کے ساتھ اقتران ہوتا ہے

(النساء - ۱۹)

'الشح' عربی میں اس رذیلہ کا نام ہے۔ جس کی وجہ سے حرص و بخل

انسان کے نفوس میں جگہ اور پرورش پاتا ہے۔ امام راغب اصفہانی نے الشح کا معنی "بخل مع حرص" لکھا ہے (مفردات راغب ص ۲۵۶)

یہ رذیلہ انسان کو اپنے مال کے خرچ کرنے میں بخیل اور دوسروں کے مال کا حریص بنا دیتا ہے۔ حرص و بخل ایسا قبیح مرض ہے جو بیشمار امراض قلبی، حب مال، حب جاہ، دنائت، پستی خیانت، چوری، ڈاکہ زنی، لوٹ کھسوٹ، ناجائز نفع اندوزی وغیرہ کو جنم دیتا ہے۔ بقول حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ،

"بہر حال حرص تمام پریشانیوں کی جڑ ہے۔ اور ایسا مرض ہے کہ اس کو ام الامراض کہنا چاہیئے کیونکہ اسکی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں۔ اسکی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں حرص نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دبائے اور پھر ان فسادات کی کبھی نوبت نہ آئے۔ بدکاری، چوری وغیرہ کا منشاء حرص ہی ہے کہیں حرص مالی، کہیں حرص لذات، نیز اخلاق رذیلہ کی جڑ بھی یہی حرص ہی ہے۔ عارفین کا قول ہے کہ تمام اخلاق رذیلہ کی اصل کبر ہے۔ اور کبر کا منشاء بھی ایک گونہ حرص ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ بھی حرص ہی کا ایک فرد ہے۔ تو حرص منشاء ہوا تمام معاصی کا یہاں سے اس حدیث کا مطلب واضح ہو گیا

حب الدنیا راس کل خطیئۃ - حب دنیا ہی کا نام تو حرص ہے
(علاج الحرص ص ۱۱، ص ۱۲)

۱۰ اس شنیع رذیلہ کی انہیں قباحتوں کی بنا پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

ے روح المعانی ص ۳۸-۳۷ ج: ۹ میں تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔

نے تحریر فرمادیا ہے کہ:

الشح اقبح الاخلاق — حرص مع البخل سب سے بدترین خلق ہے۔
(حجۃ اللہ البالغہ ص۲۹ ج ۲)

حضرت سیدی الشیخ قدس اس کے مظاہر کے بارے میں فرماتے تھے:

"حب مال وحب جاہ زہر کے دو لبالب پیالے ہیں جسکے منہہ سے لگ گئے ہلاک ہوگیا۔"

ایک جگہ ارقام فرماتے ہیں:

"حقیقت میں ترقی جسکی اس وقت دم بدم پکار ہے۔ اونچے محلوں، بھرے خزانوں، شاہانہ احتراموں۔ بیش قیمت لباسوں گراں بہا سامانوں، بڑی بڑی تجارتوں، اعلیٰ ملازمتوں، اونچی تنخواہوں اعزازوں اور خطابوں کا نام نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کے ساتھ بلند اخلاق، شریف عادات اور پاک وصاف قلب کا نام ہے۔ جو آب وگل سے وابستہ اور فانی کا طالب نہ ہو۔ اور حرص وہوا حب مال وحب جاہ کا گرویدہ نہ ہو۔ جس میں اخلاص کے ساتھ خالق کی رضا کے لئے خلق کی خدمت کا جذبہ ہو۔ (مقدمہ جامع المجددین ص۲۹)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بدترین اخلاقی بیماری سے بچنے والوں کی تعریف فرمائی۔ چنانچہ انصار کے بارے میں ارشاد باری ہے۔

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُو الدَّارَ — اور نیز ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جو

وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ	حق ہے) جو دارالاسلام (یعنی مدینہ)
مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ	میں ان (مہاجرین) کے (آنے کے)
فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا	قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں اور
اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	ایمان والے۔ جو ان کے پاس ہجرت
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ	کر کے آتے ہیں۔ اس سے یہ لوگ محبت
وقف وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ	کرتے ہیں۔ اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ	ہے اس سے یہ انصار اپنے دلوں میں
	کوئی رشک نہیں پاتے اور انہیں اپنے سے مقدم
(الحشر۔ ۲)	رکھتے ہیں (کھانے کھلانے میں) اگرچہ ان
	پر فاقہ ہی ہو۔ اور واقعی جو شخص اپنی طبیعت
	کے بخل سے محفوظ رکھا جائے۔ ایسے
	ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں انصار کی جن صفات کی تعریف کی گئی ہے۔ اس میں "الشح" (حرص و بخل) کے نہ ہونے کی تعریف فرمائی گئی ہے۔

وَلَا يَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ	اور نہیں پاتے بیچ دلوں اپنے کے خلش
حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا	(حرص کی وجہ سے) اس چیز سے کہ دیئے
	جاویں مہاجرین۔

میں حرص کی نفی اور

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	اور اپنی جانوں سے مہاجرین کو مقدم

وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ — رکھتے ہیں (کھلانے کھلانے وغیرہ میں) اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو۔

میں عدم بخل کو سراہا گیا ہے۔

گویا انصار کا خاص کمال یہ تھا کہ وہ حرص و بخل سے بری تھے۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور حقیقی کامیابی کے مستحق تھے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ 'الشح' سے بچنے کیلئے حرص و بخل سے بچاؤ اور دوسروں پر انفاق ضروری ہے۔ کہ اس مہلک مرض کا عملی علاج ہی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہیں اور (جو شخص ان میں پڑ کر اللہ کو یاد رکھے) تو اللہ کے پاس (اس کیلئے) بڑا اجر ہے۔ تو جہاں تک ہو سکے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اور اس کے (احکام کو) سنو اور مانو اور (بالخصوص مواقع حکم میں) خرچ کیا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ آخرت میں فلاح

شکورٌ حلیمٌ — پالنے والے ہیں۔ اگر تم اللہ کو اچھی طرح (یعنی خلوص کیساتھ) قرض دو گے تو وہ اسکو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جاوے گا۔ اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان ہے (کہ عمل صالح کو قبول فرماتا ہے) اور بڑا بردبار ہے

(التغابن۔۲)

ان آیتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حرص و بخل کا علاج "انفاق فی سبیل اللہ" ہے۔ اور زکوٰۃ و صدقات کے وجوب و حکم کی ایک بڑی وجہ اسی رذیلہ کا علاج ہے۔

حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ "دولت" کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"اس سلسلہ میں دولتمندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین مظہر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا۔ اور جو اس گناہ سے پاک ہوا اسی کو کامیابی کی بشارت دی۔"

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ — اور جو اپنے جی کے لالچ سے بچایا گیا۔ وہی لوگ ہیں مراد پانیوالے

(الحشر۔۱)

بخل کا مبتلا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا۔ بلکہ درحقیقت وہ خود

اپنے ساتھ بخل کرتا ہے۔ وہ اسکی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا:

وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد-۴)

اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔ اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

اس آیتِ پاک میں درپردہ یہ بھی واضح کر دیا۔ کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمہاری نہیں۔ اصل مالک خدا ہے۔ اور تم خود اس کے محتاج ہو۔ پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو۔ بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے۔ اور اس کو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے۔ خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے۔ اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اسکی نسبت ہے۔ دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے۔ اس آیت پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی ہے۔ اور بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا۔

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ

پھر اس دن تم سب سے نعمتوں

عَنِ النَّعِيْمِ (تکاثر-۱) کا حساب پوچھا جائیگا۔

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تنبیہ کی۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ برائی ہو اسکی جو طعنہ دینا اور عیب
لُّمَزَةِ نِ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا چنتا ہو، جو مال کو سینت کر رکھتا ہو
وَّعَدَّدَهٗ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اور اسکو گن گن کر، وہ خیال کرتا ہے
اَخْلَدَهٗ كَلَّا کہ اس کا مال اس کے ساتھ سدا
(الھمزۃ-۱) رہے گا، ہرگز نہیں

فرمایا، "رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے۔ ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے۔ اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے۔ اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔" (بخاری کتاب العلم) جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہوں۔ اور کار خیر میں خرچ نہ کرتے ہوں۔ ان کو خطاب کیا۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وہ لوگ جو سونا چاندی گاڑ کر رکھتے
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ ہیں۔ اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ نہیں کرتے۔ ان کو دردناک عذاب
اَلِيْمٍ (توبہ-۵) کی بشارت دے دو۔

"........ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوئی اور عیسوی
دونوں شریعتوں کی جامع ہے۔ اسلام نے خیرات کے درجے مقرر
کر دیئے ایک قانونی اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار
باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی یعنی نصف مثقال نقد اور عشر پیداوار
میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع
اور صاحب نصاب پر واجب ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا
جماعت کا فرض ہے۔ اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی
اور خوشی پر منحصر رکھا ہے۔ اس کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند
سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا، اور بلند ہمت انسانوں
کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی، صحابہؓ میں دونوں قسم کے لوگ
تھے۔ وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے
جیسے حضرت ابوذرؓ (بخاری باب ما ادی زکوۃ فلیس بکنز) اور وہ بھی تھے
جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں میں لا کر ڈال دیتے
تھے (ترمذی کتاب المناقب فضائل ابی بکرؓ) ــــ اور ایسے بھی تھے
جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے
جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ (اسد الغابہ جلد ۳ ص ۳۱۶) ــــ
اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے
اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے جیسے حضرت
علی مرتضیٰؓ اور بعض انصار کرامؓ، خدا نے انکی مدح فرمائی:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی	اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود
حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا	اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو
(دھر - ۱)	کھلا دیتے ہیں۔
وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ	دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود حاجتمند
(حشر - ۱)	ہوں۔

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہے۔ اور ہر ایک کیلئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے۔ جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے، اور ساتھ ہی ساتھ اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبۂ کمال کیلئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے۔ اور اس کی خوبیاں اور برائیاں بھی بیان کر دی ہیں۔ تاکہ امت کے باحوصلہ حضرات ہمت کے شہپروں سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبہ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

و ایں طائفہ جان و مال در	اس فرقہ نے اپنی جان و مال کو
باختہ اند و با ہیچ کس ماسو اللہ	ہار دیا ہے۔ اور خدا کے سوا کسی

نہ پرداختہ اند گفتہ ایشاں است
اَلْفَقِیْرُ مالُہٗ مباحٌ ودَمُہٗ
ھدرٌ یعنی درویشِ صادق آن
بود کہ بخون و مال او را دعویٰ
نہ بود..... اگر مالش برند خوش
گردد گوید الحمدللہ کہ حجابے از
پیش من برداشتند تا گفتہ از
زکوۃِ نعمت دنیا نزدیک ایں
طائفہ محمود نہ باشد، از انکہ بخل
ناستودہ است و بخلی تمام باید
تا دویست درم را در بند کند
ویکسال محبوس دارد، آنگاہ پنج درم
ازاں بدہد۔

سے دل نہیں لگایا۔ اسکا مقولہ
ہے کہ درویش وہ ہے جسکا مال
وقف اور جس کا خون معاف ہو
اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ
نہ ہو...... اگر لوگ اس کا
مال اٹھا لیجائیں تو خوش ہو کہ الحمدللہ
اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک
پردہ پڑا تھا وہ اٹھا یہاں تک کہ
ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا کی دولت
کو جمع کر کے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا نہیں
ہے کیونکہ بخالت تعریف کے
قابل نہیں۔ اور اس کے لئے
سال میں دو سو درم جمع ہوں اور
پھر وہ ایک سال تک بند پڑے
رہیں۔ تب جا کر ایک سال کے
بعد پانچ درم ان میں سے خدا
کی راہ میں دے بڑی بخالت کی
ضرورت ہے

اس کے بعد حضرت شبلی کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے۔

یکے از فقہا بر سبیل آزمائش شبلی
رحمۃ اللہ علیہ را پرسید کہ زکوٰۃ
در چند لازم آید، گفت جواب
بر مذہب فقیہاں خواہی، یا بر
مذہبِ فقیراں؟ گفت بر ہر دو
جواب فرما، شبلیؒ گفتہ بر مذہب
فقیہاں از دویست درم بعد از
حولانِ حول پنج درم باید داد، و بر
مذہب فقیراں در حال دویست درم
باید داد و جان بشکرانہ بر سر باید
نہاد، فقیہ گفت ما ایں مذہب
از ائمہ دین گرفتیم، شبلیؒ گفت
ما ایں مذہب از صادق رب
العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق
رضی اللہ عنہ، او ہر چہ داشت
پیش سید عالم صلی اللہ علیہ و
وسلم نہاد و جگر گوشہ خویشتن
بشکرانہ داد۔

(مکتوب ۴۳ سہ صدی)

کسی فقیہ نے حضرت شبلیؒ سے
امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے
فرمایا فقہا کے مسلک پر جواب
چاہتے ہو یا فقراء کے، کہا دونوں
کے، فرمایا فقہا کے مذہب کے
مطابق ایک سال گزرنے پر دو سو
میں سے پانچ درم اور فقراء کے
مسلک پر فوراً پورے کے پورے
دو سو، اور اس نذرانہ کی خوشی
میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر
پیش کرنی چاہیئے۔ فقیہ نے کہا
ہم نے یہ مذہب آئمہ دین سے
حاصل کیا ہے۔ فرمایا ہم نے یہ
مسلک صدیق اکبرؓ سے حاصل کیا
ہے کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور
عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے
رکھ دیا اور اپنی جگر گوشہ (حضرت
عائشہ صدیقہؓ) کو شکرانہ میں
دیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی، آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا مال جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آتے، جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہل استحقاق میں تقسیم ہو جاتا، اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے تو گھر میں آرام نہ فرماتے، مگر عام امت کیلئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تاکہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولتمندوں کے ہر طبقہ کیلئے یکساں کھلا رہے۔ اور اس لئے تاکہ بے قیدی اور عدم پابندی لوگوں کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو مقدار معین کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی۔ تاکہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے (سیرۃ پنجم ص۲۵۵ تا ص۲۵۹)

اِس طویل اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے ایک عظیم مرض و رذیلہ حرص و بخل (الشح) کا علاج اللہ تبارک و تعالیٰ نے زکوٰۃ کی فرضیت و صدقات کے استحباب کے ذریعہ سے اس حد تک فرما دیا۔ کہ ہر شخص اپنی باطنی استعداد کے بقدر اپنی اس نفسانی آلائش سے پاک ہو کر اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا کا مورد بن سکتا ہے۔ اور انسانوں کی غمگساری، خدمت گذاری اور ہمدردی کا شرف حاصل کر سکتا ہے کہ بقول سیدی قدس سرہٗ :-

"زکوٰۃ یا دوسرے لفظوں میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبرگیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت نماز کے بعد اسلام کا دوسرا رکن ہے (سیرۃ ۵)

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ مقاصد زکوٰۃ کے بارے میں مزید ارقام فرماتے ہیں:

" زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ زکوٰۃ کے اندر ہے، زکوٰۃ کے لفظی معنیٰ 'پاکی و صفائی' کے ہیں۔ یعنی گناہ اور دوسری روحانی، قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک وصاف ہونا، قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنیٰ میں بار بار آیا ہے۔ سورۂ والشمس میں ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ	مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو
قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا	پاک وصاف کیا اور نامراد ہوا وہ
(شمس-۱)	جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا

ایک اور سورہ میں ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (اعلیٰ-۱) مراد پایا وہ جو پاک صاف ہوا

یہ تزکیہ اور پاکی و صفائی نبوت کی ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ	وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر ان کو
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمْ	سناتا ہے اور ان کو گناہوں سے پاک د

اَلْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ — صاف کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب

(بقرہ وجمعہ۔۱) — اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے انسانوں کی روحانی ونفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف ورجا اور تعلق ومحبت کا نہ ہونا ہے۔ اور اسکی اصلاح نماز سے ہوتی ہے۔ لیکن دوسرا سبب ماسوی اللہ کی محبت اور مال ودولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے۔ زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہ (باغ وبستان کی محبت کے سبب سے جو ان کی دولت تھی غزوہ میں شریک نہ ہوسکے) اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے وہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِہِمْ — ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے

صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمْ — کر ان کو صاف وپاک بنا۔

وَتُزَکِّیْہِمْ بِہَا۔ — (توبہ ۔ ۱۳)

اس آیت سے ثابت ہوا۔ کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا

زنگ جس کا نام محبتِ مال ہے دل سے دور ہوجاتا ہے۔ بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہوجاتا ہے۔ مال کی حرص بھی کم ہوجاتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ شخصی خودغرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں۔ جن پر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے۔

...... ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے۔ جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگ بنیاد ہے۔ بلکہ محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا۔ کہ:

لیس الغنیٰ من کثرۃ العرض ولکن الغنیٰ غنی النفس۔ (بخاری کتاب الرقاق)

تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے۔ اسی حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے: "توانگری بدل ست نہ بمال" دوسرے لفظوں میں یوں کہو، کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے۔ لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہیں بلکہ صبر و قناعت کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ و صدقہ کے مطہر، مزکی اور مصلح اخلاق ہونے میں شبہہ ہوسکتا ہے ...... جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ ہمیشہ قابلِ ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اسکی مدد کرکے اس کے زخمِ دل پر مرہم رکھ سکیں۔

" زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجتمندوں کی امداد ہے۔ انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے لیکن ..... محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی علمی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ اور اسکی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کیلئے علمی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی .... اسلام نے ..... روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا وہ ان کی دنیاوی تکلیفوں اور مصیبتوں کے کم کرنے کی علمی تدبیریں ہیں۔ جن کا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔ اسکی تعلیم نے اس علمی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب و تشویق تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں۔ ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی کہ جس سے جتنا ہو سکے اپنی دولت سے ان کی مدد کرے یہ اخلاقی خیرات ہے جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں " انفاق " ہے۔ لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی۔ اسلئے ایک مقدارِ معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا۔ جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے۔ اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد و اعانت کے لئے مخصوص کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس تعلیم کو ایک ایک ناقابلِ تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کیلئے سپرد فرمایا۔ چنانچہ آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا۔ تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا۔ وہ

یہی زکوٰۃ ہے۔ پھر اسکی نسبت ان کو ہدایت فرمائی کہ،

توخذ من اغنیاء ھم — وہ ان کے دولتمندوں سے لے کر

وترد علی فقراءھم — ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے

(بخاری ص۱۰۹۶ جلد ۲)

صحابہؓ نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے۔ وہ بازار جاکر مزدوری کرتے تھے۔ تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب اور معذور بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں۔ اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دلجوئی کی کہ فرمایا،

"اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف وکرم و مہربانی سے بات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے۔"

اس سے زیادہ یہ کہ اس کی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو، خدا نے تعلیم دی۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ — تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ — والے کو جھڑک (ضحیٰ-۱)

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجتمند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو کہ وہ شرمندہ ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی، اور اس کی توفیق عنایت کی، احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گا۔ فرمایا،

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ   تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی (البقرہ۔۳۶)   طعنہ دیکر برباد نہ کر۔

اس لطف، اس مدارات، اور اس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی۔ اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا . . . . " (سیرت النبی صفحہ ۲۴۱-۲۲۱ ج ۵)

یہ حقیقت ہے۔ کہ انسان کی باطنی صفائی اور اس کے جواہر خلافت کا نکھار بڑی حد تک جود وسخا، داد وستد، انفاق وصدقات اور زکوٰۃ وخیرات پر مبنی ہے۔ حضرت سیدی قدس روحہٗ ارقام فرماتے ہیں:

" صدقہ وخیرات درحقیقت وہ پانی ہے۔ جو دینے والوں کے قلوب ونفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک وصاف بنا دیتا ہے . . . . . . (اور اپنے ساتھ قلب ونفس کی گندگی کو بہا لے جاتا ہے۔ اشرف) . . . . اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَات   یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے "
اِنَّمَا هِيَ اَوْسَاخُ النَّاسِ   (یعنی رذائل کی گندگی کو اپنے ساتھ بہا
(مسلم کتاب الزکوٰۃ)   لے جانیوالا ہے) (سیرۃ صفحہ ۲۶۸ ج ۵)

حقیقتاً یہ میل مال کی محبت ہے۔ جو اس امت کا سب سے بڑا فتنہ ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ فِتْنَةً وَ   ہر ایک چیز کیلئے کوئی فتنہ ہوتا

فتنۃ امتی المال　　　ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔

(کنز العمال بحوالہ ترمذی و مستدرک حاکم ص۱۴۶ ج ۲)

یہی مال کی محبت نفس و قلب کو ان تمام آلودگیوں اور گندگیوں سے گدلا اور میلا کر دیتی ہے۔ جسے ہم حرص و طمع، بخل و دنائت، خود غرضی و حرام خوری، فریب و دھوکہ، بے غیرتی و بے حیائی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور پھر یہ رذائل چند در چند کبائر اور شنیع افعال کے ارتکاب کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جس سے بددیانتی، چوری و ڈاکہ، رشوت و قمار، سود و احتکار اور ظلم و زیادتی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ انسان کو مال کی محبت اور دولت کی حرص میں حلال و حرام جائز و ناجائز کی تمیز نہیں رہتی۔ وہ اپنے منافع و مفادات کے حصول میں احکام الٰہیہ سے غافل ہو جاتا ہے۔ بنی نوع انسان قوم و ملت، خویش و اقارب، اپنے اور بیگانے کے نفع و ضرر سے بے نیاز ہو کر ہر طرح سے مال کی لوٹ کھسوٹ میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی اقدار کو پامال کر کے وہ معاشرہ کے بگاڑ اور زمین میں فساد کا سبب بنتا ہے۔ مال کی بہتات کی حرص اسے پہلے اپنی ہلاکت کے گڑھے پر کھڑا کر دیتی ہے اور مال کا وہ قومی و ملی معشیت کی بربادی کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسے کم نصیبوں کو قرآن نے وعید سناتے ہوئے فرمایا:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى　　(دنیا کے مال کی) بہتات کی حرص نے

زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝　　تمہیں (اللہ و آخرت سے) غافل کیا

(التکاثر-۱) — یہاں تک کہ تم قبرستان میں پہنچ جاتے ہو

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ — برائی ہو، اسکی جو طعنہ دیتا، اور

نِ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهُ ۝ — عیب چنتا ہو، جو مال کو سنیت

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ — کر رکھتا ہو۔ اور اس کو گن گن کر،

كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ الى آخر — وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس

(الھمزۃ-۱) — کے ساتھ رہے گا۔ ہرگز نہیں۔

واللہ وہ شخص ایسی آگ میں ڈالا

جائے گا۔ جس میں جو کچھ پڑے

توڑ پھوڑ ڈالے

غرض مال کی برباد کن محبت اور حرص و آز کا عملی علاج زکوٰۃ اور صدقات کی کثرت ہے۔ جو دل سے رفتہ رفتہ مال کی محبت کم کر دیتی ہے۔ اور انسان ان رذائل سے پاک ہو جاتا ہے۔ جو دنیا و آخرت دونوں میں تباہی و رسوائی کا سامان ہیں۔

زکوٰۃ فریضہ الٰہی اور رکن اسلام ہونے کیساتھ قلب کی پاکی و نفس کی صفائی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اس لئے سالکین کو اسکی ادائیگی سے چارہ کار نہیں۔ اسلئے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ طالبین کو نماز کے ساتھ ہی زکوٰۃ کی ادائیگی کی برابر تلقین فرماتے تھے۔

ایک مبتدی طالب کو ارقام فرماتے ہیں:

"ایام بلوغ سے جو نمازیں چھوٹی ہوں ان کو ہر نماز کے ساتھ

ادا کرنا شروع کیجئے۔ اگر روزے رہ گئے ہوں۔ تو ان کی قضا کیجئے۔ اگر زکوٰۃ واجب ہو۔ زکوٰۃ حساب کر کے دیجئے۔"

دوسرے طالبین کے خطوط میں زکوٰۃ کی تاکید اس قسم کے الفاظ میں ملتی ہے:

"وہ گناہ جن کی تلافی ہو سکتی ہے۔ (انکی تلافی کیجائے) جیسے نمازیں قضا ہوں، یا روزے چھوٹے ہوں، یا زکوٰۃ نہ دی ہو"

"زکوٰۃ کی رقم (ندوہ) ضرور بھیج دیں۔ اور تصریح سے لکھ دیں۔ کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے مستحقین میں خرچ کیجائے۔"

متعدد مکتوبات میں زکوٰۃ کی ادائیگی کی تلقین مختلف عبارتوں میں ملتی ہے۔ جسے بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بہر حال گذشتہ مباحث سے زکوٰۃ وصدقات کی سلوک میں اہمیت و مقام کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ جادۂ حبیب کے راہی جان ومال دونوں کی قربانیوں ہی سے منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ؎

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند جان ومال وخانماں را چہ کند

ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا دل حب مال و جاہ کی آلائشوں سے پاک استغنا، سیر چشمی، اور جود وکرم کی دولتوں سے مالا مال تھا۔ حضرت سیدی قدس سرہٗ کی یہ دولت خاندانی ورثہ اور فطرتی جوہر تھا۔ آپ کا تعلق جس خانوادہ سیادت سے تھا۔ وہ دنیاوی فارغ البالی ووجاہت

کے ساتھ دینی فرایا اور درویشانہ کمالات کا مجموعہ تھا۔ اس لئے آپ فطرتاً و وراثتاً سیر چشمی، قناعت و سخاوت کی صفات کے حامل تھے۔ حضرت سیدی رحمہ اللہ علیہ کی دنیا سے بے رغبتی و قناعت کے دشمن تک قائل ہیں۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک بڑے ناقد ان کے عیوب گناتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شبلیؒ کے جانشین سید سلیمان ندوی کو دنیا سے کوئی لگاؤ یا محبت نہیں۔ ان کے والد بہار کے ایک مشہور صوفی تھے۔ اور یہ درویش طبعی انہیں وراثت میں ملی ہے۔ وہ پرلے درجے کے قانع انسان ہیں....." (رودِ کوثر ص۱۰۱)

روزہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین و الصلوٰۃ و السلام علی صفوۃ البریۃ سیدنا و مولانا محمد خاتم النبیین و آلہ و اصحابہ و ازواجہ اجمعین والعاقبۃ للمتقین ۞ امّا بعد :

سلوک ضبط نفس، پابندی احکام الٰہی واتباع سنت نبویؐ کا نام ہے اور غایۃً حصول تقویٰ کی راہ ہے۔ تقویٰ حاصل عبادات، غایت اوامر ربانی اور قرآنی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ چنانچہ وحی الٰہی نے انسانی پیدائش کا مقصد عبادت قرار دیا، ارشاد ہے

وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون — اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے
الذاریات آیۃ ۵۶ — پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔
(حضرت تھانویؒ)

اور مقصود عبادات تقویٰ کو ٹھہرایا۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔

یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم و الذین من قبلکم لعلکم تتقون ۞ البقرۃ ۲۱ — اے لوگو اپنے اس پرودگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

سیّدی ومرشدی حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی نوراللہ مرقدہ فرماتے تھے "اگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو اسکو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔" تقویٰ جیسی نعمت ودولت کے حصول کیلئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں مختلف عبادات کو مشروع فرمایااور احکام نازل فرمائے۔ وہاں "روزہ" جیسی خاص عبادت امت پر فرض فرمائی جسکی

کماحقہ. بجا آوری گنتی کے چند دنوں (ماہ صیام کے ایک مہینہ) میں پوری امت میں "تقویٰ" کو عام وتام کر سکتی ہے۔ قرآن کریم روزہ کی فرضیت کا حکم ارشاد فرماتے ہوئے اسکی غایت کا اظہار یوں فرماتا ہے:

یا ایها الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون ۝ ایّام معدودات ۔

اے ایمان والو ! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم تقویٰ والے (یعنی پرہیزگار) بنو۔ (یہ روزوں کے دن) چند روز ہیں گنتی کے۔

البقرۃ ۱۸۳،۱۸۴

اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں روزہ کا حکم وفرضیت، اسکی تاریخ یعنی پہلی امتوں میں اسکا ہونا اور اسکا مقصد وفائدہ بیان فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ یہ عظیم وپر اثر عبادت گنتی کے چند دنوں کے لئے فرض کی گئی ہے یعنی ہر سال کے قمری مہینے کے انتیس یا تیس دن کا روزہ مسلمانوں پر فرض ہے اور پورے سال کے مقابلے میں یہ گنتی کے دن ہی تو ہیں (ایام معدودات) اور اپنے فائدہ کے اعتبار سے اس قدر شاندار اور نتیجہ خیز ہے کہ پوری ملت کی کایا چند دن میں پلٹ سکتی ہے اور تقویٰ کی اس دولت سے مالا مال کر سکتی ہے جو دینی تعلیمات کا خلاصہ و حاصل اور غایت قصویٰ ہے، حضرت الشیخ مرشدی المکرم علامہ سید سلیمان ندوی نوراللہ مرقدہ مذکورہ بالا آیت نقل کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہیں۔

"۔ تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو۔ بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت سے پیدا ہوتے ہیں۔ روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کی

قدرت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے، روزہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ "روزہ" شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے۔" (۱)
(سیرۃ النبی ج ۵ ص ۳۱۱)

بقول حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ قرآن نے روزہ کے مقاصد اور اغراض تین مختصر فقروں میں بیان کر دئے ہیں۔

۱۔ لتکبرو اللہ علی ما ھداکم		تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے۔ اس پر اسکی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو۔
۲۔ و لعلکم تشکرون	البقرۃ ۱۸۵	اور تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔
۳۔ لعلکم تتقون	البقرۃ ۱۸۳	تاکہ تم پرہیزگار بنو (یا تم میں تقوی پیدا ہو)

مذکورہ بالا ان تین مختصر فقروں میں صحیفہ الٰہیہ نے روزہ کے اغراض ومقاصد بیان فرما دیئے ہیں حضرت سید لملۃ قدس سرہ نے ان فقروں کی جو وضاحت فرمائی ہے سیرۃ النبی سے اس کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تعلیم ربّانی محض حکم کے طور پر نہیں ہے بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے۔ اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چہارگانہ ستونوں پر قائم ہے۔ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انھوں نے اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا، یہاں تک کہ وہ مکالمہ الٰہیہ سے سرفراز ہوئے اور پیغام ربّانی نے ان پر نزول کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کئے، جب تورات کی لوحیں ان کو سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی

(۱) صحیح بخاری کتاب الصوم

طرح گزارے جب حکمت کا سرچشمہ ان کو زبان اور سینہ سے ابلا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں ایک مہینہ یعنی تیس دن مصروف عبادت رہے اس کے بعد فیضان الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک مقدس ایام کی تقلید و پیروی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی میں یہ چند دن اسی طرح گزاریں چنانچہ ارشاد فرمایا:

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم	اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ میں) روزہ فرض کیا گیا تھا، تم پر بھی فرض کیا گیا۔

بقرۃ ۱۸۳

دین الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے اپنے پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔ یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعے انسانوں پر کیا، شکریہ ہے اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے۔ وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی وذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہونچایا، ان کی وحشت کو تہذیب واخلاق سے، ان کی جہالت کو علم ومعرفت سے، ان کی نادانی حکمت ودانائی سے اور تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا۔ جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے

الٹ دئے اور دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کی کاشانوں کو معمور کر دیا ۔ جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا ۔ قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

و لتکبروا اللہ علی ما ھد اکم و لعلکم تشکرون ۝ البقرۃ ۱۸۵	اور (یہ رمضان کا روزہ اس لئے فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس ہدایت نے دی اور تاکہ تم اسکا شکریہ ادا کرو۔

اس ہدایت ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکر گزاری کا یہ رمزو اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عید گاہوں میں جاتے اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

انسانوں میں کوئی غریب ہیں کوئی امیر۔ کوئی نان جویں کو ترستے ہیں تو کوئی سر وقت انواع واقسام کی رنگا رنگ لذیذ و قیمتی اغذیہ سے اپنے کام و دہن کو لذت بخشتے ہیں۔ فقروفاقہ ہے تو کہیں عیش و نعم ، کہیں قورمہ وقلیا ، پلاؤ و بریانی مرغ و بٹیرے ہے تو کہیں سوکھی روٹی بھی بمشکل میسر ہوتی اور دال پیاز مل جائے تو گویا عید آجاتی ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ جہاں پیٹ بھرے اور آسودہ حال ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں وہ بھی کبھی غربا و مساکین کی طرح اختیاری طور پر فاقہ کی کیفیت سے اپنے کو آگاہ کریں تاکہ انہیں اپنے غریب بھائیوں پر گزرنے والی تکلیف کا ایک گونہ اندازہ ہو اور وہ ضرورت کے مواقع پر اپنے محتاج ، غریب اور بھوکے بھائیوں کے دکھ کا علاج ومداوا کر سکیں اور اپنی خداداد دولت سے مساکین کی مدد کر سکیں۔ اس طرح ان کی اس داد وستد اور خیرات وصدقات سے اگر ایک طرف ضرور تمندوں کی حاجت روائی ہو تو دوسری طرف مالداروں کی مال کی حرص و آز کا بھی علاج ہو سکے کہ انسانی نفوس میں حرص موجود ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ربانی

ہے۔

و احضرت الانفس الشح   اور نفوس کو حرص کے ساتھ اقتران ہوتا ہے

الشح اصلاً اس رذیلہ نفس کو کہتے ہیں جسکی وجہ سے انسان اپنے مال کے بارے بخیلی و کنجوسی برتتا ہے اور دوسروں کے مال پر حرص و طمع رکھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا مہلک مرض ہے کہ حسد، بخل، حرص و طمع، چوری وڈاکہ زنی، سود وفریب وغیرہ گوناگوں مالی فساد کا مورث ہے اسلئے قرآن کریم نے دو بار ارشاد فرمایا ہے

و من یوق شح نفسہ فأولئک   جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ
ھم المفلحون۔   آخرت میں فلاح پانے والے ہیں۔

الحشر ۹ التغابن ۱۶

غرض روزہ سے بھوک پیاس کا ذاتی تجربہ ہو جانے کی وجہ سے غرباء و ومساکین کی حالت کا جو احساس ہوتا ہے جو مال کی محبت کو کم کرکے غرباء ومساکین پر خیرات وصدقات کا موجب وسبب بنتا ہے، اتنی بڑی خوبی ہے جو معاشرہ کی بے شمار مالی برائیوں کو ختم کر سکتی ہے اور پورے معاشرہ کو ایک ایسی اکائی بنا سکتا ہے جو جسد واحد کی طرح معاشرہ کے دکھ سکھ کو اکٹھا اٹھا سکیں اور یہی اسلامی مالی تعلیمات کا مقصد ہے حضرت سید والا تحریر فرماتے ہیں۔

"روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک وپیاس کی تکلیف ہوتی ہے اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند نعمتوں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے۔ جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی اور جو خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا۔ بقول حافظ ابن حجر سوز جگر سے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار رحم کو ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

حال تھا کہ بعض صحابہؓ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپؐ کی سخاوت بادرواں کی طرح ہوتی تھی (صحیح بخاری باب بدء الوحی) اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے یہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امدادو اعانت اور ان کا شکم سیر کیا جاتا ہے" (سیرت النبی جلد ۵ ص ۲۳۲)

یہ دنیا دھوپ چھاؤں ہے کبھی ایک ہی شخص دولت میں کھیلتا اور دنیا کی باغ بہار عیش و عشرت اور آرام وراحت میں زندگی گزارتا ہے اور کبھی وہی شخص فقروفاقہ میں مبتلا غیروں کا دست نگر اور ایک وقت کی روٹی کا محتاج ہو جاتا ہے۔ زندگی کے ایسے مواقع کیلئے ضرورت ہے کہ آرام و راحت اور فراخی وسعت کے ایام میں انسان کچھ مدت کیلئے اختیاری فقروفاقہ کی مشق کرے تاکہ خدا نخواستہ اگر کبھی متوقع مصائب گھیر لیں تو وہ انکا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر سکے۔ اسی طرح مسلمان جہاد کے میدان میں جس میں بھوک پیاس کا پیش آجانا کوئی بعید نہیں تحمل وبرداشت اور صبروضبط کا نمونہ پیش کر سکے۔ روزہ مسلمانوں میں اسی برداشت وسہار کی قوت وہمت پیدا کرنے کی مشق ہے۔ بقول حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ

" یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے اور دنیا کی کشمکش، جدوجہد، سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے۔ اس لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے"

(سیرت النبی جلد ۵ صفحہ ۲۳۶)

سلوک کے مجاہدات کا مقصد انسان سے گناہوں کی گندگیاں دور کر کے نیکی اور بھلائیوں کا حصول ہے جسے رذائل سے پاکی اور فضائل سے آراستگی کہتے ہیں۔ پس جس عمل سے بھی انسان کا نفس رذائل سے پاک اور فضائل سے آراستہ ہو سکے وہ سلوک کی راہ کا مقصود ومدعا ہے۔ اس اعتبار سے روزہ انتہائی مفیدونافع اور کارگر بلکہ کلید اصلاح ہے۔ قرآن کریم نے روزہ کی فرضیت کا ایک بڑا سبب اسکی تقویٰ کی

خاصیت کو قرار دیا ہے جو روزہ کا مقصد ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

لعلکم تتقون (البقرۃ ۲۲) تاکہ تم پرہیزگار (تقوی والے) بنو

علامہ آلوسیؒ اس کی شرح یوں فرماتے ہیں۔

"ای کی تحذر و المعاصی فان الصوم یعقم الشھوۃ التی ھی امھا او یکسرھا ـــــ و الصیام کالصوم مصدر صام و ھو لغۃ الامساک ـــــ قال ابن درید کل شئی تمکث حرکۃ شئی تمکث حرکۃ فقد صام ـــــ و شرعاً امساک عن اشیاء مخصوصۃ علی وجہ مخصوص فی زمان مخصوص ممن ھو علی صفات مخصوصۃ۔"	تاکہ روزہ کی وجہ سے گناہوں سے بچے کہ روزہ شہوت عقیم (ختم) کر دیتا ہے کہ جو کہ گناہوں کی جڑ ہے یا اسے توڑ دیتا ہے اور صیام صوم کی طرح صام کا مصدر ہے جسکے لغت میں معنی رکنے کے ہیں ابن درید نے کہا ہے کہ ہر چیز جس کی حرکت ٹھہر جائے اسے "صام" کہیں گے اور شرع میں اس کا مطلب رکنا ہے مخصوص چیزوں سے مخصوص وجہ سے مخصوص زمانے میں۔ وہ مخصوص چیزیں خاص صفات پر ہوں۔"

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی میں ارشاد فرماتے ہیں

ازاں جملہ ست حیات روح بگرسنہ وتشنہ داشتن بدن در صوم	ازاں جملہ روح کی زندگی ہے روزہ میں بدن کو بھوکا اور پیاسہ رکھتے ہیں

(تفسیر عزیزی ص ۶۲)

علامہ امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں لعلکم تتقون کی تفسیر میں جو فرماتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس کلام سے واضح فرمایا ہے کہ روزہ کا نتیجہ وحاصل التقویٰ اس وجہ سے ہے کہ اس سے شہوت ٹوٹتی ہے اور خواہشات نفسانی کا قلع قمع (خاتمہ) ہوتا ہے کہ روزہ کھانے پینے کی خواہش اور رغبت سے روکتا بے حیائی اور فواحش سے بچاتا اور دنیا کی لذتوں اور ریاست کو حقیر و ہلکا کر دیتا ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ روزہ پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت کو مضمحل کر دیتا ہے

حالانکہ ان دونوں بطن وفرج کی خواہشات کی تگ ودو ہی میں لوگ لگے رہتے ہیں جیسا کہ مثل السائر میں ہے " المرء یسعی لغاریہ بطنہ و فرجہ " آدمی اپنے پیٹ وشرمگاہ کی خواہشوں کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے پس جو شخص کثرت سے روزہ رکھتا ہے ان دونوں کا معاملہ ہلکا ہو جاتا ہے اور ان کا سنبھالنا آسان ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے وہ محارم اور خواہش کو آسانی سے ٹھکرا دیتا ہے اور دنیا میں ریاست کا معاملہ اسکے کی لئے سہل ہو جاتا ہے اور یہ معاملات اسکے لئے التقویٰ کی اسباب کو آسانی سے اکھٹا کر دیتے ہیں کہ انسانوں کیلئے کھانے پینے اور نکاح کی خواہش سب سے اشد ہوتی ہے اور جب روزہ کی وجہ سے یہ کمزور ہوگی تو اللہ تعالیٰ اور تقویٰ کے تقاضے سے دگر جملہ اشیا کو چھوڑنا جنکا شرعاً تقاضا ہو زیادہ آسان اور ہلکا ہوگا اس طرح حصول تقویٰ اور ترک معاصی روزہ کی برکت سے سہل ہوجائیں گے ۔"

تفسیر کبیر رازی (۱۶۹،۱۷۰) جلد ۲

علامہ راغب اصفہانی الصوم کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں

الصوم فی الاصل الامساک عن الفعل مطعما کان او کلاما او مشیا و الصوم فی الشرع امساک و المکلف بالنیۃ من الخیط الابیض الی الخیط الاسود عن تناول الاطیبین والاستمناء و الاستقاء۔

مفردات راغب الاصفہانی ص ۲۹۳

الصوم فی الحقیقت لغت کے اعتبار سے کسی فعل (کام) سے رکنا ہے وہ کام کھانا کھانے کا ہو یا بات چیت ہو یا چلنا ہو اور شرع میں الصوم سے مراد رکنا ہے نیت کا مکلف ہوتے ہوئے یعنی ضرور نیت روزے کے کرتے ہوئے کہ بچوں گا فجر کی سفید دھاری (پو پھٹنے) سے لیکر مغرب کی سیاہ دھاری (جو افق پر چھاتی ہے) تک پاکیزہ کھانوں کے کھانے سے پانی پینے اور استمنا (خواہش نفسانی پورا کرنے) سے

مولانا روم فرماتے ہیں۔

و ہست روزہ ظاہر امساک طعام — روزہ معنی توجہ دان تمام
ایں دہاں بندد کے چیزے کم خورد — واں بہ بندد چشم و غیرے ننگرد

یعنی ظاہر کا روزہ کھانے سے رکنا ہے اور باطنی واصلی روزہ اپنی پوری توجہ سے اللہ تعالیٰ میں مشغول ہو جانا ہے۔ ظاہری روزہ منہ کو بند کر دیتا ہے کہ چیزیں کم کھائے اور باطنی روزہ غیر اللہ سے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ غیر کی مشغولیت ہی نہ رہے۔

یوں تو احادیث مبارکہ میں روزہ کے فضائل بہت آئے ہیں نمونہ کیلئے ایک حدیث نقل کرتا ہوں۔

عن ابی ھریرۃؓ ان رسول صلی اللہ علیہ و سلم قال الصیام جنۃ فلا یرفث و لا یجھل فان امرو قاتلہ او شاتمہ فلیقل انی صائم مرتین والذی نفسی بیدہ لخلوف فم الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسک یترک طعامہ و شرابہ و شھوتہ من اجلی الصیام لی و انا اجزی بہ و الحسنۃ بعشر امثالھا۔

بخاری شریف جلد ۱ صفحہ ۲۵٤

حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ روزہ ڈھال ہے پس روزہ دار فحش بے حیائی کا کام نہیں کرتا۔ نہ جہالت والا عمل کرتا ہے۔ پس اگر کوئی اس سے قتال کرتا ہے یا اسے گالی دیتا ہے پس اسے چاہیئے کہ وہ دو بار کہہ دے میں روزہ دار ہوں۔ پس اس ذات کی قسم روزہ دار کے منہ کی وہ بو (جو روزہ کی وجہ سے خلو معدہ کے باعث اس کے منہ سے نکلتی ہے) اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ خوشبودار (پاک وبہتر) ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ دار اپنا کھانا اور پینا اور خواہش نفس میرے لئے چھوڑتا ہے۔ روزہ خالص میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کا بدلہ دونگا۔ حالانکہ جزا کا عام قاعدہ یہ کہ نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کی شرح میں الصیام لی و انا اجزی بہ کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

ان الاستغناء عن الطعام و
غيره من الشهوات من صفات
الرب جل جلاله فلما تقرب
الصالح اليه بما يوافق صفاته
اضافه اليه — و قال القرطبي
معناه ان الاعمال العباد
مناسبة لاحوالهم الا الصيام
فانه مناسب لصفته من
صفات الحق كانه يقول ان
الصائم يتقرب الى بامر هو
متعلق بصفته من صفاتي

فتح الباری جلد ۴ ص ۸۸

کھانے وغیرہ کی خواہشات سے استغناء اور بری ہونا اللہ جل جلالہ کی صفات سے ہے پس جب کوئی صالح شخص اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرتا ہے ایسی صفت سے جو اس کی صفات کے موافق ہوتی ہے تو وہ اسے اپنی صفت کی طرف اضافہ یا منسوب کرلیتا ہے ـــــ علامہ قرطبیؒ کا قول ہے کہ انسان کے اعمال ان کے اعمال سے ہی مناسبت رکھتے ہیں سوائے روزے کہ وہ حق تعالیٰ شانہ کے صفات میں سے ایک صفت میں اس کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ دار میرے قریب ہوتا ہے ایک ایسی صفت میں جو میری صفات سے متعلق (یعنی) مشابہ ہے۔

قال البيضاوی — و المعنى ان
الحسنات جزاء ها من عشرة
امثالها الى سبع مائة ضعف الا
الصوم الى هذا القدر بل ثوابه
لايقدر و لايحصيه الا الله تعالى
ولذالك يتولى الله جزاءه بنفسه
و لا يكله الى غيره قال و السبب
فى اختصاص بهذه المزية
امران احدهما ان سائر
العبادات مما يطلع عليه و
الصوم سر بين العبد و بين الله

قاضی البیضاویؒ کہتے ہیں کہ نیکیوں کا ثواب بڑھایا جاتا ہے دس گنا سے سات سو گنا تک سوائے روزہ کے کہ اس کا ثواب صرف اس قدر نہیں بڑھایا جاتا بلکہ اسکا ثواب کا نہ کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے نہ کوئی گن سکتا ہے سوائے اللہ تعالی کے اس لئے اس کی جزا اللہ تعالی نے اپنے ہی سپرد کی اور کسی اور کے حوالے نہیں کی اور بیضاوی کہتے ہیں کہ اس مزیت کے خاص ہونے کا سبب دو وجہ سے ہے کہ باقی جتنی بھی طاعات ہیں وہ دیکھی جا سکتی ہیں اور روزہ جو ہے وہ بھید ہے بندہ اور اللہ تعالی کے درمیان میں جو بندہ

تعالی یفعله خالصا له یعامله طالبا لرضاءه و الی ذالک اشارة بقوله فانه لی و الآخر ان سائر الحسنات الی صرف المال واستعمال البدن و الصوم یتضمن کسر النفس و تعریض البدن للنقصان و فیه الصبر علی مغض الجوع و العطش و ترک الشهوات و الی ذالک اشار بقوله شهوة من اجلی۔

فتح الباری جلد ۴ ص ۸۸

خالص اس کیلئے کرتا ہے اور وہ اسے خالص اس کی رضا کے طلب کرنے کیلئے کرتا ہے اور اس کی طرف اشارہ ہے حدیث قدسی کے ان لفظوں میں "وہ خالص میرے لئے ہے" اور دوسرا سبب یہ ہے کہ ساری عبادات مال کے خرچ کرنے اور بدن کے استعمال تک ہوتی ہیں اور روزہ جو ہے وہ نفس کے توڑنے، بدن کو نقصان کے سپرد کرنے اور بھوک وپیاس کی شدت برداشت کرنے اور شہوات کو ترک کرنے وغیرہ اور پر شہوات کو ترک کرنے وغیرہ پر مشتمل ہے جسکا اشارہ حدیث قدسی کے اس بول کی طرف ہے کہ اس نے اپنی خواہش میرے لئے چھوڑ دی ہے۔

علامہ بدر الدین عینی روزہ کی بحث میں رقم طراز ہے۔

الصوم فی اللغة الامساک ــ و ان فی الشرع الامساک عن الاکل و الشرب و الجماع و هو ملحق به من الطلوع الفجر الثانی الی غروب الشمس و قال ابن العربی وقع الصوم فی عرف الشرع علی امساک مخصوص فی زمن مخصوص مع النیة و قال ابن قدامه هو

الصوم کا لغت میں معنی رکنے کا ہے اور شرع میں کھانے پینے اور جماع سے صبح صادق سے لیکر سورج کے غروب ہونے تک رکے رہنے کا نام ہے اور علامہ ابن عربی فرماتے ہیں کہ عرف شرعی میں ایک مخصوص زمانے میں ایک "خاص رکنا" نیت کے ساتھ صوم کہلاتا ہے۔ ابن قدامہ کہتے ہیں روزہ طلوع فجر ثانی سے لیکر غروب آفتاب تک افطار یعنی روزہ توڑنے والی چیزوں سے رکنا ہے۔

الامساک عن المفطرات من
طلوع الفجر الثانی الی غروب
الشمس۔
عمدة القاری جلد ۳ صفحہ ۲۵۲

علامہ عینی مزید ارشاد فرماتے ہیں یقیناً روزہ نیکی البر تک پہنچانے والا ہے جو کہ انسان کو روک دیتا ہے بہت سے گناہوں سے اور بدن کا تزکیہ بھی اس سے ہوتا ہے اور شیطان کے بہت سے راستے روک دیتا ہے اور روزہ دوزخ سے بچانے والا ہے کہ یہ شہوات سے بچاتا ہے جو کہ دوزخ کو گھیرے ہوئے ہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ جنت مکارہ یعنی ان کاموں سے ڈھانپ لی گئی ہے جو نفس پر گراں ہیں اور دوزخ شہوات سے ڈھانپی گئی ہے

(عمدة القاری جلد ۱۰ ص ۲۵۲، ۲۵۴)

غرض روزہ انسانی اصلاح وفلاح کا ایک جامع نسخہ ہے۔ اللہ تعالی نے اسے امت پر رمضان المبارک کے پرانوار وبرکات والے مہینہ میں فرض کیا۔ یہی مہینہ نزول قرآن کا مہینہ ہے اور اسکی تجلیات وخیروں کو اپنے میں سموئے ہوئے ہے۔ اسی میں ہزار مہینے سے بہتر ایک رات شب قدر کی ہے۔ اسی میں اعتکاف جیسی عبادت ہے۔ اسمیں تراویح جیسی نماز ہے جس میں تمام دنیا میں مسلمان پورا قرآن مہینہ بھر میں امام سے نماز کے اندر سنتے رہتے ہیں۔ یہ شب بیداری سحری وافطار جیسی نورانی ساعات کا حامل مہینہ ہے۔ باہمی ہمدردی ومواسات خیر وخیرات زکوٰۃ وصدقات انہی ایام میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔

غرض روزہ اور اسی کی متعلقہ عبادات سے رمضان کی رونق ہے اور رمضان اپنی خیروں وبرکتوں کی بارش روزہ داروں پر کرتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس ماہ مبارک سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے اور اپنی نجات ومغفرت کا سامان کر لیتے ہیں۔

حضرت سید صاحب نور اللہ مرقدہ ایک طالب کو لکھتے ہیں۔

"رمضان المبارک کی برکات بھی جب ہی حاصل ہوتی ہیں جب اس کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں"۔

حضرت سید صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ مختلف اشخاص کو مختلف خطوط میں ارقام فرماتے ہیں۔

۱۔ رمضان المبارک بخیریت تمام ہوا روزے پورے ہوئے اور تراویح بھی کامل ہوئیں. بحمد اللہ۔

۲۔ خدا کا شکر ہے کہ رمضان المبارک کا حق آپ نے پورا کیا اس زمانے میں سب سے بہتر عبادت کثرت تلاوت ہے۔

۳۔ سفر میں اگر تراویح باجماعت نہو سکے تو چند رکعت رات کے کسی حصہ میں پڑھ لیجیے انشاء اللہ تعالیٰ باعث برکت ہوگا۔

۴۔ نفل روزہ دوشنبہ کو یا جمعرات کو رکھ سکتے ہیں۔

۵۔ تراویح کی قضا نہیں۔ اگر جماعت کے ساتھ نہو سکے تو گھر پر پڑھ لیں مگر معمولی عذرات پر جماعت ترک نہ کریں امتحان کی تیاری کی محنت کے سبب عذر موقت ہو تو گھر پر پڑھ لیا کریں۔

۲۳ اپریل ۱۹۹۵ء

ی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حج

حج توحید و رسالت کی شہادت کے بعد اسلام کا چوتھا اور آخری رکن ہے جو اسلامی عبادات کی تکمیل کرتا ہے۔ اسلام ملت ابراہیمی کا دوسرا نام ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

قل صدق اللّٰه فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفاً و ما كان من المشركين - انّ اول بيت وضع للنّاس للذى ببكة مباركاً و هدًى للعلمين - فيه آية بينت مقام ابراهيم - و من دخله كان آمناً - و لله على النّاس حج البيت من استطاع اليه سبيلاً - و من كفر فان اللّٰه غنى عن العلمين -

آل عمران ۱۰

کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا تو ابراہیم کے دین کی پیروی کرو، شرک سے منہ موڑ اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کیلئے بنایا گیا وہی ہے جو بکہ میں ہے، بابرکت اور دنیا کیلئے راہنما، اس میں کچھ کھلی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ، اور جو اس میں داخل ہو وہ امن پا جائے اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے، جسکو اسکے راستہ (سفر) کی طاقت ہو اور جو (اس قدرت کے باوجود) اس سے باز رہے تو خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

حضرت سید الملتؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری، حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے

حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا کو اور اس معاہدہ کو اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجا لانا جسطرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدا کی نوزشوں اور بخششوں سے مالامال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے۔ یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جسکو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کرکے ظاہر کرتے ہیں۔ تمدن کی اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں۔ اس لئے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈاتے ہیں، نہ ترشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں، نہ سر چھپاتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جسطرح ابراھیم و اسماعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں اور جسطرح حضرت ابراھیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا وہی تین ہزار پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے۔

لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ۔ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ	میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں۔ سب خوبیاں اور نعمتیں تیری ہی ہیں، اور سلطنت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ، اور یہ توحید کی صدا، ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں، جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کی نقش قدم پڑے تھے، اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربانگاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں، اسلئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدق کرتے ہیں پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مروہ تک)

حضرت ابراہیمؑ دوڑ کر گئے تھے کہ مروہ پر پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے، وہاں ہم دوڑتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں، اور گناہوں کی بخشائش چاہتے ہیں، اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہوکر، اپنی تمام گزشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں، خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں، قصور معاف کراتے ہیں، اور آئندہ زندگی کے لئے، خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں، اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے (۱)، یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگوں کے نقش قدم، اور ان کی دعا کے مقامات، اور تجلیات ربانی کے مناظر، دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد، اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع، اور لاکھوں بندگان خدا کا، ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس و شکل و صورت، ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان، اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہوکر، دعا و مغفرت کی پکار، گزشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار، اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیمؑ خلیل اللہ سے لیکر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم رسول اللہ تک بہت سے انبیاء علیہ السلام اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوئے تھے، ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے، جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی، پھر اپنے نذر کے دن پورے کرکے، اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں، اور اس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفروشی، اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت، اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی، اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے

(۱) ترمذی کتاب الحج باب ما جاء من ادرک الامام فقد ادرک الحج

ہیں۔ (صحیح مسلم کتاب الحج)

انی وجهت وجهی للذی فطر السموات و الارض حنیفا و ما انا من المشرکین۔
(انعام۔ ۸۰)

میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، موحد بنکر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔

قل انّ صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰه رب العلمین۔ لا شریک له و بذالک امرت و انا اول المسلمین
(انعام ۱۶۳، ۱۶۴)

میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے، اور میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام) کا اقرار کرتا ہوں۔

حضرت سید الملۃ نور اللہ مرقدہ کی مندرجہ بالا طویل تحریر سے حج کی اہمیت اس کے گوناگوں فوائد و مزایا اور اسکی ہمہ گیر اور عالمگیر خوبیوں اور کمالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوا ہوگا۔ اسلامی انفرادی و اجتماعی زندگی کے بنانے میں حج کی کارفرمائی قدم قدم پر نمایاں ہے، حاجی جو اخلاص اور توجہ سے حج کرلیتا ہے اسکی لاحقہ یعنی حج سے بعد کی زندگی اسکی پہلی زندگی سے نمایاں طور پر ممیز ہوجاتی ہے یعنی سدھر جاتی ہے۔ اس کی زندگی کے جزو کل پر اسکا حج اثر انداز ہوتا ہے۔ حج کے معمولات، کعبۃ اللہ کی حاضری، مناسک کی ادائیگی، عرفات و منیٰ کا قیام اور اس خطہ پاک کے اعمال روحانی زندگی پر ایسی گہری چھاپ لگا دیتے ہیں کہ زندگی کا سانچہ کلیۃً بدل جاتا ہے پہلے دور میں جب حج پیدل ہوا کرتا تھا اور حاجی ایک دوسرے کے استقبال والوداع کے لئے ایک دوسری بستی تک حاجیوں کے ساتھ جاتے آتے تھے یہ تاثر زیادہ قوی ہوتا تھا اور یہ حج کے قافلے جو ایک طرف مراکش اور سپین سے لیکر چین اور ہندوستان تک اور دوسری طرف مالابار کے ساحل سے لیکر وسط افریقہ کے ساحلوں تک آتے جاتے تھے۔ حج کے قافلوں

کی روحانی برکات و اثرات اور زندگی پر انکی اثر اندوزی کا بولتا اثر پیش کرتے تھے ۔ دین کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ کا یہ چلتا پھرتا نظام تھا جو بغیر کسی ظاہری تطمیع و نمائش کے اپنے اثرات معاشرے پر مرتب کرتا رہتا تھا ۔

نوٹ ۔ یہ وہ مقام ہے جسکے تحریر فرمانے کے بعد حضرت کو اولاً بیماری کی وجہ سے اور بالآخر وصال فرمانے کی وجہ سے مزید تحریر فرمانے کا موقع نہ مل سکا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

حضرت کی یہ خواہش تھی کہ جلد دوم میں روزہ اور حج کی کمی ہے اسکو پورا کیا جائے ۔ الحمد للہ روزہ تو حضرت کی زندگی میں ہی پورا ہوکر صاف بھی ہوگیا تھا اور حضرت نے اسکا پروف ملاحظہ بھی فرمایا تھا لیکن حج پر تحریر فرمانے کی حضرت نے ابتدا ہی فرمائی تھی کہ وہ وقت آپہنچا جسکے لئے حضرت یہ سب کچھ کررہے تھے ۔ راقم کا حضرت کے ساتھ اسکے لئے مسلسل رابطہ رہا لیکن جتنا تحریر فرما چکے تھے اس سے زیادہ نہ ہوسکا ۔

اسلام آباد ہاسپٹل کمپلکس میں علاج کے سلسلے میں جب حضرت تشریف لائے تو اس وقت ٹیلیفون خراب ہونے کی وجہ سے راقم کو اطلاع نہ ہوسکی اور اسطرح اسی نامکمل حالت میں اسکو لکھنا پڑا ۔ موجودہ تحریر پر غور کیا جائے تو پیغام کے لحاظ سے یہ مکمل ہے کیونکہ مناسک کے مسائل تو ماشاء اللہ حج کی کتابوں میں کافی موجود ہیں یہاں تو حج کی عظمت و مقصد پر تحریر فرمانا مقصود تھا جو موجودہ صورت میں بھی انشاء اللہ حاصل ہوسکتا ہے ۔ حضرت شیخ مولانا زکریاؒ کی فضائل حج ، حضرت مفتی سعید احمدؒ کی معلم الحجاج اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی زبدۃ المناسک حج کے فضائل اور مناسک کے مسائل کیلئے انشاء اللہ کافی ہیں ۔

اللہ تعالیٰ حضرت کے روح پاک پر بے انتہا رحمتیں نازل فرمائے ۔ اور ہم سب کو آپ کے فرمودات مبارکہ اور تحریرات معطرہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ جس مقصد کیلئے حضرت آخر دم تک اس کتاب کے تکمیل کیلئے

بیچین رہے وہ مقصد پورا ہوسکے ۔ حضرت کا اپنی زندگی میں یہی مقصد رہا کہ امت مسلمہ اپنی قدر و منزلت پہچان لے اور پھر سے اپنے اسلاف کی طرح اتباع سنت کی عظیم نعمت سے سرفراز ہوکر دنیا کی قیادت سنبھال لے ۔ جن کو بھی اس کتاب سے فائدہ ہو ان سے درخواست ہے کہ وہ حضرت کیلئے ایصال ثواب فرمائے جس میں جانبین کا نفع ہے ۔ انشاء اللہ ۔

اس کتاب کی کتابت اور انتظام و طباعت میں جن ساتھیوں نے حصہ لیا ہے ان کی طرف سے قارئین کی خدمت میں دعا کی درخواست ہے کہ اس عظیم کام میں ان سے جو کوتاہیاں اور غفلتیں ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور ان سب کو اللہ تعالیٰ جمیع امت کے ساتھ اپنی کامل اور دائم رضا کی دولت سے سرفراز فرمائے ۔ آمین ثم آمین ۔ حضرت کے متعلقین کیلئے ایک مژدہ ہے کہ حضرت کے خلیفہ مجاز ڈاکٹر شیر حسن صاحب مدظلہ نے حضرت کی زندگی میں جو مواعظ اور ملفوظات تحریر فرمائے تھے حضرت کے متعلقین کا ارادہ ہے کہ ان کو چھاپا جائے ۔ الحمد للہ ان کی کتابت پر کام شروع ہوچکا ہے ۔ اسطرح حضرت کے مقالات مطبوعہ اور غیر مطبوعہ جہاں سے بھی میسر ہوں ان کو چھاپنے کا ارادہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس مشن کو تکمیل تک پہنچانے کی غیب سے صورتیں پیدا فرمائیں ۔

آمین ۔ اللهم اغفرله ولنا ولجميع المومنين والمومنات يوم يقوم الحساب ۔ وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وعلى آله وصحبه وسلم ۔

از کاتب مہجور

شبیر احمد غفرلہ